ہفت روزہ

ندائے خلافت

لاہور

20 اگست 2003ء

نظریۂ پاکستان نمبر

اشاعت خصوصی

بانی: اقتدار احمد مرحوم

مدیر: حافظ عاکف سعید

جلد: 12 شمارہ: 29

تا خلافت کی بنا' دنیا میں ہو پھر استوار
لا کہیں سے ڈھونڈ کر اسلاف کا قلب وجگر

قیامِ خلافت کا نقیب

ندائے خلافت

شمارہ	14 تا 20 اگست 2003ء	جلد
29	۱۵ تا ۲۱ جمادی الثانی ۱۴۲۴ھ	12

بانی: اقتدار احمد مرحوم

مدیر: حافظ عاکف سعید

مدیر (اشاعتِ خصوصی): سید قاسم محمود

نائب مدیر: فرقان دانش خان

مجلس ادارت

ڈاکٹر عبدالخالق ۔ مرزا ایوب بیگ

سردار اعوان ۔ محمد یونس جنجوعہ

نگران طباعت: شیخ رحیم الدین

پبلشر: محمد سعید اسعد' طابع: رشید احمد چوہدری

مطبع: مکتبہ جدید پریس' ریلوے روڈ' لاہور

مقام اشاعت: 36-کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی:

67-گڑھی شاہو' علامہ اقبال روڈ لاہور

فون: 6316638-6366638 فیکس: 6305110

E-Mail:markaz@tanzeem.org

خصوصی شمارہ کی قیمت: 50 روپے

سالانہ زرِ تعاون

اندرونِ ملک ...... 250 روپے

بیرونِ پاکستان

یورپ' ایشیا' افریقہ وغیرہ (1500 روپے)

امریکہ' کینیڈا' آسٹریلیا وغیرہ (2200 روپے)

اداریہ

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تحریکِ پاکستان نمبر

"ندائے خلافت" نے یہ اچھی طرح ڈالی ہے کہ اسلام اور پاکستان سے تعلق رکھنے والے منتخب اور اہم موضوعات پر تحقیق کرائی جائے' صرف تحقیق نہ کرائی جائے' بلکہ اُس کے نتائج کو شائع بھی کیا جائے۔ اِس اچھے کام کی خوشی میرے نصیب میں تھی۔ خوشی' ممنویت اور ذمہ داری کے احساس کے ساتھ راقم السطور اب سے پہلے "ندائے خلافت" کے تین خصوصی شمارے پیش کر چکا ہے۔

(۱) **فلسطین نمبر**: اُمت مسلمہ کے سب سے بڑے مذہبی اور سیاسی مسئلے پر یہ شمارہ دستاویزی نوعیت کا ہے۔ بہت مقبول ہوا۔ اس کے دو ایڈیشن طبع ہو چکے ہیں۔ قارئین کا تقاضا ہے کہ اسے کتابی صورت میں بھی پیش کیا جائے۔ یہ معاملہ انتظامیہ کے زیرِ غور ہے۔

(۲) **اقبال نمبر**: اس کو مخفف کے طور پر "اقبال نمبر" کہا جاتا ہے' ورنہ حقیقت میں اس کا عنوان ہے "پیامِ اقبال بنام نوجوانانِ ملت"۔ گزشتہ سال حکومتِ پاکستان کے اعلان کے مطابق مفکرِ اسلام علامہ اقبال کے لئے وقف تھا۔ "ندائے خلافت" نے بھی اپنے اس خصوصی شمارے کے ذریعے شرکت کی اور دنیا نے دیکھا کہ مطبوعات اور بھی سامنے آئیں' لیکن یہ شمارہ امر ہو گیا' اس لئے کہ ایک تو اس کا موضوع اچھوتا تھا' کیونکہ بچوں کے لئے علامہ اقبال کا پیغام خواہ وہ شعر کی زبان میں ہو یا نثر کی صورت میں ہو' پہلی مرتبہ اس شمارے میں یکجا ہوا تھا' دوسرے یہ "پیغام" بالکل بچوں کی ذہانت کی سطح پر مرتب ہوا تھا۔ "اقبال نمبر" کی کامیابی کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہو سکتا ہے کہ اقبال اکیڈمی آف پاکستان نے اسے سندھی زبان میں ترجمہ کرایا ہے اور عنقریب وہ کتابی صورت میں چھپنے والا ہے۔

(۳) **عراق نمبر**: جس طرح امریکا نے عراق پر ڈرامائی انداز میں حملہ کیا تھا' اُسی طرح بالکل اچانک اور ڈرامائی انداز میں "ندائے خلافت" نے امریکا پر حملہ کر دیا۔ یہ 2 اپریل کی بات ہے کہ محترم حافظ عاکف سعید صاحب اور ڈاکٹر عبدالخالق صاحب نے مشترکہ تحریک کی کہ کیا اِس موقع پر "ندائے خلافت" جنگ میں شریک نہیں ہو سکتا۔ میں نے چیلنج قبول کیا اور اُسی روز عراق میں داخل ہو گیا۔ لیکن جب 9 اپریل کو تین امریکی ٹینک کسی مزاحمت کے بغیر بغداد میں داخل ہوئے اور بغداد کی دیواریں ہلنے لگیں تو قلم میں بھی خم آ گیا۔ میں نے حافظ صاحب کو فون کیا کہ جناب' کام نہیں ہو رہا۔ شکست ہونے والی ہے۔ میں بھی قلم دوات اُلٹا دیتا ہوں۔ کہنے لگے: "آپ نے تو اپنے مورچے پر ڈٹے رہنے کا عہد کیا تھا۔ ڈٹے رہیے"۔ چنانچہ صدام حسین تو فرار ہوا' لیکن اشاعت کے مورچے پر "ندائے خلافت" جیت گیا۔ خطوط پہ خطوط چلے آ رہے ہیں کہ نیا ایڈیشن چھاپا جائے۔ اسے کتابی صورت میں لایا جائے۔ ہم سوچتے ہیں کہ آگے بڑھیں یا پچھلے کاموں کو دہراتے جائیں۔

(۴) **نظریۂ پاکستان نمبر**: آگے ہی آگے بڑھتے رہنے کے ناقابلِ شکست جذبے اور عزم کا ثبوت آپ کے سامنے ہے۔ سابقہ تین خصوصی اشاعتوں کی طرح اس میں بھی کوئی خاص بات نہیں ہے۔ سابقہ شماروں کی طرح اِس میں بھی سینکڑوں کتب وجرائد میں طبع شدہ مواد میں سے ایک خاص مرکزی نکتے کے حوالے سے' مفید مطلب مواد چھانٹ کر' ایک نئی روشنی میں دیکھا ہے۔ یوں پرانے مواد میں ایک نئی رُوح' ایک نئی تازگی آ گئی ہے۔ سوچ کے نئے زاویے خود بخود اُبھر آئے ہیں' لیکن منتخب مواد بھی اتنا زیادہ تھا کہ "ندائے خلافت" کی ضخامت اور بجٹ کی تنگنائے میں یہ بحرِ ذخار سمٹنے کے لئے تیار نہ ہوا۔ چنانچہ فیصلہ ہوا کہ اس موضوع سے متعلق ایک اور خصوصی شمارہ مرتب کیا جائے' جس کا عنوان ہے: "تحریکِ پاکستان نمبر"۔ مدیرِ محترم اسے "نظریۂ پاکستان نمبر" کا حصہ دوم قرار دیتے ہیں۔ میں اس کا جڑواں بھائی کہتا ہوں۔ یہ کب آئے گا؟ پہلے آپ "نظریۂ پاکستان نمبر" کا مطالعہ تو کیجئے۔ پڑھئے' دیکھئے' خط لکھئے' رائے دیجئے' مشورہ دیجئے۔ آپ فرض شناس قاری بنیں گے تو آپ کے مصنف ومدیر فرض شناس بنیں گے: کیا میں نے غلط کہا؟

(سید قاسم محمود)

فہرست

(1) نظریۂ پاکستان کیا ہے؟ 5
پاکستان کیوں بنایا گیا؟ اسلام کی حفاظت اسلامی عہد میں۔ سبز اور سفید ڈوریاں۔ نظریۂ پاکستان کے حق میں چند آراء۔ دوقومی نظریے کے حق میں چند آراء

(2) اسلام کیا ہے؟ 9
ایمانیات۔ عبادات۔ قانون۔ اخلاقیات۔ معاشرت۔ معاشیات۔ تبلیغ واشاعت۔ اسلامی ریاست۔ خلافت۔ خطبہ حجۃ الوداع

(3) نظریۂ پاکستان کے برعکس نظریات 17
آریہ ورت۔ ویدوں کا زمانہ۔ ذات پات کی تقسیم۔ آواگون یا تناسخ۔ ہندو دیومالا۔ جین مت۔ بدھ مت۔ ہندو سامراج۔ نظریۂ پاکستان ہندوستان میں

(4) ہندوؤں کا مذہب..... آنکھوں دیکھا حال 22
البیرونی کا بیان۔ ہندو مسلم مغائرت کے اسباب۔ خالدہ ادیب خانم کا بیان۔ اسلام ہضم کیوں نہ ہو سکا؟ کلکتہ کا کالی مندر۔ متحدہ قومیت۔ انڈین نیشنل کانگریس۔ بیورلے نکولس کا بیان۔ ہندو مذہب کیا ہے۔ گنیش جی کا مجسمہ۔ عورت کی حیثیت۔ ڈاکٹر امبیدکر کا بیان

(5) نظریۂ پاکستان کی اشاعت کے بنیادی اُصول 31

(6) نظریۂ پاکستان کی اشاعت جنوبی ایشیا میں 33

(7) محمد بن قاسم کا کردار 35

(8) محمود غزنوی بُت شکن 37

(9) شہاب الدین غوری 40

(10) خاندانِ غلاماں (1206ء۔1290ء) 42

(11) خاندانِ خلجی (1290ء تا 1320ء) 44

(12) خاندانِ تغلق (1321ء تا 1413ء) 46

(13) آزاد اسلامی ریاستیں 46

(14) ہندو سماج پر اسلام کے اثرات 48

(15) بابر تا بہادر شاہ 51
حضرت مجدد الف ثانی۔ وراثت کا اصول۔ عالمگیر کے بعد۔ شاہ ولی اللہ۔ احمد شاہ ابدالی۔ جنگ پلاسی۔ ٹیپو سلطان۔ شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ۔ سید احمد شہید۔ 1857ء کی جنگ

(16) مسلمان حکمرانوں کی ہندو نوازی 55
محمد بن قاسم کا غیر مسلموں سے سلوک۔ سلاطینِ غزنی کا غیر مسلموں سے سلوک۔ ترکوں کے عہد میں ہندو نوازی۔ مغل بادشاہوں کی ہندو نوازی۔ عالمگیر کا سلوک ہندوؤں سے

(17) ہندوؤں کی مسلم دشمنی 58
غزنی برہمنوں کا حملہ۔ ہندو مت خطرے میں ہے؟۔ رام راج کا منصوبہ۔ بابری مسجد کا سانحہ

(18) مسلمانوں پر ہندو تہذیب کے اثرات 60
مسلمانوں میں ذات پات کی تفریق۔ ہندوؤں کی معاشرتی رسوم۔ بچے کی ولادت کی رسمیں۔ شادی بیاہ کی رسمیں۔ موت کی رسمیں

(19) ہندوستان میں احیائے اسلام کی تحریکیں 66
حضرت شاہ ولی اللہ۔ احمد شاہ ابدالی۔ سردار نجیب الدولہ۔ نظام الملک آصف شاہ۔ جنگ پانی پت۔ سکھوں کی سرکوبی۔ مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں۔ انگریزوں کی آمد۔ جنگ پلاسی۔ سلطان حیدر علی۔ سلطان ٹیپو۔ حافظ رحمت خان۔ سید احمد شہید کی جہادی تحریک۔ 1857ء کی بغاوت

(20) علمائے دیوبند کی ایک تاریخی نشست 75
نظریۂ پاکستان کے موضوع پر 7 دسمبر 1945ء کو علامہ شبیر احمد عثمانی (صدر جمعیت العلمائے اسلام) اور جمعیت العلمائے ہند کے اکابرین مولانا حسین احمد مدنی، مفتی کفایت اللہ، مولانا احمد سعید دہلوی، مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی، مولانا عبدالحلیم صدیقی، مولانا عبدالحنان اور مفتی عتیق الرحمٰن کی تاریخی گفتگو

(21) دوقومی نظریے کی پیدائش 83
سال پیدائش 1757ء۔ جنگ پلاسی کے بعد۔ انگریزی تجارت میں ہندوؤں کی ساجھداری۔ مسلمانوں کے خلاف انگریز ہندو گٹھ جوڑ

(22) دوقومی نظریے کا ارتقاء 85
1857ء سے لے کر 23 مارچ 1940ء کی ''قراردادِ لاہور'' کی منظوری تک، دوقومی نظریے کے مختلف ارتقائی مراحل، مشاہیر کی آراء کی روشنی میں

(23) نظریۂ پاکستان کا مستقبل 87

1

نظریۂ پاکستان کیا ہے؟

جیسا فکری الجھاؤ گزشتہ چند صدیوں سے مطالعۂ اسلام میں دو اصطلاحوں دنیا (یہ دنیا) اور دین (وہ دنیا)' اور اُن کی بنیاد پر دنیاوی علم و تعلّم اور دینی علم و تعلّم کی تفریق نے پیدا کر رکھا ہے' ویسا ہی فکری الجھاؤ نصف صدی سے مطالعۂ پاکستان میں تین اصطلاحوں نے برپا رکھا ہے' یعنی نظریۂ پاکستان' دو قومی نظریہ اور تحریک پاکستان۔ یہ اصطلاحیں اکثر ''ہم معنی خیال کی جاتی ہیں حالانکہ یہ ہم معنی نہیں ہیں' بلکہ ان کے معانی میں تھوڑا تھوڑا فرق ہے۔ ان کے اشتراک و اختلاف کے تعلق کو یوں بیان کیا جا سکتا ہے کہ یہ ایک ہی لڑی میں پروئے ہوئے پھول ہیں۔ ایک گلاب ہے' دوسرا موتیا' تیسرا چنبیلی۔

نصابی کتابیں ہوں یا ہمارے فاضل مورخین اور دانش وروں کی کتابیں یا اخبارات و جرائد میں شائع شدہ مقالات' سبھی ان تین اصطلاحوں کو ہم معنی خیال کرتے ہیں۔ ''تحریکِ پاکستان'' نام کی کتابیں جو ایف اے اور بی اے کے نصاب میں داخل ہیں' مختلف الرائے ہیں۔ کسی کتاب کا آغاز 1857ء کی جنگ آزادی سے ہوتا ہے' کسی کا سرسید کی تحریک سے۔ کوئی 1906ء سے شروع ہوتی ہے' کوئی محمد بن قاسم کے ورودِ ہند سے۔ یہی کیفیت نظریۂ پاکستان اور دو قومی نظریے کی ہے' کہ دونوں کو ہم معنی خیال کیا جاتا ہے۔ دونوں کو ہم معنی اور ایک قرار دے کر اس کا رشتہ تحریکِ پاکستان سے جوڑ کر' تینوں کو ایک بنا لیا جاتا ہے' جیسے مثلث کو خطِ مستقیم بنا لیا جائے۔ حالانکہ حقیقی صورتِ حال یہ ہے اور اس کی گواہی ہماری تاریخ دے رہی ہے کہ یہ تینوں الگ الگ چیزیں ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ تینوں ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں۔

ہم اس کے لئے فلسفۂ سیاست کا کوئی طویل سفر اختیار نہیں کریں گے' سادہ لفظوں میں سادگی سے اپنا مدعا بیان کریں گے کہ تمہید مختصر ہے اور تمہید طولانی!

''تحریکِ پاکستان'' (Pakistan Movement) کی اصطلاح کا کوئی وجود ہمیں قرارداد لاہور (مارچ 1940ء) سے پہلے اپنی تاریخ میں کہیں نظر نہیں آتا۔ اس کا مفہوم بالکل صاف اور واضح ہے کہ ''قراردادِ لاہور'' کے مطابق ہندوستان میں ایک جداگانہ اسلامی ریاست کے لئے عملی جدوجہد۔

دو قومی نظریے (Two-nation Theory) کی اصطلاح کا بھی یہی حال ہے کہ مارچ 1940ء سے پہلے وجود میں آئی اور پھر اس مفہوم میں عرفِ عام بن گئی کہ برعظیم پاک و ہند میں دو قومیں آباد ہیں' ایک ہندو' دوسرے مسلمان۔ اس اصطلاح کی تشریح و تعبیر میں بھی کوئی ابہام نہیں ہے۔

البتہ ''نظریۂ پاکستان'' (Ideology of Pakistan) نسبتاً نئی اور جدید اصطلاح ہے۔ نظریۂ پاکستان کثرتِ تعبیر کے باوجود دو قومی نظریے کے تابع یا اس کا جز ہو کر رہ گیا ہے۔ یہ اصطلاح ہمیں قیامِ پاکستان سے پہلے کسی مورخ یا مفکر کے ہاں شاذ ہی نظر آتی ہے۔ اس کا بے محابا استعمال پاکستان پیپلز پارٹی کا چار نکاتی منشور آنے کے بعد ہونے لگا ہے۔ ''اسلام ہمارا دین ہے' جمہوریت ہماری سیاست ہے۔ سوشلزم ہماری معیشت ہے۔ طاقت کا سرچشمہ عوام ہیں۔'' ہمارے بزرگوں نے تو دین کو دنیا سے جدا کر کے صرف ''آخرت'' کے معنی میں مختص کر لیا تھا۔ اس منشور کے مصنف جناب محمد حنیف رامے نے تو دین کو معیشت و سیاست سے الگ کر کے روزے نماز تک محدود کر دیا۔ چنانچہ ''اسلامی سوشلزم'' کے پرچار کی مہم میں ہمارے بائیں بازو کے دانش وروں نے ایڑی چوٹی کا زور یہ ثابت کرنے میں لگا دیا کہ دو قومی نظریے کا مطلب تھا کہ مسلمانانِ ہند کو ہندوؤں کے معاشی جبر سے نکال کر' سیاسی طور پر ایک ایسی آزاد مسلم ریاست کا قیام جہاں مسلمانوں کو معاشی آزادی اور تحفظ حاصل ہو' پس پاکستان معاشی مفادات ہی کی خاطر بنایا گیا تھا اور اسی کو ''نظریۂ پاکستان'' کہتے ہیں اور ''نظریۂ پاکستان'' (معاشی آزادی) ہی دو قومی نظریے کی اساس ہے' ورنہ روزے نماز کی آزادی تو مسلمانوں کو بھارت میں پہلے بھی تھی اور متحدہ ہندوستان (اکھنڈ بھارت) میں بھی ہوتی۔

پاکستان کیوں بنایا گیا؟

یہ سوال ایک ایسی مستقل مصیبت ہے جو ہمارے اہلِ فکر و دانش نے جن میں بعض علمائے دین اور اربابِ سیاست بھی شامل ہیں' ہمارے ملک کی پیشانی پر شروع ہی سے چسپاں کر رکھی ہے۔ انتہائی سیدھی سادی بات کو اُلجھا کر رکھ دیا ہے۔ اس سوال کے جواب میں قیامِ پاکستان کے مقاصد و محرکات کو عام طور پر تین نقطۂ ہائے نظر کے تحت بیان کیا جاتا ہے:۔

(1) پاکستان مسلمانوں کو ہندوؤں کے معاشی استحصال سے نجات دلانے کے لئے بنایا گیا۔

(2) پاکستان کا قیام ہندوؤں کے منفی طرزِ عمل اور ان کی منافرت کے خلاف مسلمانوں کا احتجاج تھا۔

(3) پاکستان مسلمانوں کے انفرادی تشخص' یعنی ان کے دین کو بچانے اور محفوظ رکھنے کے لئے بنایا گیا' یا دوسرے لفظوں میں اس کا محرک اسلام اور صرف اسلام ہے۔

(1) معاشی محرک: مسلمانوں نے جب سے ہندوؤں سے علیحدگی کی جدوجہد شروع کی ہے' اس میں صرف معاشی مسئلے کو کبھی بنیاد نہیں بنایا گیا' اگرچہ معاشی مسئلہ اس پوری جدوجہد کا ایک پہلو ضرور تھا۔ مسلمانوں نے یہ محسوس کر لیا کہ معاشی بنیادوں پر ان کے خلاف جو کچھ ہو رہا ہے' وہ صرف اس لئے ہے کہ وہ مذہباً مسلمان ہیں۔ انڈین نیشنل کانگرس کا اصل منصوبہ ''رام راج'' تھا۔ ''رام راج'' کی تحریک کا اصل مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کے ایک ہزار سالہ طویل قیام' مستقل سکونت اور حکومت سے ہندوستان میں ان کا جو ایک تشخص' وقار اور احترام قائم ہو

گیا تھا' اسے مٹا کر یہ صورت پیدا کی جائے کہ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کے بعد اصل حاکمیت اور اقتدار ہندو کے ہاتھ میں ہو' کیونکہ وہ تین چوتھائی اکثریت میں ہیں اور مسلمان ان کی محکومیت پر بہ رضا و رغبت قانع ہو جائیں تو ان کے حق میں بہتر ہے' ورنہ انہیں یا تو دوبارہ ہندومت میں شامل کر کے (شدھی) یا ملک بدر کر کے (سنگھٹن) فنا کر دیا جائے گا۔ مسلمانوں کی جدوجہد میں کہیں طبقاتی کشمکش نظر آتی ہے نہ امیر غریب کا مسئلہ سامنے آیا۔ انگریزوں اور ہندوؤں سے آزادی کی یہ جنگ امیروں اور غریبوں نے مل کر لڑی تھی۔ اگر مسلمانوں کے سامنے صرف معاشی مسئلہ ہوتا تو وہ پنڈت جواہر لال نہرو کے پیچھے جاتے' گاندھی جی کی لنگوٹی اور فقیرانہ زندگی کو قائداعظم کے رئیسانہ ٹھاٹ باٹ پر ترجیح دیتے' لیکن بقول سید حسن ریاض (مصنف: ''پاکستان ناگزیر تھا'')

''ہندوستان کے پورے انگریزی دور میں کوئی ایک واقعہ بھی ایسا نہیں ہے جس میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان کوئی جھگڑا مسلمانوں سے سود در سود وصول کرنے پر' یا مسلمانوں کی جائیدادوں پر قبضہ کرنے کی وجہ سے' یا سرکاری ملازمتوں میں مسلمانوں کو واجبی حصہ نہ دینے کے باعث ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان ہوا ہو۔ ہندو واقعی مسلمانوں کا معاشی استحصال کرتے تھے اور یہ جبر کرتے تھے اور اس جبر کی نوعیتیں بھی بہت سی تھیں اور مسلمانوں کو یہ ناگوار بھی تھا۔ تاہم یہ کہنا کہ مسلمانوں نے ہندوستان کو اس معاشی استحصال کی وجہ سے تقسیم کرایا اور انہوں نے پاکستان کی تحریک اس معاشی استحصال کو روکنے کے لئے جاری کی' بالکل غلط ہے۔''

(2) ہندوؤں کی منافرت: یہ کہ پاکستان کا قیام ہندوؤں کے منفی طرزِ عمل کا نتیجہ تھا' یہ نقطۂ نظر کوئی مستقل سبب نہیں البتہ کچھ حصہ ضرور ہے۔ کوئی شخص بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا' کیونکہ ہندوؤں کا طرزِ عمل واقعی مسلم منافرت پر تھا۔ ان کے چند مشہور اکابر کے مندرجہ ذیل بیانات سے ان کے عزائم کا اندازہ ہو سکتا ہے۔

لالہ ہردیال' ایم اے اپنے ایک لیکچر میں کہتے ہیں:

''جب انگریز ہندو سنگھٹنوں سے عہد و پیمان کرنے کے بعد 75 فی صد اکثریت کو سوراجیہ دے دے یا آزاد ہندو ریاست قائم ہو جائے یا جب ہندو سنگھٹن کی طاقت سے سوراجیہ لینے کا وقت قریب آئے گا تو ہماری جو پالیسی مسلمانوں اور عیسائیوں کی طرف ہوگی' اس کا اعلان کر دیا جائے گا۔ اس وقت باہمی سمجھوتے وغیرہ کی ضرورت نہ ہوگی' بلکہ ہندو مہاسبھا صرف اپنے فیصلے کا اعلان کرے گی کہ نئی ہندو ریاست میں مسلمانوں اور عیسائیوں کے فرائض اور حقوق کیا ہوں گے؟ اور ان کی شدھی کی کیا شرط ہوگی'' (روزنامہ ''ملاپ'' لاہور' 25 مئی 1925ء' بحوالہ ڈاکٹر خالد علوی ''نظریۂ پاکستان'')

اسی طرح ایک اور ہندو لیڈر سوامی ستیہ دیو جی نے یو پی (متوسط ہند) میں تقریر کرتے ہوئے کہا: ''ہندو سنگھٹن کا کردار مضبوط ہو۔ اس دنیا میں طاقت ہی کی پوجا ہوتی ہے' اور جب تم مضبوط بن جاؤ گے تو یہی مسلمان خود بخود تمہارے قدموں پر اپنا سر جھکا دیں گے اور اس صورت میں ہم ان کے سامنے اپنی شرائط پیش کریں گے۔ ہماری شرائط کیا ہیں؟

(1) قرآن کو الہامی کتاب نہیں سمجھنا چاہئے (نعوذ باللہ)

(2) حضرت محمد ﷺ کو رسولِ خدا نہ کہا جائے (نعوذ باللہ)

(3) مکہ مدینہ کا خیال دل سے نکال دیا جائے۔

(4) سعدی و رومی کے بجائے بھگت کبیر اور تلسی داس کی تصانیف کا مطالعہ کیا جائے۔

(5) اسلامی تہواروں اور تعطیلوں کے بجائے ہندو تہوار اور تعطیلات منائی جائیں۔

(6) مسلمانوں کو اسلامی نام چھوڑ کر ان کی جگہ ہندوستانی نام' رام' موہن' کرشن وغیرہ رکھنے چاہئیں۔

(7) عربی کی بجائے مسلمانوں کی تمام عبادات ہندی میں کی جائیں (وکیل امرتسر' دسمبر 1928ء)

سوامی ستیہ دیو جی نے مزید کہا: ''دھیرے دھیرے اسلام کا سدھار ہونے لگے گا' اور جو باتیں اس کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ڈالنے والی ہیں' وہ سب نکال دی جائیں گی' اور آپ لوگ دیکھیں گے کہ اس کا اثر کتنا اچھا دنیا کے مسلمانوں پر پڑتا ہے۔ مسلمانوں میں مولوی کی زہریلی تعلیم کے خاتمے کا وقت آ گیا ہے۔''

لالہ ہردیال' ایم اے کہتے ہیں: ''سوراج پارٹی کا اصول ہونا چاہئے کہ ہندوستانی بچے کو قومی رتن دیئے جائیں' خواہ مسلمان ہو یا عیسائی۔ اگر فرقہ ان کو لینے سے انکار کرے اور ملک میں دورنگی پھیلائے تو اس کی قانونی طور پر مخالفت کی جائے یا اس کو عرب کے ریگستانوں میں کھجوریں کھانے کے لئے بھیج دیا جائے۔ ہمارے ہندوستان کے آم' کیلے اور نارنگیاں کھانے کا انہیں کوئی حق نہیں۔''

غرضیکہ تاریخ کی کتابیں ایسے ''اقوالِ زریں'' سے بھری پڑی ہیں۔ انڈین نیشنل کانگرس نے 1937ء کے انتخابات جیتنے کے بعد چند صوبوں میں مسلمانوں کے خلاف جو منظم تحریک چلائی' بندے ماترم کو سکولوں اور سرکاری دفاتر میں قومی ترانہ قرار دیا گیا' ترنگا جھنڈا قومی پرچم قرار دیا گیا' اور مسلمانوں پر جو مظالم توڑے گئے ان کی تفصیل ''پیر پور رپورٹ'' میں درج ہے۔

سکولوں' کالجوں' ریلوے سٹیشنوں' بازاروں اور پبلک مقامات پر پانی جیسے قدرتی تحفے کے استعمال میں بھی ''ہندو پیاؤ'' اور ''مسلم پیاؤ'' کا انتظام کیا گیا۔ یہ حقیقت ہے کہ ہندوؤں نے مسلمانوں کے خلاف تعصب و نفرت کا ایک خاص منفی اور عملی رویہ اختیار کر رکھا تھا اور اس کا سبب مسلمانوں کا اسلام تھا۔ اسی کے باعث ان کا طرزِ عمل ظالمانہ اور جارحانہ تھا۔ لہٰذا کہا جا سکتا ہے کہ قیامِ پاکستان ہندوؤں کے منفی طرزِ عمل کا بھی نتیجہ تھا۔

(3) اسلامی تشخص: ہماری رائے میں یہ تیسرا نقطۂ نظر ہی اصل حقیقت ہے' یعنی یہ کہ قیامِ پاکستان کا اصل محرک اسلام اور صرف اسلام تھا۔ اس موقف کی تائید و حمایت بھی مسلمانانِ ہند کی پوری ہزار سالہ تاریخ اور ان کے مذہب و تہذیب و ثقافت سے ہوتی ہے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب تو اپنی کتاب ''اسلام اور پاکستان'' کا آغاز ہی اس جملے سے کرتے ہیں: ''اگر کوئی یہ کہے کہ ''پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا تو پورے ملک میں شاید کوئی ایک شخص بھی ایسا نہ نکل سکے جو اس کی تردید کرے۔ لیکن اگر سوال یہ ہو کہ تحریکِ پاکستان کا اصل محرک مذہبی و دینی تھا یا معاشی و معاشرتی؟ تو اس کے جواب میں اختلاف کی بڑی گنجائش ہے۔''

جناب محمد حنیف رامے نے ''اسلامی سوشلزم'' کی وضاحت و وکالت کے لئے جب ایک کتابچہ ''نظریۂ پاکستان'' کے عنوان سے شائع کیا تو اس کی ابتدائی سطور میں بڑے جوشیلے انداز میں لکھا: ''پاکستان کا مطلب کیا' لا الہ الا اللہ'' یہ تھا وہ نعرہ جو تحریکِ پاکستان کے دنوں میں ہمارے کانوں کے ساتھ ساتھ ہمارے دلوں میں گونجتا تھا اور یہ تھا وہ جادو جس نے ہماری سوئی ہوئی قوم میں نئی زندگی کی لہر دوڑا دی تھی اور اُسے قائداعظم کے جھنڈے تلے جمع کر دیا تھا..... یہ کلمہ اپنے اندر معانی کا ایک جہاں رکھتا ہے۔ جب ہم تمام خداؤں کو چھوڑ کر ایک اللہ سے اپنا ناتا جوڑتے ہیں اور اس کے سامنے سجدہ ریز ہو جاتے ہیں تو ہمیں سو سجدوں سے نجات مل جاتی ہے۔''

اسلام کی حفاظت اسلامی عہد میں

اس کلمۂ توحید ہی کو پھیلانے کے لئے عہدِ نبوی ﷺ ہی سے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم' صوفیا' علمائے دین' سپہ سالار اور سلاطین سرزمین ہندوستان کا رُخ

اختیار کرنے لگے تھے۔ پھر دنیا نے نیرنگیٔ سیاست کا یہ تماشا مسلسل ایک ہزار سال تک دیکھا کہ اقلیت نے اکثریت پر شاہانہ انداز مگر انتہائی عدل و انصاف اور رواداری کے ساتھ ایسی حکومت کی کہ اکثریت نے حزب اختلاف کی صورت اختیار نہ کی۔ مسلمان سلاطین اور بادشاہوں سے اختلاف ہوا تو مسلمانوں ہی کو ہوا' اور شریعت کی بنیاد پر ہوا۔ دو قومی نظریہ'' مسلمانوں کے طویل عہدِ حکومت میں موجود نہ تھا۔

محمد بن قاسم سے لے کر بہادر شاہ ظفر تک' اربابِ اقتدار کو شریعت اسلامیہ کی طرف مائل رکھنے کے یا کم از کم انہیں دینِ اسلام کی راہ سے منحرف نہ ہونے کے سلسلے میں علماء و صوفیاء نے جو گراں قدر خدمات انجام دی ہیں اور مسلمان بادشاہوں اور مسلمان علماؤں' مفتیوں اور قاضیوں کے درمیان جو ایک آویزش چلی آئی ہے' وہ اس بات کا بین ثبوت ہے کہ برعظیم پاک و ہند میں ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی مسائل سے بالاتر ایک اور بڑا مسئلہ' اس خطے میں اسلام کی حفاظت' بالادستی اور اقامتِ دین کا مسئلہ رہا ہے جو آبادی کے لحاظ سے اقلیت میں ہونے کے باوجود مساوات اور برابری کا حق طلب کرتا رہا ہے۔

عہدِ غلاماں سے لے کر خاندانِ تغلق کی حکمرانی تک سلطان المشائخ حضرت نظام الدین اولیاء اور ان کے خلفاء نے سترہ سلاطین کا وقت دیکھا' جنہوں نے حضرت پر کیسی کیسی سختیاں کیں۔ سلطان قطب الدین مبارک شاہ نے حکم جاری کیا کہ'' ہر چاند رات کو دہلی کے سب مشائخ مجھے سلام کرنے اور نئے چاند کی دعا دینے دربار میں آتے ہیں' اگر آئندہ ماہِ نو کی تہنیت کو حاضر نہ ہوں تو بزوران کو حاضر کیا جائے۔'' حضرت اس حکم کے باوجود اطمینان سے خانقاہ میں مقیم رہے اور بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔

سلطان غیاث الدین تغلق نے قلعے میں سماع کے مبنی بر شریعت ہونے یا نہ ہونے کے مسئلے پر بحث کے لئے مشہور علماء و شیوخ کو بلایا۔ 253 علماء و مشائخ موجود تھے۔ حضرت نے درباری مشائخ کے مؤقف کی تردید کر کے اپنا مؤقف تسلیم کرایا۔

شیخ شہاب الدین خراسانی حق گو نے سلطان محمد تغلق کو صراطِ مستقیم پر لانے کی کوشش میں ظلم و ستم برداشت کئے۔ سلطان نے حکم دیا:'' شیخ شہاب الدین کی داڑھی کے بال نوچے جائیں۔'' حکم ہوا'' شیخ کے پاؤں میں بیڑیاں اور ہاتھوں میں ہتھکڑیاں ڈال دی جائیں۔'' آخر کار تیسرا حکم نازل ہوا کہ'' مجھے سلطان عادل کے نام سے پکارا جائے۔'' شیخ شہاب الدین نے کہا: ''ہم ظالموں کو عادل نہیں کہہ سکتے۔'' سلطان محمد تغلق نے حکم دیا کہ آپ کو دہلی کے قلعے پر سے نیچے پھینک دیا جائے۔'' (معاملہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے مابین نہیں ہے)

شیخ عبدالقدوس گنگوہی نے اکبر کے والد نصیرالدین ہمایوں کی مخالفت کیوں کی؟ محض اسلام کی خاطر۔ انہوں نے برملا کہا:'' ہمایوں بادشاہ اسلام کو تباہ کرتا ہے اور کفر و اسلام کے مابین فرق نہیں کرتا۔'' (یہاں بھی دو قومی نظریہ موجود نہیں۔ خالص دو مسلمانوں کا باہمی معاملہ ہے)

''اکبر نے جب اپنا نیا دین جاری کیا تو اس کے دربار میں یہ رائے عام تھی کہ ملّت اسلام جاہل بدوؤں میں پیدا ہوئی تھی۔ کسی مہذب و شائستہ قوم کے لئے وہ موزوں نہیں۔ نبوت' وحی' حشر و نشر' دوزخ و جنت' ہر چیز کا مذاق اڑایا جانے لگا۔ یہاں تک کہ لفظ احمد ﷺ اور محمد ﷺ سے بھی بے زاری ہوگئی اور جن کے ناموں میں یہ لفظ شامل تھا' ان کے نام بدلے جانے لگے' دنیا پرست علماء نے اپنی کتابوں اور خطبوں میں نعت لکھنی چھوڑ دی۔ بعض ظالم اس حد تک بڑھے کہ دجّال کی نشانیاں ہادیٔ اعظم ﷺ پر چسپاں کرنے لگے' العیاذ باللہ' العیاذ باللہ (مولانا مودودی۔'' رسالہ تجدید و احیائے دین'')

یہ تھا شہنشاہ جلال الدین اکبر کا دور۔ ایک مسلمان بادشاہ کا عہدِ حکومت جو مسلمان گھرانے میں پیدا ہوا تھا لیکن جو نصف صدی پر مشتمل اپنی حکمرانی کے عرصے میں اسلام کی عمارت کو زمین بوس کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ ایک ایسے جابر سلطان کے خلاف حق کی آواز بلند کرنا آسان نہ تھا۔ تاہم اسلام کا ایک دائمی اور زندہ معجزہ ہے کہ سخت سے سخت اور کافر سے کافر' فاسق و فاجر حکمرانوں کے سامنے تمام زبانیں خاموش رہتیں' لیکن جب اسلام کی حُرمت کا سوال پیدا ہوتا اور دین کی اساسیات میں رخنہ پڑنے کا اندیشہ ہوتا تو کچھ لوگ حق کی آواز بلند کرتے اور جان سے کھیل جاتے۔ صدر الصدور شیخ عبدالنبی نے بادشاہ کی کفر نواز پالیسی سے کھلم کھلا اختلاف کیا۔ ان کے خلاف اکبری حکم جاری ہوا کہ وہ انہیں حجاز کی طرف بھیج دیا جائے اور وہ حجاز سے بلا اجازت ہندوستان واپس نہ آئیں۔ شیخ عبدالنبی نے حج ادا کیا اور واپس آ گئے۔ اس پر انہیں بادشاہ کے حکم پر گرفتار کر لیا گیا۔ بادشاہ نے ان سے نہایت درشت لہجے میں گفتگو کی اور ان کی اہانت کی۔ حکم دیا کہ انہیں قید سخت میں ڈال دیا جائے۔ حکم شاہی کی تعمیل ہوئی۔ وہ دیر تک قید خانے میں رہے۔ اسی دوران انہیں بادشاہ کے حکم پر گلا دبا کر قتل کر دیا گیا۔

عہدِ اکبری میں علمائے سُو نے فتویٰ جاری کیا کہ توہینِ رسالتؐ کے مجرم کو معافی دی جا سکتی ہے۔ شیخ منور بن اسماعیل نے جن کا تعلق پنجاب سے تھا' ایک کتاب لکھ کر اس فتوے کی تردید کی۔ انہیں پانچ سال تک قلعہ گوالیار (عقوبت خانہ) میں قید رکھا گیا۔ قیمتی کتب خانہ بحق سرکار ضبط کر لیا گیا۔

جون پور کے قاضی مُلا یزدی نے اور اُس کی تائید میں بنگال کے قاضی معزّ الملک نے فتویٰ جاری کیا: ''بادشاہ ہند اکبر گمراہ ہو چکا ہے۔ اب اس کے خلاف جہاد واجب ہے۔ اکبر نے ان دونوں کو کشتی میں ڈال کر دریا کے گرداب میں دفن کرا دیا۔'' (بحوالہ'' رودِ کوثر'')

اکبر نے تعدّد ازدواج میں اسلامی احکام کو نظر انداز کر دیا تھا' بلکہ اپنے حق میں مُتعہ کو بھی جائز قرار دیا تھا۔ قاضی یعقوب مانک پوری نے مُتعہ کے خلاف فتویٰ جاری کیا۔ انہیں بھی قتل کرا دیا گیا۔ دو امرائے دربار قطب الدین کوکہ اور شہباز خان نے دلیری کے ساتھ بادشاہ کو سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ شریعت اور شعائرِ اسلام کا مضحکہ نہ اڑائے۔ ان کے خلاف سخت کارروائی کی گئی۔ مخدوم موسیٰ پاک شہید (جن کا مزار ملتان میں پاک گیٹ کے اندر ہے) کے بھائی شیخ عبدالقادر گیلانی' شیخ معین اجمیری' شیخ فرید اور کتنے ہی بزرگوں نے اکبر کو اسلام کا احترام یاد دلایا اور سزا پائی۔ (یہ بھی مسلمانوں کا آپس کا معاملہ تھا۔ یہ دو قومی نظریے کی بات نہیں تھی)

حضرت مجدد الف ثانیؒ بقولِ اقبال

''وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہبان
اللہ نے بروقت کیا جس کو خبردار''

نے اللہ واحد کے سوا کسی شہنشاہ جہانگیر کو سجدہ تعظیمی کرنے سے انکار کر دیا۔ قلعہ گوالیار میں محبوس ہوا' بالآخر سرخرو ہوا اور اورنگ زیب عالمگیر کے لئے راستہ ہموار کیا۔

یہ سب مثالیں ہم نے یہاں یہ ظاہر کرنے کے لئے پیش کی ہیں کہ برعظیم پاک و ہند میں ساڑھے تیرہ سو برس پہلے اسلام کے ورود کے بعد' دو تحریکیں ساتھ ساتھ چل پڑی تھیں۔ اسلام کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ برقرار رکھنا اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات۔

اسلام کو اس کی حقیقی روح کے ساتھ برقرار رکھنے کا نام ہے' نظریۂ پاکستان۔ یہ ہندوستان کے علاوہ دنیا کے کسی بھی ملک میں ہو سکتا ہے' انڈونیشیا اور ملائیشیا میں' مصر و مراکش میں۔

ہندوؤں اور مسلمانوں کے باہمی تعلقات کا نام ہے'' دو قومی نظریہ'' یہ صرف پاک و ہند سے خاص حالات کے تحت مخصوص ہے۔ گویا نظریۂ پاکستان اور دو قومی نظریہ

''ہم معنی'' اصطلاحیں نہیں ہیں۔ یہ دوسری بات ہے کہ ایک دوسرے کے لئے لازم وملزوم کی حیثیت رکھتی ہیں۔ نظریۂ پاکستان کا دوسرا نام اسلام ہے' جو ایک عالمی دین ہے۔ دوقومی نظریئے کی اساس ہندوستان میں سیاست و حکمت کا اُصول ہے جس کو روبہ عمل لاتے وقت مسلمانوں کی اجتماعی زندگی' ان کے مذہب' معیشت' معاشرت' تہذیب' زبان وغیرہ کو ملحوظ رکھنا ضروری ہے۔

سبز اور سفید ڈوریاں

نظریۂ پاکستان اور دوقومی نظریئے کے باہمی تعلق کو ایک تشبیہ سے بھی بیان کیا جاسکتا ہے۔ یوں سمجھو کہ جیسے ایک رسّی ہے جو دو رنگوں کی ڈوریوں کو گوندھ کر بنائی گئی ہے۔ ایک سبز ڈوری ہے' دوسری سفید ہے۔ سبز ڈوری نظریۂ پاکستان ہے اور سفید ڈوری دوقومی نظریہ۔ سبز ڈوری لمبی ہے اور سفید ڈوری نسبتاً چھوٹی ہے' چنانچہ سبز ڈوری کے ساتھ چلتے چلتے ایک مقام پر رک جاتی ہے اور سبز ڈوری اکیلی ہی آگے بڑھتی جاتی ہے۔ سبز ڈوری کا آغاز بعثت نبوی ﷺ سے ہوتا ہے۔ سفید ڈوری کا آغاز اس وقت سے (1857ء) میں ہوتا ہے جب برعظیم میں مسلمانوں کا سیاسی اقتدار ختم ہوا۔ ''تحریک پاکستان'' وہ ہاتھ ہے جس نے مارچ 1940ء میں مسلمانانِ ہند کی ''قراردادِ لاہور'' منظور ہونے کے بعد سات برس کی مسلسل کوشش سے نظریۂ پاکستان (اسلام) کی سبز لڑی کو دوقومی نظریئے کی سفید لڑی سے الگ کردیا۔ چودہ اگست 1947ء کے بعد برعظیم کے شمال مغرب میں پاکستان کی صورت میں اور مشرق میں (اب) بنگلہ دیش کی صورت میں دوقومی نظریہ تو ختم ہوا۔ صرف تاریخ کی کتابوں میں زندہ ہے۔ البتہ پاکستان اور بنگلہ دیش میں نظریۂ پاکستان موجود ہے' اور اُس وقت تک موجود رہے گا جب تک صحیح معنی میں نفاذِ شریعت اسلام اور اقامتِ دین کا پورا پورا بندوبست نہ ہو جائے۔ ایسا ہونے کے بعد ''نظریۂ پاکستان'' کی اصطلاح خود بخود ماند پڑ جائے گی' اور فقط لفظ اسلام یا نظریۂ اسلام مروج ہوگا۔

آزاد بھارت میں دوقومی نظریہ ختم نہیں ہوا۔ وہاں مسلمانوں کی آبادی سترہ' اٹھارہ کروڑ کے قریب ہے۔ آبادی کے لحاظ سے بھارت دنیا کا سب سے بڑا (اسلامی) ملک ہے۔ اتنی بڑی آبادی کو ''اقلیت'' کیونکر کہا جائے گا'' ''قوم'' کیوں نہ کہا جائے گا۔ کیا مسلم دانش کے تحریک پاکستان کے وقت کے بیانات کے مطابق آج بھی مسلمان یہ کہہ سکتے ہیں: ''ہم کسی طرح' کسی بھی تعریف کی رو سے اقلیت نہیں ہیں' بلکہ ہم بجائے خود ایک علیحدہ اور ممتاز قوم ہیں۔''

بھارت کے مسلمانوں کو جس روحانی کرب کا سامنا ہے' وہ بنگلہ دیش اور پاکستان کے مسلمانوں سے مختلف ہے۔ بھارت کے مسلمانوں کو ''دوقومی نظریئے'' کا سامنا ہے اور بنگلہ دیش اور پاکستان کے مسلمانوں کو ''نظریۂ پاکستان'' (اقامتِ دین) کا چیلنج قبول کرنا ہے۔

نظریۂ پاکستان او دوقومی دو مختلف چیزیں ہیں' اگرچہ دونوں کا مقصد و مدعا ایک ہے۔ اس کی مزید تشریح کے لئے اکابرین کی تحریروں اور بیانات کے چند اقتباسات ملاحظہ ہوں۔ یونہی سرسری مطالعہ نہ کیجئے۔ ایک ایک لفظ پر غور کیجئے۔

نظریۂ پاکستان کے حق میں چند آراء

❁ ''اسلام اب بھی ایک زندہ قوت ہے جو ذہنِ انسانی کو نسل و وطن کی قیود سے آزاد کرسکتی ہے۔ اسلام کا عقیدہ یہ ہے کہ مذہب کو فرد اور ریاست دونوں کی زندگی میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام کی تقدیر خود اس کے ہاتھ میں ہے۔ اسے کسی دوسری تقدیر کے حوالے نہیں کیا جاسکتا۔ یہ ایک زندہ اور عملی سوال ہے جس کے صحیح حل پر اس امر کا دارومدار ہے کہ ہم لوگ آگے چل کر ہندوستان میں ایک ممتاز و متمیز کے حامل بن سکیں۔ کیا یہ ممکن ہے کہ ہم اسلام کو بطور ایک اخلاقی تمثیل کے تو برقرار رکھیں' لیکن اُس کے نظام سیاست کے بجائے ان قومی نظامات کو اختیار کریں جن میں مذہب کی مداخلت کا کوئی امکان باقی نہیں رہتا۔'' (علامہ اقبال' آل انڈیا مسلم لیگ کا صدارتی خطبہ' آلہ آباد)

علامہ اقبال نظریۂ پاکستان کے سب سے بڑے مفسر ہیں۔ مزید تشریح کے لئے ملاحظہ ہو ''ندائے خلافت'' کا اقبال نمبر)

❁ ''وہ کونسا رشتہ ہے جس میں منسلک ہونے سے تمام مسلمان جسدِ واحد کی طرح ہیں۔ وہ کونسی چٹان ہے جس پر ان کی ملّت کی عمارت اُستوار ہے۔ وہ کونسا لنگر ہے جس سے اس اُمت کی کشتی محفوظ کردی گئی ہے؟ وہ رشتہ' وہ چٹان' وہ لنگر اللہ کی کتاب قرآن کریم ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جوں جوں ہم آگے بڑھتے جائیں گے۔ ہم میں زیادہ سے زیادہ اتحاد پیدا ہوتا جائے گا۔ ایک خدا' ایک رسولؐ ایک کتاب' ایک اُمت'' (قائداعظم' سالانہ اجلاس مسلم لیگ' کراچی 1943ء)

❁ ''آپ نے غور فرمایا۔ پاکستان کے مطالبے کا محرک کیا تھا؟ مسلمانوں کے لئے ایک جداگانہ مملکت کی وجہ جواز کیا تھی؟ تقسیم ہند کی ضرورت کیوں پیش آئی؟ اس کی وجہ نہ ہندوؤں کی تنگ نظری ہے نہ انگریزوں کی چال بازی۔ یہ اسلام کا بنیادی تقاضا تھا (قائداعظم' مسلم یونیورسٹی علی گڑھ' 1944ء)

❁ ''ہم نے پاکستان کا مطالبہ ایک زمین کا ٹکڑا حاصل کرنے کے لئے نہیں کیا تھا' بلکہ ہم ایک ایسی تجربہ گاہ حاصل کرنا چاہتے تھے جہاں ہم اسلام کے اصولوں کو آزما سکیں۔'' (قائداعظم' اسلامیہ کالج پشاور' 1948)

ڈاڑھی مونچھ صفاچٹ' کافر اعظم' سیکولر محمد علی جناح کا ذاتی تعلق اسلام سے کیا تھا' یہ جاننے کے لئے ان کے بیان کا ایک اقتباس کافی ہونا چاہئے۔ یہ بیان روزنامہ ''انقلاب'' 22 اکتوبر 1939ء کو یعنی ''قراردادِ لاہور'' کی منظوری سے بھی پہلے چھپا تھا: ''مسلمانو! میں نے دنیا کو بہت دیکھا ہے۔ دولت' شہرت اور عیش کے بہت لطف اٹھائے۔ اب میری زندگی کی واحد تمنا یہ ہے کہ میں مسلمانوں کو آزاد اور سربلند دیکھوں۔ میں چاہتا ہوں کہ جب مروں تو یہ یقین اور اطمینان لے کر مروں کہ میرا ضمیر اور میرا خدا گواہی دے رہا ہو کہ جناح نے اسلام سے خیانت اور غداری نہیں کی۔ میں آپ کی داد اور گواہی کا طلبگار نہیں ہوں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ مرتے دم میرا دل ایمان اور میرا ضمیر گواہی دے کہ جناح' تم نے اسلام کی مدافعت کا حق ادا کردیا۔ جناح' تم نے مسلمانوں کی حمایت کا فرض بجا لایا۔ میرا خدا یہ کہے کہ بے شک تم مسلمان پیدا ہوئے اور کفر کی طاقتوں کے غلبے میں اسلام کا پرچم سربلند رکھتے ہوئے مسلمان مرے۔''

❁ ''مسلمانانِ ہند کو کوئی مستقل مرکز چاہئے جہاں سے اسلام کے محرکات اور عزائم فروغ پاسکیں اور جہاں سے وہ مکمل آزادی اور مادی اقتدار کے ساتھ خدائی قانون کو بے روک ٹوک نافذ کرسکے' بلکہ اسلام کے بے مثال قانون عدل و حکمت کا عملی نمونہ قائم کرکے دنیا کو مشعلِ ہدایت دکھلا سکے' جس کی آج سب سے زیادہ دنیا کو ضرورت ہے۔'' (علامہ شبیر احمد عثمانی' علماء کانفرنس کلکتہ' 10 اکتوبر 1945ء)

❁ ''پاکستان اسلام کی ایک تجربہ گاہ ہے اور ہم دنیا کو دکھلائیں گے کہ تیرہ سو برس پرانے اسلامی اُصول کس قدر کارآمد ہیں۔'' (لیاقت علی خان' پشاور' جنوری 1948ء)

دوقومی نظریئے کے حق میں چند آراء

❁ ''میں بنارس کے کمشنر مسٹر شیکسپیئر سے مسلمانوں کی تعلیم کے بارے میں گفتگو کر رہا تھا اور وہ ہندوؤں کے اس مطالبے کے بارے میں میرے اعتراضات غور سے سن رہے تھے کہ اردو زبان اور فارسی رسم الخط کی بجائے بھاشا زبان اور انگریزی رسم الخط کو سرکاری دفاتر اور عدالتوں میں رائج کیا جائے۔ آخر انہوں نے کہا کہ آج یہ پہلا موقع ہے کہ میں نے تم سے خاص مسلمانوں کی ترقی

کا ذکر سنا ہے۔ اس سے پہلے تو تم ہمیشہ عام ہندوستانیوں کی بھلائی کا خیال ظاہر کرتے تھے۔ میں نے کہا: ''اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے۔ آگے آگے اس سے زیادہ مخالفت اور عناد اُن لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں' بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا۔ وہ دیکھے گا' انہوں نے کہا اگر آپ کی پیشین گوئی صحیح ہوئی تو نہایت افسوس ہے۔ میں نے کہا مجھے بھی افسوس ہے' مگر اپنی پیشین گوئی پر مجھے پورا یقین ہے۔'' (سرسید احمد خان 1867ء۔ سید صاحب کے اس بیان کو دو قومی نظریئے کے بارے میں پہلا کھلا اعلان سمجھنا چاہئے۔)

❁ ''میں نہیں سمجھتا کہ کوئی مسلمان ایک لمحے کے لئے بھی کسی ایسے نظامِ سیاست پر غور کرنے کے لئے آمادہ ہو گا جو کسی ایسے وطن یا قومی اصول پر ہو جو اسلام کے اصولِ توحید کی نفی کرنے پر مبنی ہو۔ یہ وہ مسئلہ ہے جو آج مسلمانانِ ہند کے سامنے ہے..... میری خواہش ہے کہ پنجاب' صوبہ سرحد' سندھ اور بلوچستان کو ایک ہی ریاست میں ملا دیا جائے۔'' (علامہ اقبال' مسلم لیگ کا صدارتی خطبہ الٰہ آباد)

❁ ''اس خواہش کو خواب و خیال ہی کہنا چاہئے کہ ہندو اور مسلمان مل کر ایک مشترکہ قومیت تخلیق کر سکیں گے۔ یہ لوگ آپس میں شادی بیاہ نہیں کرتے۔ نہ ایک دسترخوان پر کھانا کھاتے ہیں۔ میں واشگاف لفظوں میں کہتا ہوں کہ وہ دو مختلف تہذیبوں سے تعلق رکھتے ہیں' اور ان تہذیبوں کی بنیاد ایسے تصورات اور حقائق پر رکھی گئی ہے جو ایک دوسرے کی ضد ہیں بلکہ اکثر متصادم ہوتے رہتے ہیں۔ انسانی زندگی کے متعلق ہندوؤں اور مسلمانوں کے خیالات و افکار ایک دوسرے سے بالکل مختلف ہیں۔ یہ بھی ایک واضح حقیقت ہے کہ ہندو اور مسلمان اپنی اپنی ترقی کی تمناؤں کی مختلف تاریخوں سے نسبت رکھتے ہیں۔ ان کے تاریخی ماخذ اور وسائل مختلف ہیں۔ ان کی رزمیہ نظمیں' ان کے سربرآوردہ بزرگ اور قابلِ فخر تاریخی کارنامے سب مختلف اور الگ الگ ہیں۔ اکثر اوقات ایک قوم کا زعیم اور رہنما دوسری قوم کی بزرگ اور برتر ہستیوں کا دشمن ثابت ہوتا ہے۔ ایک قوم کی فتح دوسری قوم کی شکست ہوتی ہے۔ ایسی دو قوموں کو ایک ریاست اور ایک حکومت کی ایک مشترکہ گاڑی کے دو بیل بنانے اور ان کو باہمی تعاون کے ساتھ قدم بڑھانے پر آمادہ کرنے کا نتیجہ یہ ہو گا کہ دونوں کے دلوں میں بے صبری اور بے چینی روز بروز بڑھتی رہے گی جو انجام کار تباہی لائے گی' خاص طور پر اس صورت میں کہ ان میں سے ایک قوم تعداد کے لحاظ سے اقلیت میں ہو اور دوسری قوم کو اکثریت حاصل ہو۔ ایسی متحدہ ریاست کا آئین اور اُس پر عمل درآمد خاک میں مل جائے گا (قائداعظم' خطبۂ صدارت' اجلاس مسلم لیگ لاہور۔ 22/مارچ 1940ء)

نظریۂ پاکستان اور دو قومی نظریئے کے ان وضاحتی اقتباسات کے علاوہ بے شمار ایسے بیانات اور تحریریں نقل کی جا سکتی ہیں جن سے معلوم ہو سکتا ہے کہ ''نظریۂ پاکستان'' کا قبلہ قرآن و سنت' عہدِ رسالت اور خلافت راشدہ کی طرف ہے' اور ''دو قومی نظریئے'' کا رخ انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہندوؤں سے بھی آزادی حاصل کر کے ایک ایسے آزاد' خودمختار اور مستقل مرکز کا قیام ہے جہاں نظریۂ پاکستان کا اطلاق ہو سکے۔

نظریۂ پاکستان اور اسلام تو ہم معنی ہیں' لیکن نظریۂ پاکستان اور دو قومی نظریے میں ایک فرق ہے۔ دو قومی نظریہ دراصل نظریۂ پاکستان کے بحرِ ظلمات کی ایک ندی ہے جو فقط سرزمین ہندوستان میں بہتی آ رہی ہے۔

نظریۂ پاکستان کا نصب العین اسلام اور دین کی اقامت ہے۔ اس کے اساسیات کیا ہیں؟ آئندہ باب میں ملاحظہ کیجئے:

2

اسلام کیا ہے؟

نظریۂ پاکستان یا ''اسلام'' کے شرعی و لغوی معنی ہیں' اطاعت و تسلیم' باطنی آلائشوں سے پاک و صاف ہونا' صلح و احسان' سلامتی اور سپردگی۔ اسلام کے تین بنیادی ستون ہیں:

(1) ایمانیات (توحید' رسالت' الہامی کتب' ملائکہ اور آخرت)

(2) عبادات (کلمۂ توحید' نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج)

(3) اسلامی اخلاقیات

اللہ اور آخری رسول ﷺ نے محض توفیقِ الٰہی سے مسلح ہو کر تنہائی اور بے سروسامانی کی حالت میں اپنے گرد و پیش کی پوری دنیا کو' یونان و روما' ایران اور ہندوستان وغیرہ کو چیلنج دیا' آپؐ نے عیسائیوں سے کہا کہ تم ایک انسان کو خدا کا بیٹا کہتے ہو اور تثلیث و کفارہ کے باطل عقائد کے پابند ہو' اس لئے گمراہ ہو۔ آپؐ نے یہودیوں کو للکارا کہ عزیر خدا کا بیٹا نہ تھا۔ تم نے موسیٰؑ کی شریعت کو ترک کر دیا۔ تم نے عیسیٰؑ کی نبوت سے انکار کیا۔ لہٰذا تم بھی گمراہ ہو۔ آپؐ نے مشرکین (ہندوؤں) کو ڈانٹا کہ تم خالقِ کائنات اور معبودِ حقیقی کے ساتھ بتوں کو شریک کرتے ہو۔ گویا خدا کی خدائی سے منکر ہو' اس لئے تم بھی گمراہ ہو۔ مصر' ایران' روما اور ہندوستان کی تہذیبوں کو پکار پکار کر بتا دیا کہ تم اپنی جن عظمتوں کا زعم رکھتے ہو' وہ سب باطل ہیں۔ تم نے انسانوں' پتھروں' درختوں اور ستاروں کو خدا بنا رکھا ہے اور ان کے نام پر انسانیت کو ظلم و ستم کا نشانہ بنا رہے ہو۔ غرض محمد رسول اللہ ﷺ کا چیلنج پوری دنیا کے تمام سابقہ مذاہب اور اقوام کے نام تھا۔

توحید اور اُس کی شاخیں

(1) توحید: اسلام کے دین کی بنیاد ''توحید'' پر ہے۔ توحید صرف اللہ کے واحد ہونے کا نام نہیں' بلکہ تمام انسانوں کو مختلف و متفرق قبلہ ہائے مقصود سے ہٹا کر صرف ایک ذات کے ساتھ وابستہ کرنا بھی ہے' تاکہ وہ اللہ کی بندگی کی وجہ سے ایک کنبے کے افراد کی طرح بھائی بھائی بن جائیں۔ سورہ بنی اسرائیل کی آیت 23 میں اعلان کر دیا گیا ''اور تیرے رب کا فیصلہ یہ ہے کہ تم لوگ اس کے سوا کسی کی عبادت نہ کرو۔''

❁ ''لوگو! تمہارا معبود خدائے واحد ہے۔ اس بڑے مہربان اور رحم والے کے سوا کوئی عبادت کے لائق نہیں'' (بقرہ:163)

❁ ''حکومت تو بس ایک اللہ ہی کی ہے۔ اس نے حکم دیا ہے کہ صرف اسی کی عبادت کرو۔ یہی دین سیدھا ہے' مگر اکثر لوگ نہیں جانتے۔ (یوسف:40)

❁ ''اگر آسمان اور زمین میں اللہ کے سوا اور معبود ہوتے تو زمین اور آسمان درہم برہم ہو جاتے۔''

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت سے حدیث نبویؐ ہے:

''اسلام کی بنیاد پانچ ستونوں پر قائم کی گئی ہے۔ ایک اس امر کی شہادت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں اور محمد ﷺ اس کے بندے اور رسول ہیں۔ دوسرے نماز قائم کرنا' تیسرے رمضان کے روزے رکھنا' چوتھے زکوٰۃ دینا' پانچویں حج کرنا۔ (بخاری' مسلم)

❁ حضرت معاذ بن جبلؓ سے ارشادِ نبویؐ ہے: ''لا الہ الا اللہ کی شہادت دینا جنت کی کنجی ہے۔'' (احمد)

قرآن و حدیث نے بتا دیا کہ معبود صرف اللہ ہے۔ اس کے سوا ہر چیز فانی ہے۔ جن چیزوں کی تم پرستش کرتے ہو' وہ نہ تمہیں کچھ نفع دے سکتی ہیں' نہ ضرر پہنچا سکتی ہیں۔ سورہ القصص میں حکم آ گیا: ''اور اللہ کے سوا کسی کو معبود نہ بنانا' کیونکہ اللہ کے سوا اور کوئی معبود نہیں۔ اس کی ذات کے سوا سب چیزیں فانی ہیں۔ حکومت اسی کی ہے' اور اسی کی طرف تم کو لوٹ کر جانا ہے۔''

❁ ''مشرکین اللہ کے سوا ان کی پرستش کرتے ہیں جو ان کو نہ ضرر پہنچا سکتے ہیں نہ نفع اور کہتے ہیں کہ وہ تو اللہ کی جناب میں ہمارے سفارشی ہیں۔ اے رسول ﷺ! ان سے کہہ دو کہ کیا تم اللہ کو ایسی خبر سنانا چاہتے ہو جس کو وہ نہ آسمان میں پاتا ہے نہ زمین میں۔ اللہ ان لوگوں کے شرک سے بالاتر اور پاک ہے۔'' (یونس)

انسان فطرتاً توہم پرست ہے۔ اسی وجہ سے وہ بہت جلد غیر اللہ کے خوف میں مبتلا ہو جاتا ہے۔ غیر اللہ کے سہارے ڈھونڈنے لگتا ہے' اسی وجہ سے غیر اللہ سے توسل و تعلق کی صورتیں اور شرک کی بہت سی اقسام ہیں مثلاً:

(1) ملائکہ پرستی' جنات پرستی' ستارہ پرستی' آبا پرستی' بت پرستی' عناصر پرستی' گوسالہ پرستی' گئو پرستی وغیرہ۔
(2) اہلِ کتاب کا شرک' احبار پرستی' حضرت مسیحؑ کو رب بنانا۔
(3) اپنی تقدیس و برتری کا دعویٰ' خود پرستی وغیرہ۔
(4) منافقین کا شرک

ہندوستان' عربستان اور دوسرے ملکوں میں سورج' چاند' ستاروں' پہاڑ' دریا' ہوا' پانی اور آگ کی پرستش عام تھی۔ اسلام نے بتایا کہ یہ انسان کی بہت بڑی ذلت ہے کہ وہ اشرف المخلوقات کے رتبہ بلند پر فائز ہونے کے باوصف چھوٹے چھوٹے مظاہر قدرت کے آگے سر جھکائے' حالانکہ تمام مظاہر قدرت انسان ہی کی خدمت کے لئے پیدا کئے گئے ہیں اور انسان کے مغلوب و مفتوح و مسخر قرار دیئے گئے ہیں۔ گویا وضاحت سے بتا دیا گیا کہ مظاہر فطرت' آسمان و زمین' مہر و ماہ' انجم و کہکشاں' حیوانات' نباتات' جمادات' تمام تمہارے خادم ہیں۔ ان کے آگے جھکنا کیا' ان پر قبضہ کرو اور اپنے جائز استعمال میں لاؤ۔

❁ ''یہ تو ہمارا کرم ہے کہ ہم نے بنی آدم کو بزرگی دی اور انہیں خشکی و تری میں سواریاں عطا کیں اور ان کو پاکیزہ چیزوں سے رزق دیا اور اپنی بہت سی مخلوقات پر نمایاں فوقیت بخشی (بنی اسرائیل:70)

❁ ''وہ اللہ ہی تو ہے جس نے تمہارے لئے سمندر کو مسخر کیا' تاکہ اس کے حکم سے کشتیاں اس میں چلیں اور تم اس کا فضل تلاش کرو اور شکر گزار ہو۔ اس نے زمین اور آسمانوں کی ساری ہی چیزوں کو تمہارے لئے مسخر کر دیا' سب کچھ اپنے پاس سے۔ اس میں بڑی نشانیاں ہیں' ان لوگوں کے لئے جو غور و فکر کرنے والے ہیں۔''

(جاثیہ:12'13)

❁ ''زمین اور آسمان کی پیدائش میں اور رات اور دن کے باری باری آنے میں ان ہوشمند لوگوں کے لئے بہت نشانیاں ہیں' جو اٹھتے بیٹھتے اور لیٹتے ہر حال میں خدا کو یاد کرتے ہیں اور زمین اور آسمانوں کی ساخت میں غور و فکر کرتے ہیں (وہ بے اختیار بول اٹھتے ہیں: ''پروردگار یہ سب کچھ تو نے فضول اور بے مقصد نہیں بنایا ہے تو پاک ہے تو قیامت کے دن ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچائیو۔ (آل عمران:191,190)

قرآن نے وضاحت کر دی کہ آبا و اجداد اور قبائل کی عظمت پر فخر کرنا اور حسب نسب پر اترانا بالکل بے کار ہے۔ کوئی برہمن ہوا تو کیا اور شودر ہوا تو کیا' اس کی اسلام میں کوئی گنجائش نہیں ہے۔ یہ تو صرف تمہاری شناخت کے لئے رکھے گئے ہیں۔ ورنہ اصلی عزت و تکریم تو اسی کی ہے جو اعمال میں نیک اور متقی ہو۔

سورہ حجرات' آیت ؟؟ میں فرمایا: ''لوگو' ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا اور پھر تمہاری قومیں اور برادریاں بنا دیں' تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچانو۔ درحقیقت اللہ کے نزدیک تم میں سب سے زیادہ عزت والا وہ ہے جو تمہارے اندر سب سے پرہیزگار ہے۔''

اللہ نے صاف صاف کہہ دیا کہ زمین پر حکومت و سلطنت کرنا کسی خاص بادشاہ یا راجا کی اولاد یا قوم کا حق نہیں۔ زمین کی وراثت صرف صالح لوگوں کا حق ہے یعنی ان کا جو اس ذمہ داری کے تحمل کی صلاحیت رکھتے ہوں۔ سورۃ انبیاء کی آیت 105 میں آیا ہے: ''اور زبور میں ہم نصیحت کے بعد یہ لکھ چکے ہیں کہ زمین کے وارث ہمارے نیک اور صالح بندے ہوں گے۔''

آباء پرستی شرک کی بدترین صورت ہے۔ لاکھوں کروڑوں انسان محض اس لئے شرک کا ارتکاب کر رہے ہیں کہ ان کے باپ دادا بھی ایسا کرتے آئے ہیں۔ کئی غلط اور مشرکانہ رسوم اسلامی معاشروں میں اس لئے رائج ہے کہ لوگوں کے بزرگ اور آباو اجداد ان کو جائز رکھتے ہیں۔ اسلام نے قدامت پرستی اور آباو اجداد کی تقلید کی سخت ممانعت کی ہے:

❁ ''ان سے جب کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل کئے ہیں ان کی پیروی کرو تو جواب دیتے ہیں کہ ہم تو اسی طریقے کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے آباو اجداد کو پایا ہے۔ اچھا اگر ان کے آباو اجداد نے عقل سے کچھ بھی کام نہ لیا ہو اور راہ راست نہ پائی ہو تو کیا پھر بھی یہ انہی کی پیروی کئے چلے جائیں گے؟

(بقرہ:170)

❁ ''اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ پیروی کرو اس چیز کی جو اللہ نے نازل کی ہے تو کہتے ہیں کہ ہم تو اس چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کیا یہ انہی کی پیروی کریں گے' خواہ شیطان ان کو بھڑکتی ہوئی آگ ہی کی طرف یوں نہ بلاتا رہا ہو۔''

(لقمان:21)

❁ ''اے لوگو! جو ایمان لائے ہو' اگر تمہارے ماں باپ اور بہن بھائی ایمان پر کفر کو ترجیح دیں تو ان سے دوستی نہ رکھو (توبہ:23)

❁ ''اور جب کوئی بے حیائی کا کام کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ ہم نے اپنے باپ دادا کو اسی طریق پر کاربند دیکھا ہے اور اللہ نے ہمیں اسی کا حکم دیا ہے۔ کہہ دو کہ اللہ بے حیائی کے کام کرنے کا ہرگز حکم نہیں دیتا۔''

(اعراف:28)

❁ (حضرت ابراہیمؑ نے مشرکین سے پوچھا) ''کیا یہ بت' جن کو تم پکارتے ہو تمہاری بات سنتے ہیں؟ یا تم کو کچھ نفع یا نقصان پہنچاتے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ نہیں' لیکن ہم نے اپنے باپ دادا کو ایسا ہی کرتے دیکھا ہے۔'' (الشعراء:73تا74)

(2) رسالت: چونکہ مختلف مذاہب کے مقدس بانیوں' انبیاء اور دوسرے بڑے بڑے مصلحوں اور ولیوں کو ان کے عقیدت مندوں نے اپنی جہالت کے باعث کائنات کا خالق و مالک تصور کر رکھا تھا' اس لئے ضروری ہوا کہ اللہ کی توحید و معبودیت کے مرتبے کو قائم کرنے کے بعد رسول کریم ﷺ کی بشریت' رسالت اور ختمیت کی حیثیت کو بھی واضح کر دیا جائے تاکہ انسان پرستی' بت

پرستی اور شرک کی دوسری شکلوں کی عادی دنیا کہیں ان کو بھی معبود نہ بنا لے۔ چنانچہ پہلے تو یہ واضح کیا گیا کہ محمد ﷺ بھی تمہاری ہی طرح بشر ہیں۔ پھر وضاحت کی گئی کہ یہ اللہ کے بھیجے ہوئے رسول ہیں اور ان کو کسی خاص قبیلے یا قوم کے پاس نہیں بھیجا گیا' بلکہ یہ پوری انسانیت اور تمام جہانوں کے لئے ''رحمت اللعالمین'' کی حیثیت رکھتے ہیں۔ پھر یہ بھی صاف صاف بتا دیا گیا کہ یہ اللہ کے آخری رسولؐ ہیں۔ ان کے بعد کوئی رسولؐ نہیں بھیجا جائے گا۔

''اے رسولؐ! ان سے کہہ دو کہ میں بھی تم ہی جیسا ایک بشر ہوں۔ مجھ میں اور تم میں صرف اتنا فرق ہے کہ میرے پاس وحی آتی ہے کہ تمہارا معبود وہی ایک معبود ہے' تو شخص اپنے رب سے ملنے کی امید رکھے' اسے چاہئے کہ عمل نیک کرے اور اپنے رب کی عبادت میں کسی کو شریک نہ بنائے (کہف:110)

❁ ''ہم نے تم کو حق کے ساتھ بھیجا ہے' بشارت دینے والا اور ڈرانے والا بنا کر اور کوئی امت ایسی نہیں گزری جس میں کوئی (نبی) متنبہ کرنے والا نہ آیا ہو۔''

(فاطر:24)

❁ ''اور ہم نے کوئی پیغمبر نہیں بھیجا' مگر اپنی قوم کی زبان بولتا تھا' تاکہ انہیں احکام خداوندی کھول کھول کر بتا دے۔ ہم نے اپنے پیغام دینے کے لئے جب کوئی رسول بھیجا ہے' اس نے اپنی قوم ہی کی زبان میں پیغام دیا ہے تاکہ وہ انہیں اچھی طرح کھول کر بات سمجھائے۔'' (ابراہیم:?)

❁ ''اے پیغمبرؐ! جو ارشادات اللہ کی طرف سے تم پر نازل ہوئے ہیں' سب لوگوں کو پہنچا دو اور اگر ایسا نہ کیا تو تم اللہ کے پیغام پہنچانے میں قاصر رہے یعنی پیغمبری کا فرض ادا نہ کیا اور اللہ تم کو لوگوں سے بچائے رکھے گا۔ بے شک اللہ منکروں کو ہدایت نہیں دیتا۔'' (مائدہ:67)

❁ ''اے محمدؐ! کہہ دو کہ لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا رسول ہوں۔ وہ جو آسمانوں اور زمین کا بادشاہ ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں۔ وہی زندگی بخشتا ہے اور وہی موت دیتا ہے۔ تو اللہ پر اور اس کے رسول امی پر' جو اللہ پر اور اس کے تمام کلام پر ایمان رکھتے ہیں' ایمان لاؤ اور اُن کی پیروی کرو تاکہ ہدایت پاؤ۔'' (اعراف:158)

❁ اور اے محمدؐ! ہم نے تم کو تمام جہان کے لئے رحمت بنا کر بھیجا ہے۔ (انبیاء:107)

❁ ''اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کا طالب ہوگا' اس کا وہ طریقہ ہرگز قبول نہ کیا جائے گا' اور ایسا شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں ہوگا۔'' (آل عمران: 85)

❁ ''آج ہم نے تمہارے لئے تمہارا دین کامل کر دیا اور اپنی نعمتیں تم پر پوری کر دیں اور تمہارے لئے اسلام کو دین پسند کیا۔'' (مائدہ:3)

❁ ''لوگو! محمدؐ تمہارے مردوں میں سے کسی کے والد نہیں ہیں مگر وہ اللہ کے رسول اور خاتم النبیین ہیں اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔'' (احزاب:40)

(3) الہامی کتب: قرآن کے نزول سے پہلے جو الہامی یا آسمانی کتب نازل ہوئی ہیں' اسلام ان کی تصدیق کرتا ہے۔ مختلف آیات میں صاف طور پر آیا ہے: ''اے پیغمبرؐ! ہم نے یہ سچی کتاب نازل کی ہے جو اپنے سے پہلی کتابوں کی تصدیق کرتی ہے اور ان سب پر شامل ہے''۔

❁ ''یہی بات پہلے آئے ہوئے صحیفوں میں مرقوم ہے یعنی ابراہیمؑ اور موسیٰؑ کے صحیفوں میں'' (الاعلیٰ:19)

❁ ''یہ تورات اور انجیل اور قرآن میں سچا وعدہ ہے جس کا پورا کرنا اسے ضرور ہے اور اللہ سے زیادہ وعدہ پورا کرنے والا کون ہے؟''

قرآن مجید میں الہامی کتابوں کا ذکر تین ناموں کے تحت کیا گیا ہے۔ **(1)** صحف جو صحیفہ کی جمع ہے اور جس کے معنی ہیں کوئی چیز جو پھیلائی جائے اور جس پر لکھا جائے۔ **(2)** زبور' یہ لفظ قرآن مجید میں تین دفعہ آیا ہے (النساء:163' بنی اسرائیل:55' انبیاء:105)۔ زبور کے معنی ہیں کوئی تحریر یا کتاب یا وہ کتاب جس میں عقل و حکمت کی باتیں ہوں۔ خاص طور پر حضرت داؤد علیہ السلام کی کتاب کو زبور کہا گیا ہے۔ **(3)** تیسرا نام کتاب ہے۔ قرآن مجید میں الہامی کتب اس نام سے بھی موسوم ہوئی ہیں۔ (آل عمران:79)

کسی مسلمان کا ایمان مکمل نہیں ہوتا جب تک وہ تمام انبیاء اور ان کے ساتھ بھیجی گئی کتابوں پر ایمان نہ لائے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن مجید یہ بھی بتاتا ہے کہ اب ان کی کتابیں محرف و مبدل ہو گئی ہیں۔

(4) ملائکہ: توحید الٰہی' نبوت و رسالت اور الہامی کتب کے ساتھ ساتھ فرشتوں پر بھی ایمان لانا جزو اسلام ہے۔ قرآن مجید میں بعض ملائکہ یعنی فرشتوں کے نام بھی مذکور ہیں مثلاً جبریل اور میکائیل۔ ملائکہ کا واحد ملک ہے۔ جس کے لغوی معنی قاصد اور پیغام رساں کے ہیں۔ اس لئے قرآن مجید میں ملائکہ کے لئے ''رسل'' کا لفظ بھی استعمال ہوا ہے۔ فرشتوں کے بارے میں چند آیات قرآنی یہ ہیں:

❁ ''اور جب ہم نے فرشتوں کو حکم دیا کہ آدم کے آگے سجدہ کرو تو وہ سب سجدے میں گر پڑے' مگر شیطان نے انکار کیا اور غرور میں آ کر کافر بن گیا۔'' (بقرہ:34)

❁ ''کہہ دو کہ جو کوئی جبریل سے عداوت رکھتا ہو' اسے معلوم ہونا چاہئے کہ جبریل نے اللہ ہی کے حکم سے یہ قرآن تمہارے قلب پر نازل کیا ہے' جو پہلے آئی ہوئی کتابوں کی تصدیق و تائید کرتی ہے اور ایمان لانے والوں کے لئے ہدایت اور کامیابی کی بشارت بن کر آیا ہے۔ (اگر جبریل سے ان کی عداوت کا سبب یہی ہے تو کہہ دو) جو اللہ اور اس کے فرشتوں اور اس کے رسولوں اور جبریل اور میکائیل کے دشمن ہیں' اللہ ان کافروں کا دشمن ہے۔'' (بقرہ:97, 98)

❁ ''مومنو! اللہ پر اور اس کے رسولؐ پر اور جو کتاب اس نے اپنے رسولؐ پر نازل کی ہے اور ہر اس کتاب پر جو اس سے پہلے وہ نازل کر چکا ہے' ایمان لاؤ۔ جس نے اللہ اور اس کے ملائکہ اور اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں اور روزِ آخرت سے کفر کیا' وہ گمراہی میں بھٹک کر دور جا پڑا۔'' (النساء:136)

❁ ''حقیقت یہ ہے کہ اللہ ملائکہ میں سے بھی پیغام رساں منتخب کرتا ہے اور انسانوں میں سے بھی''۔ (الحج:75)

❁ ''ہم نے اس قرآن کو شب قدر میں نازل کرنا شروع کیا اور تمہیں کیا معلوم شب قدر کیا ہے۔ شب قدر ہزار مہینے سے بہتر ہے۔ اس میں روح الامین اور فرشتے ہر کام کے انتظام کے لئے اپنے رب کے حکم سے اترتے ہیں۔ یہ رات طلوع صبح تک امان اور سلامتی ہے''۔ (القدر:1 تا 5)

(5) آخرت: موجودہ زندگی کے بعد موت اور موت کے بعد جزاء و سزا اور آخرت پر ایمان لانا بھی اسلام کے بنیادی پانچ اجزاء میں سے ہے۔ سورہ الاعلیٰ میں ہے: ''مگر تم لوگ تو دنیا کی زندگی ہی کو اختیار کرتے ہو' حالانکہ آخرت بہت بہتر اور پائندہ تر ہے۔'' (آیات:16, 17)

اسلامی عبادات

اسلامی ایمانیات کی طرح عبادات بھی پانچ ہیں یعنی کلمہ' توحید' نماز' روزہ' زکوٰۃ' حج اور یہ ایک دوسرے کے لئے لازم و ملزوم کی حیثیت رکھتے ہیں اور پانچ چیزوں (توحید' رسالت' الہامی کتب' ملائکہ اور آخرت) پر ایمان رکھنے کے ساتھ ساتھ اسلامی عبادات کی ادائیگی بھی فرض کی حیثیت رکھتی ہے۔ ایمانیات غیب کی چیزیں ہیں۔ جو ان پر ایمان لے آیا' وہ مسلمان ہو گیا اور جس نے ان میں سے کسی ایک پر بھی تھوڑا سا شک کیا' وہ خود بخود اسلام سے خارج ہو گیا' اور جس مسلمان نے عبادات (پانچوں ارکان) پر عمل کیا وہ مومن ہو گیا' اور جس نے ایک عبادت سے بھی انحراف کیا' وہ گناہ گار ہو جاتا ہے۔

قرآن و حدیث کی روشنی میں اسلامی عبادات کے ارکان

خمسہ کے ضمن میں چند اشارات یہاں دیئے جا رہے ہیں:

(1) کلمۂ توحید: اس امر کا اقرار باللسان کہ اللہ واحد ہے اور محمد ﷺ اس کے رسول ہیں: ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' اسے کلمۂ طیبہ بھی کہا جاتا ہے۔ اس کلمے کے ذریعے گویا تمام ایمانیات (توحید' رسالت' الہامی کتب' ملائکہ اور آخرت) پر ایمان کا اقرار کیا جاتا ہے۔

(2) نماز: یہ لفظ قرآن مجید میں نہیں ہے۔ اس کے لئے ''صلوٰۃ'' (جمع صلوات) کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ لغوی معنی دعا و تسبیح' استغفار' رحمت' ثناء' طلب رحم۔ ''صلوٰۃ'' اس مخصوص عبادت کا نام ہے جو ارکانِ اسلام میں سے ہے۔ یہ ہر عاقل و بالغ مسلمان پر فرض ہے۔ توحید کے بعد سب سے پہلا حکم جو آنحضرت ﷺ کو بذریعہ وحی ملا' وہ نماز کا تھا۔ یہ وہ فرض ہے جو آغازِ اسلام سے ادا کیا جاتا رہا اور شب معراج میں اس کی باقاعدہ فرضیت کا حکم ہوا۔ قرآن مجید کی متعدد آیات میں نماز کی تاکید آئی ہے۔ نبی کریم ﷺ سے پوچھا گیا کہ کون سا عمل بہترین اور افضل ہے تو آپؐ نے فرمایا: ''نماز وقتِ مقرر پر ادا کرنا۔'' اس کے علاوہ بھی بہت سی احادیث میں نماز کی اہمیت اور اس کی تاکید کے بیان کو مؤثر طریقے پر بیان کیا گیا ہے۔

نماز دراصل ایک مرکزی عبادت ہے۔ نماز کے اخلاقی' تمدنی اور معاشرتی فوائد بے شمار ہیں۔ بقول سید سلیمان ندوی: ''آنحضرت ﷺ کے ذریعے اخلاق و تمدن و معاشرت کی جتنی اصلاحیں وجود میں آئیں' ان کا بڑا حصہ نماز کی بدولت حاصل ہوا۔ اسی کا اثر ہے کہ اسلام نے ایک بدوی' وحشی اور غیر متمدن ملک کو' جس کو پہننے اور اوڑھنے کا بھی سلیقہ نہ تھا' چند سال میں ادب و تہذیب کے اعلیٰ معیار پر پہنچا دیا۔'' (سیرۃ النبیؐ)

(3) روزہ: رمضان شریف کے روزے بھی اسلام کے ارکانِ خمسہ میں سے ایک رکن ہے۔ سورہ بقرہ کی آیات 183 تا 185 میں واضح حکم آیا ہے: ''مومنو! تم پر روزے فرض کر دیئے گئے جس طرح تم سے پہلے انبیاء کے پیروؤں پر فرض کئے گئے تھے۔ اس سے توقع ہے کہ تم میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوگی۔ چند مقررہ دنوں کے روزے ہیں۔ اگر تم میں سے کوئی بیمار ہو یا سفر میں ہو تو دوسرے دنوں میں اتنی ہی تعداد پوری کر لے' اور جو لوگ روزہ رکھنے کی قدرت رکھتے ہوں (مگر نہ رکھیں) تو وہ فدیہ دیں۔ ایک روزے کا فدیہ ایک مسکین کو کھانا کھلانا ہے اور جو اپنی خوشی سے کچھ زیادہ بھلائی کرے' تو یہ اسی کے لئے بہتر ہے' لیکن اگر تم سمجھو تو تمہارے حق میں اچھا یہی ہے کہ روزہ رکھو۔ رمضان وہ مہینہ ہے جس میں قرآن نازل کیا گیا' جو انسانوں کے لئے سراسر ہدایت اور ایسی واضح تعلیمات پر مشتمل ہے جو راہ راست دکھانے والی اور حق و باطل کا فرق کھول کر رکھ دینے والی ہیں۔ لہٰذا اب سے جو شخص اس مہینے کو پائے' اس کو لازم ہے کہ اس پورے مہینے کے روزے رکھے۔ اور جو کوئی مریض ہو یا سفر پر ہو تو وہ دوسرے دنوں میں روزوں کی تعداد پوری کرے۔ اللہ تمہارے ساتھ نرمی کرنا چاہتا ہے' سختی کرنا نہیں چاہتا۔ اس لئے یہ طریقہ تمہیں بتایا جا رہا ہے تاکہ تم روزوں کی تعداد پوری کر سکو اور جس ہدایت سے اللہ نے تمہیں سرفراز کیا ہے' اس پر اللہ کی کبریائی کا اظہار و اعتراف کرو اور شکرگزار بنو۔''

اسلام کے اکثر احکام کی طرح روزے کی فرضیت بھی بتدریج عائد کی گئی ہے۔ آنحضرت ﷺ نے ابتدا میں مسلمانوں کو ہر مہینے میں صرف تین دن کے روزے رکھنے کی ہدایت فرمائی تھی' مگر یہ روزے فرض نہ تھے۔ دو ہجری میں رمضان کے روزوں کا یہ حکم قرآن میں نازل ہوا' مگر اس میں اتنی رعایت رکھی گئی کہ جو لوگ روزے کو برداشت کرنے کی طاقت رکھتے ہوں اور پھر روزہ نہ رکھیں وہ ہر روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیا کریں۔ بعد میں دوسرا حکم نازل ہوا اور یہ رعایت منسوخ کر دی گئی۔ لیکن مریض' مسافر' حاملہ' دودھ پلانے والی عورت اور ایسے بوڑھوں کے لئے جن میں روزے رکھنے کی طاقت نہ ہو' اس رعایت کو بدستور باقی رہنے دیا گیا' اور انہیں حکم دیا گیا کہ بعد میں جب عذر باقی نہ رہے تو قضا کے اتنے روزے رکھ لیں' جتنے رمضان میں ان سے چھوٹ گئے ہیں۔

(4) زکوٰۃ: زکوٰۃ کا لفظ عام صدقات کے معنی میں ابتدائے اسلام ہی سے رائج ہو گیا تھا۔ زکوٰۃ اسلام کے معاشی نظام کا محور ہے۔ اس کا پورا نظام آہستہ آہستہ فتح مکہ کے بعد قائم ہوا۔ 8 ہجری میں زکوٰۃ کی فرضیت کی تصریح مل جاتی ہے۔ محرم 8 ہجری میں زکوٰۃ کے تمام قوانین و احکام مکمل ہو کر نافذ ہو گئے تھے۔

زکوٰۃ کا ذکر قرآن مجید میں صلوٰۃ (نماز) کے ساتھ بیس مقامات پر آیا ہے۔ کئی مقامات پر اس کا ذکر علیحدہ بھی آیا ہے۔ زکوٰۃ ادا کرنے والے کے لئے اجرِ عظیم کی بشارت ہے اور زکوٰۃ ادا نہ کرنے والوں کے لئے سزا اور عذاب کی وعید ہے۔ ارشاد ربانی ہے ''اور نماز قائم کرنے والے اور زکوٰۃ دینے والے اور اللہ پر اور قیامت پر ایمان رکھنے والے یہی لوگ ہیں جن کو ہم اجرِ عظیم دیں گے۔''

(النساء:162)

❁ ''جو لوگ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے میں بخل کرتے ہیں' وہ یہ نہ سمجھیں کہ بخل ان کے لئے اچھا ہے۔ بخل تو ان کے حق میں برا ہے۔ عنقریب قیامت کے دن ان کا مال ان کے لئے وبالِ جان بن جائے گا۔'' (آل عمران:180)

❁ اور جو لوگ سونا اور چاندی جمع کرتے ہیں اور اسے اللہ کی راہ میں خرچ نہیں کرتے' تو اے نبیؐ! آپ انہیں دردناک عذاب کی بشارت دے دیجئے جس دن کہ سونا اور چاندی دوزخ کی آگ میں گرم کیا جائے گا۔ پھر اس سے ان کی پیشانیاں اور ان کے پہلو اور ان کی پیٹھیں داغی جائیں گی اور ان سے کہا جائے گا کہ یہ وہی سونا چاندی ہے جس کو تم نے جمع کر رکھا تھا۔ سو اب تم اس چیز کا مزا چکھو جو تم جمع کرتے رہے ہو۔'' (التوبہ:35,34)

(5) حج: اسلامی عبادات کا پانچواں رُکن۔ حج کے لئے اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ کو بین الاقوامی اجتماع کا مرکز بنایا۔ جس طرح حضرت ابراہیمؑ اور اسماعیلؑ تین دن کے سفر کے گرد و غبار میں اٹے ہوئے' دوڑے ہوئے' اللہ کے گھر میں آئے تھے' اسی طرح مسلمان خانۂ کعبہ کو دوڑتے ہوئے آتے ہیں اور جس طرح حضرت ابراہیمؑ نے اللہ کی پکار پر لبیک کہا تھا' وہی چار ہزار سال پہلے کا ترانہ دنیا بھر سے آئے ہوئے مسلمانوں کے لبوں پر ہوتا ہے: ''میں حاضر ہوں' اے اللہ میں حاضر ہوں' میں حاضر ہوں' تیرا کوئی شریک نہیں' سب خوبیاں اور سب نعمتیں تیری ہی ہیں اور سلطنت تیری ہی ہے' تیرا کوئی شریک نہیں۔'' اسلامی عقائد و عبادات سے ایک طرف تو تعلق باللہ کا رشتہ مستحکم ہوتا ہے اور دوسری طرف اس سے زندگی سے نباہ کرنے کی خاطر کردار و اخلاق کی تعمیر ہوتی ہے۔ یہی حسن کردار انفرادی و اجتماعی زندگیوں میں امن و سکون کا باعث بنتا ہے۔ اسلام کا نصب العین' تزکیہ نفس' سکونِ قلب' عدل و احسان' صلۂ رحمی اور آخرت میں نجات ہے۔

اسلامی قانون

اسلامی قانون کے سرچشمے بھی الہامی ہیں' لیکن ان کی رُوح انسانی' عقلی' عمرانی اور عملی ہیں۔ اسلامی قانون میں تعزیر ہے' لیکن تعزیر سے پہلے خود اپنی اصلاح اور احتسابِ نفس کے کئی مراحل ہیں۔ اسی بناء پر اسلامی قانون میں تزکیۂ نفس اور توبہ استغفار پر بہت زور دیا گیا ہے۔

اسلامی قانون کے تین بڑے مقاصد ہیں (1) اللہ تعالیٰ کی حاکمیت کا نفاذ قرآن و حدیث کی روشنی میں (2) حقوق اللہ کے ساتھ حقوق العباد کا قیام بذریعہ اولی الامر (3) نفوس کی پاکیزگی اور اعلیٰ معاشرتی زندگی کی خاطر خیر و عدل کی صفات کا تحفظ۔

اسلامی قانون کی تشکیل چار مراحل میں مکمل ہوئی: پہلا آنحضرت ﷺ کی بعثت سے شروع ہو کر آپؐ کے وصال پر ختم ہوتا ہے۔ دوسرا دورِ خلافت راشدہ کے اختتام تک جاری رہا۔ تیسرے دور میں اہلِ سنت کے مسالک

فقہ کی بنیاد پڑی۔ چوتھے دور میں اپنے اپنے ائمہ کے مسالک کی تشریح و توضیح کی۔

اسلامی قانون کی تشکیل میں تین اصول بنیادی طور پر مدنظر ہیں (1) عدم حرج یعنی تنگی کو دور کرنا (2) قلت تکلیف یعنی احکام کی ایسی صورت جس پر بآسانی عمل ہو سکے۔ (3) تدریج۔ رائج رسوم کو بتدریج ختم کرنا اور احکام اسلامیہ کا نافذ کرنا۔

اسلامی قانون کا پہلا اور حقیقی ماخذ قرآن مجید ہے۔ دوسرا ماخذ سنتِ نبویؐ ہے۔ تیسرا ماخذ قیاس اور چوتھا اجماع ہے۔ یہ آخری دو اصول اس لئے ہیں کیونکہ ہر زمانے میں حالات بدلتے رہتے ہیں اور ان تبدیلیوں کے بارے میں شرعی فیصلے کی ضرورت رہتی ہے۔

اسلامی اخلاقیات

اسلام میں دین چونکہ ایک کلی حقیقت اور مجموعی وحدت ہے' اس لئے آداب و اخلاق کی پاسداری بھی عبادت میں شامل ہے۔ اسلام میں یوں تو ہر اچھا عمل عبادت ہے' تاہم امور و افعال میں قانون کا جبر نہیں چلتا' بلکہ ان کا صدور برضا و رغبت ہوتا ہے۔ اگر قلب انسانی روحانی طور پر صحت مند ہے تو خیر اور شر' نیکی اور برائی میں تفریق کا معیار قرار دیا گیا ہے۔ اس سے بجا طور پر یہ سمجھا جا سکتا ہے کہ اخلاق' عادات و اطوار کے ظاہری حُسن کا صدور طبیعت کی عادت ثانیہ کے طور پر ہوتا ہے اور دوسرے افراد بھی اس سے متاثر ہوتے ہیں اور اس طرح اچھے اخلاق سے معاشرے کی عمومی زندگی میں حسن و اعتدال پیدا ہوتا ہے۔ اسلامی نقطۂ نظر سے اخلاق کے مفہوم میں دین' طبیعت اور عادات تینوں شامل ہیں۔

اسلامی اخلاق کے بنیادی ماخذ دو ہیں (1) قرآن مجید' جہاں بندۂ مومن کے اوصاف ہیں ''اخلاق حسنہ'' کو بھی شامل کیا گیا ہے۔ ایک مقام پر ''عبادالرحمان'' (بندگانِ خدا) کے اوصافِ حمیدہ کا ذکر ہے۔ (2) آنحضور ﷺ کا اسوۂ حسنہ قرآن مجید میں سرورِ عالم ﷺ کے لئے جو الفاظ و کلمات استعمال کئے گئے ہیں' ان سے درحقیقت اخلاقِ نبویؐ کی طرف توجہ دلائی گئی ہے اور آپ کی سیرت طیبہ کو اخلاق حسنہ کا ایک مثالی نمونہ بتایا گیا ہے۔ خود آنحضور ﷺ نے اخلاق حسنہ کی تعلیم پر خاص زور دیا ہے۔ ایک موقع پر حضور ﷺ اپنی بعثت کا مقصد حسنِ اخلاق کو کمال تک پہنچانا بیان فرماتے ہیں۔ آپؐ کے نزدیک بہترین انسان وہ ہے' جس کے اخلاق اچھے ہوں۔ ایک حدیث میں اچھے اخلاق کی تکمیل کو ایمان کا معیار قرار دیا گیا ہے' جبکہ ایک اور حدیث میں آپؐ نے اچھے اخلاق کو نماز اور روزے کا درجہ دیا ہے۔

قرآن و حدیث میں بعض اہم اخلاقی خصائل و اوصاف پر زور دیا گیا ہے' ان میں بالخصوص صفتِ عدل کو خاص اہمیت دی گئی ہے' جس کا مفہوم توازن' مساوات' ظلم سے اجتناب اور ہر کسی کو اس کا حق دینا ہے۔ توازن کی یہ صفت کردار میں بھی حُسن اور عظمت پیدا کرتی ہے۔ مصائب اور ناموافق حالات میں صبر اور خوشحالی میں اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنا اعلیٰ اخلاق کا حصہ ہے۔ اس کے علاوہ ایثار' رحم دلی' ہمدردی' صلہ رحمی' وقارِ نفس اور احترام آدمیت وغیرہ بھی اسلامی اخلاق کے نمایاں اصول ہیں۔ ایفائے عہد کو دینی فرائض میں شامل کیا گیا ہے' کیونکہ اسی پر تمام معاشرے کی ساکھ اور انسانی معاملات کی کامل تنظیم موقوف ہے۔ اخلاقیات کے ضمن میں چند احکامِ خداوندی ملاحظہ فرمائیے:

انصاف کا حکم: ''مومنو! اللہ کی خاطر راستی پر قائم رہنے والے اور انصاف کی گواہی دینے والے بنو۔ کسی گروہ کی دشمنی تم کو اس پر آمادہ نہ کردے کہ تم عدل و انصاف سے باز رہو۔ تم ہر حال میں انصاف کرو۔ یہی طریقہ تقویٰ سے قریب تر ہے۔ اللہ سے ڈر کر کام کرتے رہو' کیونکہ وہ تمہارے فعل و عمل سے پوری طرح باخبر ہے (مائدہ:8)

❁ ''مومنو! خدا کا خوف کرتے ہوئے انصاف کے ساتھ گواہی دیا کرو' خواہ وہ گواہی تمہاری اپنی ذات پر یا تمہارے والدین اور تمہاری اقربا کے خلاف ہی جاتی ہو۔ فریق معاملہ خواہ رئیس یا غریب' اللہ تم سے زیادہ ان کا خیر خواہ ہے۔ لہٰذا اپنی خواہش نفس کی پیروی میں عدل سے باز نہ رہو۔ اور اگر تم نے لگی لپٹی بات کہی یا سچائی سے پہلو بچایا تو جان رکھو کہ جو کچھ تم کرتے ہو' اللہ کو اس کی خبر ہے۔'' (النساء:135)

پورا تولو: ''ناپتے وقت پیمانہ بھر دیا کرو اور لوگوں کو نقصان پہنچانے والے نہ بنو۔ تولتے وقت ترازو کی ڈنڈی سیدھی رکھ کر تولا کرو۔ اور لوگوں کو ان کی چیزیں کمی سے نہ دیا کرو اور ملک میں فساد نہ پھیلاتے پھرو۔''

(شعراء:182'183)

عدل و احسان: ''اللہ تم کو عدل و احسان کرنے اور قرابت داروں کو مالی امداد دینے کا حکم دیتا ہے اور بے حیائی کے کاموں' ناشائستہ حرکتوں اور ایک دوسرے پر زیادتی کرنے سے منع کرتا ہے' اور تم لوگوں کو نصیحت کرتا ہے تاکہ تم اس کا خیال رکھو۔ (النحل:90)

امانت میں خیانت نہ کرو: ''اللہ تم کو حکم دیتا ہے کہ امانت رکھنے والوں کی امانتیں جب وہ مانگیں' ان کے حوالے کر دیا کرو اور جب لوگوں کے جھگڑے فیصلہ کرنے بیٹھو تو انصاف سے فیصلہ کیا کرو۔ اللہ تم کو یہ اچھی نصیحت کرتا ہے' اور وہ بلاشبہ سب کی سنتا اور سب کچھ دیکھتا ہے (النساء:58)

شہادت کو مت چھپاؤ: ''اور گواہی کو نہ چھپاؤ۔ جو شہادت کو چھپاتا ہے' وہ دل کا کھوٹا ہے۔'' (بقرہ:283)

اپنے عہد کو پورا کرو: ''مومنو اپنے معاہدوں کو پورا کرو۔'' (مائدہ:1)

صبر کا درجہ: ''اور جو شخص صبر کرے اور دوسرے کی خطا بخش دے تو یہ بے شک بڑی ہمت کے کام ہیں۔'' (شوریٰ:43)

شیخی کی ممانعت: ''یقیناً اللہ شیخی خورے' گھمنڈ کرنے والے کو پسند نہیں کرتا۔ (النساء:36)

غصہ پی جاؤ: ''وہ لوگ اچھے ہیں جو غصہ پی جاتے ہیں اور لوگوں کو معاف کر دیتے ہیں اور اللہ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔'' (آل عمران:134)

عجز و انکسار: ''اور اللہ کے بندے زمین پر فروتنی سے چلتے ہیں' اور جب جاہل ان کو مخاطب کرتے ہیں' وہ سلام کہہ کر گزر جاتے ہیں۔'' (فرقان:63)

نیکی میں تعاون: ''نیکی اور تقویٰ کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار ہو جایا کرو۔ گناہ اور زیادتی کے کاموں میں ایک دوسرے کے مددگار نہ ہو' اور اللہ سے ڈرتے رہا کرو۔'' (مائدہ:2)

اتحاد کا حکم: ''اور سب مل کر اللہ کے دین کی رسی کو مضبوطی سے تھامے رہو' اور آپس میں تفرقہ نہ ڈالو۔'' (آل عمران:103)

یتیموں کا مال: ''جو لوگ ازراہ ظلم یتیموں کا مال خرد برد کرتے ہیں وہ اپنے پیٹ میں انگارے بھرتے ہیں۔'' (النساء:10)

شراب اور جوا: ''اے رسولؐ! لوگ تم سے شراب اور جوئے کے بارے میں سوال کرتے ہیں۔ ان سے کہہ دو کہ ان دونوں چیزوں میں بڑا گناہ ہے' اور لوگوں کے کچھ فائدے بھی ہیں۔ مگر ان کے فائدے سے ان کا گناہ بہت زیادہ ہے۔'' (البقرہ:219)

زنا کی مذمت: ''اور زنا کے پاس بھی نہ پھٹکو' کیونکہ وہ بے حیائی ہے اور بہت برا چلن ہے۔'' (بنی اسرائیل:32)

تکبر کی ممانعت: ''زمین پر اکڑ کر نہ چل' کیونکہ تو زمین کو تو پھاڑ نہ سکے گا اور نہ تن کر چلنے سے پہاڑوں کی لمبائی کو پہنچ سکے گا۔'' (بنی اسرائیل:37)

بدگمانی اور غیبت: ''مومنو زیادہ بدگمانی سے پرہیز کرو' کیونکہ بعض بدگمانیاں گناہ ہیں۔ کسی کی جاسوسی کے درپے نہ رہا کرو' اور نہ ایک دوسرے کے پیچھے غیبت کیا کرو۔'' (الحجرات:12)

خیرات کر کے احسان جتانا: ''مومنو اپنی خیرات کو

احسان جتانے اور سائل کو ایذا پہنچانے سے ضائع نہ کرو۔ وہ شخص جو اپنا مال دکھاوے کے لئے خرچ کرتا ہی اس کا مال اکارت جاتا ہے اور وہ شخص اللہ اور یوم آخرت پر یقین نہیں رکھتا۔" (البقرہ:264)

تقاضا ملتوی کرو: "اور اگر تمہارا کوئی قرض دار تنگی میں ہو تو اسے فراخی تک مہلت دو اور اگر قرض معاف کر دو تو یہ تمہارے حق میں بہت اچھا ہے۔" (البقرہ:280)

عورتوں کے حقوق: "مرد عورتوں کے ذمہ دار اور قوام ہیں اس لئے کہ اللہ نے ان میں سے ایک کو دوسرے پر فضیلت دی ہے اور اس لئے بھی کہ مرد اپنے مال خرچ کرتے ہیں پس جو صالح عورتیں ہیں وہ اطاعت شعار ہوتی ہیں اور مردوں کے پیچھے اللہ کی حفاظت و نگرانی میں ان کے حقوق کی حفاظت کرتی ہیں۔" (النساء:34)

عورتوں کا ورثہ: "مردوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو اور عورتوں کے لئے اس مال میں حصہ ہے جو ماں باپ اور قریبی رشتہ داروں نے چھوڑا ہو خواہ تھوڑا ہو یا بہت اور یہ حصہ اللہ کی طرف سے مقرر ہے۔" (النساء:7)

غرضیکہ سارا قرآن (اور احادیث نبویؐ) اخلاقی تعلیمات سے لبریز ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی گوشہ اور شعبہ ایسا نہیں جس کے متعلق نیکی پرہیزگاری دیانت داری اور رواداری کے احکام اس کتاب میں موجود نہ ہوں۔ اللہ اور اس کی رسول ﷺ کا مقصود یہ تھا کہ بلند کردار انسانوں کا ایک معاشرہ مرتب کیا جائے جو اپنی زندگی کے نمونے اور اپنی تلقین و تبلیغ سے دینِ حق کو دنیا بھر میں پھیلا دے۔ چنانچہ وہ معاشرہ ظہور میں آ گیا اور اس نے مشرق و مغرب کو نور سے بھر دیا۔ تاریکیاں کافور ہو گئیں اور جہاں جہاں مسلمان گئے وہاں ذات پات عدم مساوات معبودانِ باطل فحش کاری عدم دیانت ناشائستگی شراب و قمار اور دوسرے رذائل کا استیصال ہو گیا۔ انسانوں کو اوہام باطلہ اور خداوندانِ باطل سے نجات مل گئی اور اس نے پہلی دفعہ کامل آزادی کی فضا میں سانس لیا۔

اسلامی معاشرت

اسلام میں معاشرت کی بنیاد دو اصولوں پر ہے

(1) تمام انسان حضرت آدمؑ کی اولاد ہیں لہٰذا سب برابر ہیں۔ (2) اس مساوات و اخوت کا قیام و دوام تعلق باللہ پر ہے۔ نسل انسانی کو وحدت کے اس استحکام کے لئے روحانی دعوت خاص اہمیت رکھتی ہے کیونکہ صرف روحانی عقیدے کے ذریعے ہی سے یقینی شیرازہ بندی کی جا سکتی ہے۔ اسلامی معاشرے کی بنیاد مدینہ منورہ میں پڑی جہاں انصار و مہاجرین کو اخوت اسلامی کے ناطے ایک تنظیم کی شکل دی گئی۔ اس طرح جس معاشرے کی تاسیس ہوئی اس کے تین امتیازات ہیں۔ (1) مساوات یعنی رنگ نسل اور ذات پات کو ختم کر کے صرف تقویٰ کو معیارِ فضیلت ٹھہرانا (2) بنیادی انسانی ضرورتوں میں سب کے ساتھ برابری کا سلوک کرنا (3) انسانی حاکمیت کی جگہ اللہ کی حاکمیت (خلافت) قائم کر کے سب کے لئے عدل و انصاف مہیا کرنا۔

اسلام نے ان اصولوں پر مسلم معاشرے کی جو تشکیل کی وہ ہر قسم کی افراط و تفریط سے محفوظ ہے۔ اسلام میں ذات پات اور حسب نسب کی کوئی تمیز نہیں۔ اسلام نے داخلی طور پر جذبۂ اخوت پر بڑا زور دیا ہے تاکہ صالح معاشرے کے قیام و استحکام میں مدد ملے۔ اخوت کی یہ روح معاشرے کے تمام افعال و اعمال میں ظاہر ہے۔ اس سے وہ مساوات پیدا ہوئی جس کی نظیر دنیا میں نہیں ملتی۔ چنانچہ یہ اسی کا اثر تھا کہ حضرت عمر فاروقؓ کی عہد خلافت میں جب ایک شامی رئیس جبلہ بن الایہم عسانی (نومسلم) نے ایک بدو کو طیش میں آ کر تھپڑ مارا تو حضرت عمر فاروقؓ نے اس کی پاداش میں جبلہ کو اسی بدو سے ایک جوابی تھپڑ لگوانے کا فیصلہ کر دیا۔

اسلامی معاشرے کا دوسرا اہم اصول احترامِ آدمیت ہے۔ اسلام نے انسان کی بحیثیت انسان عزت و حرمت تسلیم کرائی ہے۔ چنانچہ جملہ افراد خاندان کو جذباتی اور انسانی بنیادوں پر اہم رتبہ دیا۔ مرد کو جہاد زندگی کا نقیب اور عورت کو اس کا مونس و ساتھی قرار دیا۔

احترامِ آدمیت کا ایک خوشگوار پہلو یہ بھی ہے کہ اسلام نے غلامی کے مسئلے کو کامیابی کے ساتھ حل کیا۔ متعدد مذہبی عبادات اور قانونی احکام میں غلاموں کی آزادی لازمی قرار دی۔ عام معاشرتی زندگی میں انہیں برابر کے حقوق مرحمت فرمائے۔ ان سے اچھا سلوک کرنے کی ترغیب دلائی۔ مواخات کے وقت متعدد غلاموں کو آزاد اور رئیس صحابہ کا بھائی بنایا۔ اسلام کی انہی تعلیمات کا یہ اثر تھا کہ عہد اسلامی میں غلام اہم عہدوں اور بلند مناصب پر فائز کئے جاتے تھے۔ ہندوستان اور مصر میں ممالیک (غلاموں) کی سلطنتیں اس اہم معاشرتی رتبے کی نمایاں مثالیں ہیں۔ اسلام نے غیر مسلموں سے نیک سلوک کرنے کی بھی جو تاکید کی اور ان کی جان و مال کی حفاظت کا ذمہ لیا۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے میں جو علاقے فتح ہوئے (بالخصوص بیت المقدس) ان علاقوں کے رہنے والوں سے جو معاہدے کئے گئے انہیں ان حقوق کی پوری پوری صراحت کی گئی ہے۔

مجموعی طور پر اسلامی معاشرہ تقویٰ اور اصلاح کے دو اصولوں پر استوار ہوتا ہے۔ تقویٰ سے مراد انسان کے باطن کی وہ صفت ہے جس سے فرد کی زندگی میں پاکیزگی اور نیکی پیدا ہوتی ہے اور صالح افراد کے ذریعے زندگی کے تمام انفرادی اور اجتماعی افعال میں حسن و توازن پیدا ہوتا ہے۔

اسلامی معاشیات

دنیا میں معاشی مساوات پیدا کرنے کے لئے جو نقشہ اسلام نے پیش کیا ہے نہ صرف معقول معتدل اور قابل عمل ہے بلکہ حد درجہ متاثر اور نتیجہ خیز بھی ہے۔ اسلام نے مال کو زندگی کی ایک "اہم بنیاد" "خیر" اور "اللہ کا فضل" قرار دے کر اس کے کسب و حصول کو ضروری بلکہ بابرکت ٹھہرایا اور کسب مال کے لئے بددیانتی خودغرضی اور انسان کشی کی صورتوں کو مذموم اور قابل نفرت بیان کر کے ان سے اجتناب کی تاکید کی۔

اسلام نے حصول رزق کے کسی جائز اور حلال ذریعے پر پابندی نہیں لگائی بشرطیکہ اس میں مندرجہ بالا خرابیاں پیدا نہ ہوں۔ عام انسانی ضرورتوں کے لئے قرض حسنہ پر زور دیا اور سود کو حرام قرار دیا۔ سورہ آل عمران؟ میں حکم آیا ہے: "مومنو سود نہ کھاؤ کہ دو گنا چوگنا ہوتا جائے اور اللہ سے ڈرتے رہو تا کہ فلاح پاؤ۔" سورہ بقرہ میں مزید فرمایا: "جو لوگ سود کھاتے ہیں قیامت کے دن کھڑے نہیں ہو سکیں گے مگر اس شخص کی طرح جس کو شیطان نے چھو کر مخبوط الحواس بنا دیا ہو۔ یہ اُن کے اس قول کی سزا ہے کہ تجارت بھی سود ہی کی مانند ہے حالانکہ اللہ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام کیا ہے۔"

قرآن مجید میں مال داروں کے مال میں ناداروں اور غریبوں کا حق مقرر فرما دیا۔ احادیث میں بھی اس مضمون کی تاکید ملتی ہے۔ قرآن مجید میں اس زمرے میں مقروض اور مسافر کو بھی شامل کر دیا تاکہ وہ بھی مالی پریشانیوں سے نجات پا سکیں اور اس مقصد کے لئے زکوٰۃ صدقات اور کفارہ کے مختلف طریقے رائج کئے۔ انفاق فی سبیل اللہ پر زور دیتے ہوئے یہ تصور دیا کہ تمام مال اللہ کا ہے۔ ایک مسلمان تو اس مال کا محض امین ہے۔

قانونِ وراثت کے ذریعے جائیداد کی تقسیم اور زکوٰۃ کے ذریعے ضرورت مندوں کی عام امداد کا اصول نافذ کیا اور اس طرح امیر و غریب میں باہمی فرق اور طبقاتی منافرت کو ختم کیا۔ نظام وراثت کے ذریعے یہ

کوشش بھی کی گئی ہے کہ دولت صرف چند ہاتھوں میں سمٹ کر نہ رہ جائے۔

معاشرے کی غذائی اور معاشی ضرورتوں کی کفالت کے لئے زکوٰۃ و صدقات کے علاوہ بھی کئی طریقے اختیار کئے۔ بقول ابن حزم ''اگر مذکورہ وسائل سے ضرورت مندوں کی امداد نہ کی جاسکتی ہو تو شہر کے رؤسا سے مزید امداد بھی لی جاسکتی ہے۔ اس کے علاوہ اوقات خیریہ (رفاہ عامہ کے کاموں کے لئے اوقات) بھی معاشرے کی اجتماعی اور رفاہی ضرورتوں کو پورا کرنے کا ایک عمدہ ذریعہ ہیں جس کی اسلام میں ترغیب دلائی گئی ہے۔ دمشق میں بیمار اور ناکارہ حیوانات کے لئے ایک وقف چراگاہ کا قیام اور صلاح الدین ایوبی کے دور میں ماؤں کو ان کے بچوں کی غذائی ضرورتوں کے پیش نظر ہفتے میں دو دن دودھ اور چینی کی فراہمی کے طریق کار سے اس مضمون کی تصدیق ہوتی ہے۔

اس سلسلے میں فقر کے تصور کا ذکر بھی لازمی ہے۔ قرآن مجید میں کہا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ غنی ہیں اور باقی سب لوگ فقیر ہیں۔ اس طرح انسان کی فطری ضرورت مندی کے حوالے سے سب کو فقیر کہا گیا۔ خدا کو غنی مان لینے سے دولت پرستی اور سرمایہ پرستی کے مرض کی جڑ کٹ جاتی ہے۔

ذاتی ملکیت اسلام میں جائز ہے بشرطیکہ دولت کو معاشرے کے چند افراد کی ملکیت بن جانے سے روکا جائے۔ نفع عام کی چیزیں افراد کی بجائے جماعت کی ملکیت قرار دیں۔ ملوکیت یا بادشاہت کی بجائے جمہور اور اہل حق کی حکومت قائم کی۔ اسی طرح زمین اور محنت کے سرمائے میں ہمیشہ ایک توازن و اعتدال ملحوظ رکھا۔

اسلامی آداب تبلیغ و اشاعت

ظہور اسلام کے وقت دنیا کی روحانی، اخلاقی اور تمدنی حالت انتہائی پست اور گمراہ کن تھی۔ تمام مذاہب بے روح اور بڑی بڑی تہذیبیں بے جان ہو چکی تھیں۔ اس اثناء میں آفتاب نبوت طلوع ہوا جس سے تمام کرۂ ارض حقیقی معنی میں روشن و منور ہو گیا۔

رسالت کا بنیادی فرض پیغام الٰہی لوگوں تک پہنچانا تھا۔ چنانچہ آنحضورؐ نے اپنی حیات طیبہ میں یہ فرض انتہائی خوش اسلوبی سے انجام دیا۔ یہ اسی کا تاثر تھا کہ جب آپؐ کے وصال کا وقت آیا تو پورا جزیرۂ عرب مشرف بہ اسلام ہو چکا تھا۔ پھر چونکہ اسلام کسی مخصوص قوم کے لئے نہیں بلکہ پوری دنیا کے لئے پیغام ہدایت ہے اسی بنا پر آپؐ کے وصال کے بعد اشاعت اسلام اور دعوت حق کی کوششیں نہایت مستعدی اور جوش و جذبے سے جاری رہیں یہ اسی کا اثر تھا کہ ایک نہایت قلیل عرصے میں دنیا کے ایک بڑے حصے میں اسلام بڑی تیزی کے ساتھ پھیلا۔ اسلام کی اس حیرت انگیز کامیابی کا راز تبلیغ نبویؐ کے حسب ذیل اصول میں پر مضمر ہے:

(1) قول لین: یعنی نرم اور مشفقانہ گفتگو۔ سورہ النحل میں ہے: ''اپنے رب کے راستے کی طرف دانائی سے اور اچھی نصیحت سے دعوت دے اور ان سے بحث بھی کر لیکن نہایت اچھے طریق پر۔''

(2) تیسیر و تبشیر یعنی آسانی پیدا کرنے اور خوش آئند بات چیت

(3) تدریج: غیر قوم کو دعوت دیتے وقت تمام احکام کا بوجھ آہستہ آہستہ ڈالنا۔

(4) تالیف قلب: غیر مسلموں اور متذبذب افراد سے لطف و محبت سے پیش آنا اور ان کی امداد و اعانت کرنا۔

(5) عقلی طریق دعوت۔ اسلام کو پیش کرتے وقت عقل و غور و فکر کو دعوت دینا۔

(6) زبردستی اور سختی سے اجتناب۔ مذہب کے معاملے میں جبر و اکراہ سے پرہیز کرنا۔ سورہ بقرہ کی آیات 256 میں حکم ہے: ''دین میں کوئی جبر اور زبردستی نہیں۔ نیکی اور سرکشی کے راستے جدا جدا واضح ہو چکے ہیں۔'' اسی سورت میں مزید ارشاد فرمایا: ''اللہ فساد کو پسند نہیں کرتا۔''

(7) مبلغوں کی تعلیم و تربیت۔ انہیں تبلیغ کے طریقے پڑھانا اور سکھانا اور مختلف ضروری امور کی ترغیب دینا۔

دنیا کے علمی و دینی فکر اور انسانی تہذیب پر اسلام کے عقائد بالخصوص توحید، اخوت و مساوات اور دین فطرت نے خاص اثر ڈالا۔ مارٹن لوتھر کی تحریک اصلاح عیسائیت اور طامس اکویناس کے مسیحی افکار پر اسلام کا اثر تسلیم شدہ ہے۔ اسلام کے عقیدہ اخوت نے یورپ، ایران، ہندوستان، جاوا، سماٹرا، انڈونیشیا اور چین تک کے لوگوں کو متاثر کیا۔ ہندوستان میں جتنی اصلاحی تحریکیں (بھگتی تحریک یا گورونانک سکھ تحریک) اسلام کے زیر اثر پیدا ہوئیں۔ علاوہ ازیں اسلام نے جدید دنیا اخلاق، تہذیب و تمدن، سائنسی علوم اور فنون لطیفہ پر بھی اثر ڈالا۔ اسلامی تہذیب و تمدن کی روح شروع ہی سے آفاقی، عالمگیر اور بین الاقوامی ہے۔ اس سے پوری انسانیت متاثر ہوئی ہے اور اس کے اثرات مشرق و مغرب میں ہر جگہ نمایاں ہیں، لہٰذا یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ پوری دنیا نے اسلام کے جو اثرات قبول کئے ان کا تعلق صرف ماضی سے نہیں بلکہ مستقبل میں بھی اس سے ویسے ہی اثرات مرتب ہوتے رہیں گے۔

اسلامی ریاست

اسلامی ریاست کا تصور دو اصولوں پر قائم ہے۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کریم ﷺ اور اولی الامر کی اطاعت جبکہ دوسرا اصول شورائیت ہے۔ گویا اصل حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے جس کی نیابت میں خلفا رسول کریم ﷺ کے احکام کے مطابق مملکت کا نظم و نسق چلاتے ہیں۔ ان معنوں میں اسلامی ریاست ہر حال میں ایک دینی ریاست ہے لیکن یہ دینی ریاست مذہبی پیشوائیت (Theocracy) سے مختلف ہے جس میں نیک و بد کا معیار پیشواؤں کے اقوال ہوتے ہیں۔

سنی نقطۂ نظر کے مطابق اسلامی ریاست کا سربراہ مشاورت کے کسی طریقے سے منتخب کیا جاتا ہے جسے خلیفہ یا امیر المومنین کہا جاتا ہے۔ یہ انتخاب مدت العمر کے لئے ہوتا ہے اور معقول وجہ کے بغیر اسے معزول نہیں کیا جاسکتا جبکہ شیعہ امامت کے قائل ہیں۔ ان کے نزدیک امام اہل بیت میں سے ہوتا ہے اور وہ معصوم ہوتا ہے۔

قرآن مجید میں جابجا اسلامی ریاست کے رہنما اصول بیان کئے گئے ہیں جن پر اسلام پوری زندگی اُستوار کرنا چاہتا ہے۔ اس سلسلے میں احادیث نبویؐ خلفائے راشدین کے فیصلوں اور خطبات و ہدایات سے ان اصولوں کا پتا چلتا ہے جو ابتدائی اسلام میں مدنظر تھے۔ اس میں سے ایک اہم امر یہ تھا کہ خلیفۃ المسلمین عام حقوق میں سب کے برابر تھا۔ چنانچہ حضرت عمر فاروقؓ لوگوں سے کہا کرتے تھے کہ اگر وہ لوگوں کے حقوق کے بارے میں تساہل سے کام لیں تو اس بارے میں ان سے مواخذہ کیا جائے۔ یہ اسی کا اثر تھا کہ لوگ سرعام حضرت عمر فاروقؓ سے مختلف معاملات کے سلسلے میں باز پرس کرتے اور وہ ان تمام اعتراضات کا جواب دیتے تھے۔ نیز حج کے موقع پر وہ عمال حکومت کے خلاف لوگوں کی شکایات سنتے تھے۔

ائمہ کے حقوق پر دست درازی کرنے والا کسی قسم کی رعایت کا مستحق نہ سمجھا جاتا تھا۔ چنانچہ حضرت علیؓ کو اپنے ایک عہدے دار کے بارے میں جو ان کا قریبی رشتہ دار تھا یہ اطلاع ملی کہ وہ بیت المال میں خیانت کا مرتکب ہوا ہے تو اسے ایک سخت تہدیدی خط لکھا اور تمام مال واپس کرنے کا حکم دیا۔

اسلامی ریاست میں دیگر مذاہب کے لوگوں کو عبادت کی پوری آزادی اور شہریت کے تمام حقوق

حاصل ہیں۔ اس کا نتیجہ عملی طور پر اس معاہدے میں نظر آتا ہے جو حضرت عمرؓ نے بیت المقدس کے عیسائیوں کے ساتھ کیا۔

مملکت کے امور میں دفاع کے مسئلے کو بھی مرکزی اہمیت حاصل ہے۔ اسلام نے جو قوانین صلح و جنگ پیش کئے ہیں' اُن کا مقصد آزادی' انصاف اور امن و سلامتی کی حفاظت ہے اور جنگ کو آخری چارہ کار قرار دیا گیا ہے۔ جہاد و قتال کے حدود متعین کر دیئے اور بتا دیا کہ مسلمانوں کے لئے جارحانہ جنگ ناجائز ہے۔ مدافعانہ جنگ ہی کو جہاد کہنا چاہئے۔ سورہ بقرہ کی آیت 190 میں حکم ہے: ''مسلمانو! جو لوگ تم سے لڑیں' تم بھی فی سبیل اللہ ان سے لڑو اور زیادتی نہ کرو۔ اللہ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا۔''

ذمیوں کی حفاظت کا انتظام مسلمانوں نے نہایت عمدگی کے ساتھ کیا ہے اور ان سے تمام شہری سہولتوں کے عوض ایک نہایت قلیل رقم بصورت جزیہ وصول کی۔ اگر ذمیوں سے فوجی خدمات لی گئیں تو انہیں جزیہ سے مستثنیٰ کیا گیا۔ جنگ یرموک میں جب مسلمانوں کو حمص سے پیچھے ہٹنا پڑا تو وہاں کے باشندوں کو جزیئے کی رقم واپس کر دی گئی۔ پھر عورتیں' بچے' پادری' غلام' نادار' بے کس اور معذور افراد جزیئے سے مستثنیٰ تھے بلکہ بعض صورتوں میں بیت المال سے ان کی کفالت کی جاتی تھی۔ اسلامی ریاست میں ذمیوں کو پوری آزادی اور حقوق شہریت حاصل تھے۔ چنانچہ مدینہ منورہ کی ایک عدالت میں جب حضرت علیؓ اور ایک ذمی کا مقدمہ پیش ہوا۔ تو عدالت نے ذمی کے حق میں فیصلہ دے دیا' جسے دیکھتے ہوئے ذمی نے اسلام قبول کر لیا۔

خلافت: نظریۂ پاکستان (اسلام) کا بنیادی ماخذ خلافت' بلکہ خلافت راشدہ ہے' جس کی ابتدا 622ء میں میثاق مدینہ کی صورت میں ہوئی اور جس کی تکمیل 662ء میں حضرت علیؓ کی شہادت تک ہو گئی۔ یہ صرف چالیس برس کا عرصہ ہے' جس کے دوران تقویٰ' مشورہ اور عدل کے اصول نافذ ہوئے جن پر پوری طرح عمل ہوا۔ ان تین بنیادی اصولوں کی رہنمائی کے لئے قرآن اور سیرت نبویؐ ہمہ وقت موجود رہے۔ جن معاملات میں قرآن و سنت دونوں رہنما خاموش تھے' وہاں اجماع امت کا اصول اپنایا اور چونکہ اجماع میں غلطی کا احتمال ہو سکتا تھا' اس لئے خلیفۂ وقت کا قیاس (Prerogative) استعمال ہوا جو قرآن و سنت کی روح کے مطابق فیصلہ دیتا تھا۔

تقویٰ ایک ایسا اصول تھا جس کا معیار کم بھی ہو سکتا تھا اور زیادہ بھی ہو سکتا تھا۔ اس کے فیصلے کے لئے انتخاب کا اصول اپنایا گیا۔

مشورہ ہر حالت میں لازمی قرار دیا گیا۔

عدل میں ہر قسم کی مصلحت کو مکمل طور پر خارج کر دیا گیا۔ علاوہ ازیں بیت المال کا تقدس ہر حالت میں قائم رہا۔ انتظامی امور میں سادگی اور نرمی کو ملحوظ رکھا گیا اور عسکری امور و معاملات میں خوف خدا کو مال غنیمت پر ترجیح دی گئی' جبکہ جہاد کو ہمیشہ مرکزی حیثیت حاصل رہی۔

خلافت کے یہ اصول خلافت راشدہ کے چالیس برس کے مختصر عرصے میں تکمیل کے تمام مراحل طے کرنے کے بعد قیامت تک' تمام انسانیت کے لئے بالعموم اور مسلمانان عالم کے لئے بالخصوص روشنی کا مینار اور ایک حسین خواب بن گئے۔

اسلام کے بارے میں جامعہ ملیہ دہلی کے پروفیسر محمد مجیب نے اپنی کتاب ''دنیا کی کہانی'' میں کیا خوب کہا ہے: ''اسلام ایک طویل سلسلے کی آخری کڑی ہے۔ وہ اپنے آپ کو اتنا ہی پرانا بتاتا ہے جتنا کہ انسان۔ اور اس کی انسانیت اتنی ہی تازہ جتنی کہ آج کی اُمنگیں۔ اسلام اپنا رشتہ ہر قوم اور ہر قوم کے دینی رہنماؤں سے جوڑتا ہے۔ انسان کی فطرت اور اس کی عقل اسلام کی زمین ہے۔ انسان کا دل اور اُس کے حوصلے اسلام کا آسمان ہیں۔ اسلام کی نظر کسی ایک مخصوص زمانے اور کسی ایک حالت پر نہیں ہے' بلکہ پیچھے اور آگے کے ہر زمانے اور ہر حالت پر ہے۔ وہ ایک ایک آدمی کا الگ الگ مذہب نہیں' قوموں اور سماجوں کا مذہب ہے' اور الگ الگ قوموں اور سماجوں ہی کا نہیں بلکہ پوری انسانیت کا مذہب ہے۔''

خطبۂ حجۃ الوداع: اسلام کے ذکر میں اہم ترین مثال آنحضور ﷺ کا خطبہ حجۃ الوداع ہے۔ یہ خطبہ نہ صرف دین اسلام کی تکمیل کا انتہائی نکتہ ہے اور نہ صرف مسلمانوں کے عقائد' ایمانیات' عبادات' اخلاقیات' معاشرت' معیشت وغیرہ کے لئے ایک عظیم منشور ہے' بلکہ پوری انسانیت کی آزادی' اخوت اور مشاورت کے لئے ایک ایسی گائیڈ ہے جس میں مہد سے لے کر لحد تک اس کی تمام زندگی کا احاطہ کر دیا گیا ہے۔ یہ ساتویں صدی عیسوی کے اوائل کی بات ہے جب دنیا کے کسی بھی متمدن معاشرے میں لوگوں کے کان ان الفاظ سے آشنا تک نہ تھے۔ اس خطبے میں پہلی بار ایک عام انسان کو خواہ وہ کہیں بھی رہتا تھا اور معاشرے کے کسی بھی طبقے سے تعلق رکھتا تھا اور کسی بھی مذہب کا پیروکار تھا' اشرف المخلوقات کا درجہ ملا۔ ایک عام عورت کے حقوق کا پہلی بار ذکر ہوا۔ یتیم' مسکین اور نادار لوگوں پر ترس اور رحم کرنے کی بجائے انہیں بیت المال میں سے ان کا حق دینے کا حکم دیا گیا۔ غلاموں کا پہلی مرتبہ مساوات کا درجہ عطا ہوا۔ قانون وراثت کا کھلے الفاظ میں اعلان کیا گیا' ایک ''ٹکٹے حبشی'' تک کو اگر اُس میں صلاحیت ہو اور امت مسلمہ اس پر متفق ہو' امارت کے عہدے تک پہنچنے کی اجازت مل گئی۔ پیغمبر آخر الزماں کا یہ خطبہ بلاشبہ قرآن و سنت کی روح کا خلاصہ ہے۔

فتح مکہ کے دوسرے برس آنحضور ﷺ اپنا پہلا اور آخری حج ادا کرنے کے لئے یثرب سے مکہ آئے۔ اس وقت آپؐ کے ساتھ ڈیڑھ لاکھ مسلمان تھے' جنہوں نے احرام باندھے ہوئے تھے اور ان کے پاس کوئی ہتھیار نہ تھا۔ مقام عرفات میں جبل الرحمت پر کھڑے ہو کر آپؐ نے فرمایا:

''آج جاہلیت کے تمام دستور میرے قدموں تلے ہیں
لوگو! بے شک تمہارا رب ایک ہے
تمہارا باپ آدم ایک ہی تھا
عربی کو عجمی پر اور عجمی کو عربی پر
سرخ کو سیاہ پر' اور سیاہ کو سرخ پر کوئی فضیلت نہیں
فضیلت صرف تقویٰ کی بنیاد پر ہے
اللہ تعالیٰ نے تم سے جاہلیت کی جہالت
اور آباواجداد پر فخر کو مٹا دیا ہے
تم سب آدم کی اولاد ہو
اور آدم مٹی سے بنے تھے
خدا سے ڈرنے والا انسان مومن ہوتا ہے
اور اس کا نافرمان شقی اور ظالم ہوتا ہے
اسلام کے رشتے نے
مختلف رنگ و نسل کے انسانوں کو
بھائی بھائی بنا دیا ہے
ہر مسلمان دوسرے مسلمان کا بھائی ہے
اور سب مسلمان آپس میں بھائی بھائی ہیں

تمہارے غلام! تمہارے غلام!
جو خود کھاؤ' وہی ان کو کھلاؤ
جو خود پہنو' وہی ان کو پہناؤ

جاہلیت کے تمام خون معاف
اور اُن کے انتقام باطل کر دیئے گئے ہیں
سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے
عامر بن ربیع ابن حارث کا خون معاف کرتا ہوں

جاہلیت کے تمام سُود باطل کر دیئے گئے
اور سب سے پہلے میں اپنے چچا
عباس بن عبدالمطلب کا سود باطل کرتا ہوں

عورتوں کے بارے میں خدا سے ڈرو
تمہارا عورتوں پر
اور عورتوں کا تمہارے اوپر حق ہے

کسی انسان کا بلاوجہ خون بہانا
اور کسی انسان کا مال غصب کرنا
تا قیامت حرام قرار دیا گیا ہے

میں تمہارے پاس ایک چیز چھوڑتا ہوں
اگر تم نے اسے مضبوطی سے پکڑ لیا
تو کبھی گمراہ نہ ہو گے
اور وہ ہے "کتاب اللہ"

اللہ نے ہر حق دار کے لئے از رُوئے وراثت
اس کا حق مقرر کر دیا ہے
اب کسی وراثت کے لئے وصیت جائز نہیں ہے
لڑکا اسی کا ہے جس کے بستر پر پیدا ہُوا

زنا کار کے لئے سنگساری ہے اور
اس کا حساب خدا کے ذمے ہے

جو شخص اپنے باپ کے علاوہ کسی اور کے نسب کا دعویٰ
کرے
اور جو غلام اپنے آقا کے علاوہ کسی اور کی طرف اپنی
نسبت کرے
اُس پر خدا کی لعنت ہے

عورت کو اپنے شوہر کے مال میں سے
اس کی اجازت کے بغیر کچھ لینا جائز نہیں

قرض ہر صورت میں ادا کیا جائے
عاریت واپس کی جائے
عطیہ لوٹایا جائے
اور ضامن تاوان کا ذمہ دار ہے

مذہب میں غلو اور مبالغے سے بچو
کیونکہ تم سے پہلے کی قومیں اسی بنا پر برباد ہوئیں

میرے بعد گمراہ نہ ہو جانا
کہ ایک دوسرے کی گردن مارنے لگو
تمہیں اللہ کے آگے حاضر ہونا پڑے گا
اور وہ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس کرے گا

مُجرم اپنے جرم کا خود ذمہ دار ہے
باپ کے جرم کا بیٹا ذمہ دار نہیں
اور بیٹے کے جرم کا ذمہ دار باپ نہیں

اگر کوئی نکٹا حبشی بھی تمہارا امیر ہو
اور وہ تمہیں اللہ کی کتاب کی طرف لے چلے
تو اس کی اطاعت و فرمانبرداری کرو۔"

اور جب اگلے برس سقیفہ بن ساعدہ کے سائبان کے اجتماع میں جب بھاری اکثریت سے خلیفہ اوّل کا انتخاب ہو چکا تو حضرت ابوبکر صدیقؓ نے جو اپنا پہلا خطبہ دیا' وہ آنحضور ﷺ کے خطبہ حجۃ الوداع کی پرچھائیں معلوم ہوتا تھا۔ حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا: "لوگو! میں تم پر حاکم بنایا گیا ہوں' حالانکہ میں تمہاری جماعت میں سب سے بہتر نہیں ہوں۔ اگر میں اچھا کام کروں' تو میری اطاعت کرنا۔ اگر کج روی اختیار کروں تو مجھے سیدھا کر دینا۔ سچائی امانت ہے اور جھوٹ خیانت۔ تمہارا کمزور میرے لئے طاقتور ہے' یہاں تک کہ میں دوسروں سے اُس کا حق اُسے نہ دلوا دوں اور تمہارا طاقتور میرے لئے کمزور ہے' یہاں تک کہ میں دوسروں کا حق اُس سے حاصل نہ کر لوں۔ جو قوم جہاد فی سبیل اللہ چھوڑ دیتی ہے' خدا اسے ذلیل و خوار کر دیتا ہے۔ جس قوم میں بدکاری و بے حیائی پھیل جاتی ہے' خدا اسے عام مصیبت میں مبتلا کر دیتا ہے۔ اگر میں خدا اور رسول ﷺ کی اطاعت کروں تو میری اطاعت کرنا' اگر اس کی نافرمانی کروں تو تم پر میری اطاعت لازم نہیں۔"

اس باب میں نظریۂ پاکستان (اسلام) کے عقائد' الہیات' ایمانیات' عبادات' معاشرت و معیشت اور نظامِ خلافت وغیرہ پر جو کسی قدر تفصیلی تذکرہ کیا گیا ہے تو اِس کی وجہ یہ ہے کہ اسے ہندوستان میں آ کر ویسے ہی مخالفانہ مذہبی و معاشرتی و تمدنی حالات سے سابقہ پڑا تھا' جیسے ظہورِ اسلام کا وقت عرب میں رائج تھے۔ ہندوستان میں بھی ویسے ہی زمانۂ جاہلیت کا دور دورہ تھا' ویسی ہی ظلمت و تاریکی' ویسا ہی کفر و شرک والا مذہب۔ ہندوستان میں اسلام کی آمد کے وقت کے حالات آپ نے اکثر درسی کتابوں میں ملاحظہ کر رکھے ہیں۔ آئندہ باب میں ان حالات کے اعادے کی بجائے چند مشہور مورخین اور دانشوروں کے چشم دید احوال اور چشم کشا بیانات کا خلاصہ پیش کیا جا رہا ہے۔

3

نظریۂ پاکستان کے برعکس نظریات

نظریہ پاکستان (اسلام) کا برعکس نظریہ باطل پرست' مظاہر پرست' بت پرست ہی ہو سکتا ہے۔ جب ہندوستان میں اسلام کا ورود ہوا تو یہاں ہندو مت اور بدھ مت میں ایک دوسرے پر غلبہ اور تسلط پانے کی جنگ جاری تھی۔ اس باب میں اس وقت کے ہندوستانی مذہب و تہذیب کے حالات پر روشنی ڈالی جائے گی' تا کہ یہ اندازہ ہو سکے کہ دینِ اسلام کو اور اس دین کے علم برداروں کو یہاں کے اصلی باشندوں کے ساتھ نبھانے میں کیا کیا مشکلات اور مصائب برداشت کرنے پڑے ہوں گے۔

آریہ ورت

"آریہ" سے مراد کاشت کاروں کی وہ قوم ہے جو حضرت عیسیٰؑ سے اڑھائی ہزار سال پہلے وسط ایشیا کی چراگاہوں سے نکلی اور یورپ' ایشیائے کوچک' ایران اور ہندوستان میں وارد ہوئی۔ ان کی دو بڑی شاخیں تھیں۔ ایک نے یورپ کا رخ کیا اور دوسری ایران کی طرف آئی۔ یورپ کی طرف جانے والے آریہ قبائل کو ہند یورپی اور ایران کی طرف آنے والوں کو ہند آریہ کہا گیا۔

آریہ کی جو شاخ ایران میں آ کر آباد ہوئی' وہ تاریخ میں ''میڈی'' کہلاتے ہیں۔ ان کے جانشینوں نے مشہور ہخامنشی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو سائرس اعظم کی تخت نشینی (559 ق م) سے لے کر سکندر مقدونی (331 ق م) کی لائی ہوئی تباہی تک قائم رہی۔ ان آریوں میں سے کچھ کی اولادیں جو پارسی کہلاتی ہیں' آٹھویں صدی عیسوی میں جنوب مغربی ہندوستان میں آ کر آباد ہو گئیں۔ ایران میں اچھی طرح اپنا تسلط جمانے کے بعد ان لوگوں نے افغانستان کی طرف رخ کیا اور تقریباً 2500 ق م میں کابل کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے۔

بعض تاریخی شواہد سے پتا چلتا ہے کہ ارضِ پاکستان میں داخل ہونے والے آریہ آبادکار حضرت نوحؑ کے طوفان کے بعد یہاں پہنچے تھے۔ تاہم آریہ کوہ ہمالیہ اور کوہ ہندوکش کے درے عبور کر کے پنجاب کی سرزمین میں داخل ہوئے۔ دریائے سندھ کی تیز رفتاری کو دیکھ کر انہوں نے اسے سندھو کا نام دیا۔ یہاں پر پہلے سے آباد دراوڑ قوم کو مار بھگایا اور پانچ دریاؤں کے آس پاس کے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ مفتوحہ علاقوں کو ''آریہ ورت'' کہا جانے لگا۔

ہندو کی پیدائش

صدیوں تک آریائی تہذیب کو پنجاب میں خوب فروغ ہوا۔ اس حد تک کہ وہ وقت بھی آ گیا جب انہیں مزید وسعت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پنجاب ان کے عزائم اور ضرورتوں کے لئے چھوٹا پڑ گیا۔ پنجاب میں آبادی بڑھ جانے کی وجہ سے یہ ضروری ہو گیا کہ مشرق کی سمت آگے بڑھ کر نئے مقامات تلاش کئے جائیں۔ چنانچہ وہ وادیٔ گنگا (وسطی ہند) کی طرف نقل مکانی کرنے لگے اور جلد ہی انہوں نے گنگا اور جمنا کے درمیانی دوآبے پر قبضہ جما لیا۔ لیکن جب انہوں نے مزید آگے بڑھنے کے لئے بہار کی طرف پیش قدمی کی تو ان علاقوں کے پرانے' اصلی باشندوں نے سخت مزاحمت کی اور ہر ممکن طریقے سے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ وہ لوگ بہت مہذب تھے اور فصیل دار شہروں میں امن و امان سے رہتے تھے' لیکن ہند آریائی' شمال کی سرد آب و ہوا سے آئے تھے' اس لئے زیادہ جفاکش اور طاقتور تھے' اس لئے انہوں نے طویل لڑائیوں کے بعد یہاں (یوپی بہار) کے اصلی باشندوں کو شکست دے دی۔ وہ ان پرانے باشندوں کو جنگلی' وحشی' سیاہ فام اور چپٹی ناک والے کہتے تھے۔ اس کے باوجود جب آریوں نے یہاں مستقل سکونت اختیار کر لی تو انہوں نے مقامی آبادی سے میل جول شروع کر دیا۔ آپس میں شادیاں ہونے لگیں۔ کاروبار اور مذہبی رسوم میں باہم شرکت ہونے لگی' اور یوں صدیوں کے باہمی اختلاط سے ایک ایسی نئی قوم وجود میں آئی جس میں آریائی اور غیر آریائی تہذیبوں کا امتزاج تھا۔ اس نئی قوم کو آج تک ''ہندو'' کہا جاتا ہے۔

ویدوں کا زمانہ

آریہ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ وہ تجربہ کار بزرگوں کے اقوال و اشعار حفظ کر لیتے تھے جو سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتے رہتے تھے۔ امتدادِ زمانہ سے اقوال و اشعار میں بھی اضافہ ہوتا رہتا تھا۔ جب آریوں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا تو قدماء اور عقلاء کے وہ تمام اقوال و اشعار جو انہیں حفظ تھے' ضبطِ تحریر میں لے آئے۔ اس طرح وید' ویدی ادب اور ویدی فلسفہ وجود میں آئے۔ مسلمانوں کے نزدیک جو تقدس قرآن حکیم کو اور عیسائیوں کے نزدیک بائبل کو حاصل ہے' وہی تقدیس و تحریم ہندوؤں کے نزدیک ویدوں کو حاصل ہے جو تعداد میں چار ہیں۔ رگ وید' سام وید' یجر وید' اتھر وید۔ رگ وید کی تکمیل اس وقت ہو گئی تھی جب آریہ پنجاب میں مستقل آباد ہو کر کھیتی باڑی کرنے لگے تھے۔ باقی تین ویدوں کی تالیف اس وقت ہوئی جب آریہ تہذیب وادیٔ گنگا و جمنا میں برگ و بار لانے لگی۔

ویدوں کی تحریری زبان سنسکرت تھی۔ وید کسی بھی ہند آریائی زبان میں قدیم ترین اور اولین ادبی نوشتے کی حیثیت رکھتے ہیں۔ یہ اقوال و اشعار جو دیوی دیوتاؤں کے حضور حمد و ثنا کی صورت میں ہیں' قربانی کے وقت پڑھے جاتے تھے اور ان کا حق ملکیت صرف ان خاص رشیوں اور ان کے خاندانوں تک محدود تھا جنہوں نے ان کو بالکل ابتدا میں حفظ کیا تھا۔ یہ اس وقت کی بات ہے جب ابھی فنِ تحریر وجود میں نہ آیا تھا اور آج بھی اگر ویدوں کے مطبوعہ نسخے کسی وجہ سے ضائع ہو جائیں تو ایسے رشی اور پنڈت سینکڑوں کی تعداد میں موجود ہیں جو ویدوں کو لفظ بہ لفظ پوری صحت کے ساتھ پڑھ کر بلکہ لکھ کر دکھا سکتے ہیں۔

مذہب

ویدوں کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ آریہ ابتدا میں مصریوں' یونانیوں اور رومیوں کی طرح مظاہرِ قدرت کی پوجا کرتے تھے' لیکن جن مظاہر یا چیزوں سے انہیں فائدہ پہنچتا تھا یا نقصان کا احتمال ہوتا تھا' ان کی پوجا شروع کر دیتے تھے' لیکن جوں جوں ان کی تہذیب ترقی کے مراحل طے کرتی گئی' خداؤں اور دیوتاؤں کی تعداد میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا اور یہ تعداد پھر 88 کروڑ تک پہنچ گئی۔ چاروں ویدوں میں کسی دیوی کا ذکر نہیں ہے' لیکن ویدی زمانے کے بعد متعدد دیویوں اور دیوتاؤں کی خوشنودی کے لئے قربانیوں اور پوجا پاٹ کا لامتناہی سلسلہ شروع ہو گیا' جس پر عمل کرنا دشوار ہو گیا۔ اس صورتِ حال کے پیشِ نظر ایک ایسے طبقے کی ضرورت محسوس کی گئی جو عام معاشرے کے مفاد کی خاطر ان لاتعداد دیوی دیوتاؤں کی خوشنودی کا اہتمام کرتا رہے اور باقی لوگ کاروبارِ حیات میں مصروف ہیں۔ چنانچہ اس طرح ایک بڑی اونچی' اتم جاتی وجود میں آئی جسے برہمن کہا جاتا ہے۔

ذات پات کی تقسیم

''برہمن'' کے وجود میں آنے سے وہ آریہ جو کھلے میدانوں میں سورج اور روشنی کی عبادت کرتے تھے' مندروں کی تعمیر میں مصروف ہو گئے۔ ہزاروں دیوی دیوتاؤں کے لئے ہزاروں اقسام کے مندر تعمیر کئے گئے' جن پر ''برہمن'' کی آقائی اور مولائی مسلط ہو گئی۔ معاشرت اور مذہبیت کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد اونچی اور نیچ ذاتیں مختص کی گئیں۔ یہ تخصیص برہمنوں نے ایما پر کی گئی۔ نیچ ذاتوں کا کام صرف اونچی ذات والوں کی سیوا تھا۔ انسانی تاریخ نے اپنے کسی دور میں بھی اتنے ذلیل فلسفہ عمل کو نہیں اپنایا جو ہندو مذہب کا مستقل اور بنیادی جز ہے۔ اونچ نیچ کا تصور کسی انتظامی بنیاد پر قائم نہیں تھا' بلکہ برہمنوں نے اس کی دوامی بنیادیں وضع کرنے کے لئے ایک فلسفے کی تخلیق کی جو آواگون یا تناسخ کہلاتا ہے۔

آواگون یا تناسخ

انسان کے مرنے کے بعد روح کا کیا حشر ہوتا ہے؟ اس کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں:

1) جسم کے ساتھ روح بھی ہمیشہ کے لئے فنا ہو جائے (یہ خیال مادہ پرستوں کا ہے)
2) اسے اپنے اعمال کے مطابق ہمیشہ کے لئے جنت یا دوزخ میں رہنا پڑے (یہ خیال اہل کتاب یعنی یہودیوں' عیسائیوں اور مسلمانوں کا ہے)
3) اسے اپنے اعمال کے مطابق قالب بدلنے پڑیں' تاوقتیکہ وہ اپنی اصلی حالت میں آ کر خدا سے مل جائے۔ یہ خیال ہندوؤں کا ہے۔ اسی کو ''آواگون'' کہتے ہیں۔ اس فلسفے کی رُو سے انسانوں کی روح مختلف اشکال اور اجسام میں دنیا میں آتی رہتی ہے۔ وہ لوگ جنہوں نے کسی پچھلے جنم میں برے اعمال کا ارتکاب کیا تھا' دنیا میں اپنے کئے کی سزا پانے کے لئے نیچ ذات میں پیدا کر دیئے گئے' تاکہ وہ اونچی ذات والوں کی مخلصانہ خدمت سے اپنی سابقہ بداعمالیوں کا پرائیچت (کفارہ) ادا کر سکیں اور آئندہ جنم میں انہیں کسی اونچی ذات کے انسان یا جانور کی شکل میں پیدا ہونے کا موقع ملے اور ان کی مکتی (نجات) کی صورت پیدا ہو۔

بے چارشودر اِس جنم اور اُس جنم کی اصطلاحوں کے چکر میں پھنسے ہوئے تھے۔ برہمنوں نے مزید تحفظ کے لئے یہ انتظام کیا کہ برہمنوں اور راجاؤں کے سوا ہر شخص کے لئے سنسکرت پڑھنا' لکھنا' سننا اور سمجھنا ممنوع قرار دے دیا۔ وید سنسکرت زبان میں تھے اور یوں برہمنوں نے ان کے اوپر اپنی اجارہ داری بھی قائم کر لی اور راجاؤں کو اپنا دست نگر بنالیا۔ شودروں کے لئے تو اس قانون کی خلاف ورزی کی سزائیں بہت شدید تھیں۔ یعنی اگر کوئی شودر سنسکرت کا کوئی لفظ زبان سے ادا کرے تو اس کے حلق میں' اور کان سے سنے تو اس کے کانوں میں پگھلا ہوا گرم سیسہ ڈال کر ہلاک کر دیا جاتا تھا۔ شودر اچھوت سمجھے جانے لگے' یوں ان سے چھو جانا بھی حرام قرار پایا۔ کسی مندر کے قریب سے شودر کا گزرنا یا کسی برہمن پر اس کی پرچھائیں کا پڑ جانا بھی اس کے لئے موت کی سزا لاتا تھا۔ ابتداء میں برہمن صرف ''سپاہی'' سے مرعوب تھا' لیکن برہمنیت کی بنیادیں مضبوط ہو جانے کے بعد وہ کسی کو خاطر میں نہ لاتے تھے۔ عام لوگوں کا صرف یہ فرض تھا کہ وہ ہزاروں دیوتاؤں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے برہمنوں کی معرفت' قربانیوں کے لئے مویشی اور بعض حالات میں شودر فراہم کرتے رہیں۔

رگ وید کی تالیف کے زمانے میں جب آریہ لوگ پنجاب میں آباد تھے' تو اسے تاریخ میں آریہ تہذیب کا پہلا دور کہا جاتا ہے۔ اس زمانے کی تہذیب کا واحد ماخذ صرف رگ وید ہے' اور اس عہد میں ان کی معاشرتی زندگی بہت سادہ تھی' لیکن ستلج پار کرنے کے بعد وادی' گنگا و جمنا میں آباد ہونے کے بعد انہوں نے پر پرزے نکالے۔ اس کو آریہ تہذیب کا ''دوسرا دور'' کہا جاتا ہے۔ ذات پات کی تفریق اسی دوسرے دور میں پیدا ہوئی' جس کی عمارت ایک فلسفۂ حیات و کائنات پر تعمیر کی گئی۔ اس فلسفے کا خلاصہ یہ ہے: برہمن کے لفظی معنی ہیں روحِ کائنات۔ یہ روحِ کائنات ''تریمورتی'' (مثلث) کہی جاتی ہے' یعنی ایک وجود میں تین خدا۔ اس لئے برہمن کی ذات میں تین خدا پوشیدہ ہیں۔ ایک برہما یعنی خالق کائنات۔ دوسرے وشنو یعنی کائنات کو برقرار رکھنے والا' اور تیسرے شیو' یعنی کائنات کو تباہ کرنے والا۔ براہما یعنی خالق کائنات نے سب سے پہلے جس انسان کو وجود بخشا' وہ منو تھا۔ منو کے وجود سے تمام بنی نوع انسان اس طور پر وجود میں آئے:

1) منو کے سر سے تمام مقدس انسان پیدا ہوئے جو برہمن ہیں۔ برہمن کا کام دینی تعلیم اور پوجا پاٹ کرنا ہے۔
2) منو کے ہاتھوں سے وہ لوگ پیدا ہوئے جن کا کام حکومت اور جنگ کرنا ہے۔ ان کو کھتری کہتے ہیں۔
3) منو کے کولہوں سے وہ لوگ پیدا ہوئے' جن کا کام زراعت اور صنعت و حرفت ہے۔ کاشت کار' فن کار' دست کاران میں شامل ہیں۔ ان کو ویش کہتے ہیں۔
4) منو کے پیروں سے وہ لوگ پیدا ہوئے' جن کا کام ان تین طبقوں کی خدمت کرنا ہے۔ ان کو شودر (اچھوت) کہتے ہیں۔

ہندو دیو مالا

ہندو دیو مالا تریمورتی یا تثلیث کے گرد مرکوز ہے۔ ہندوؤں کے سب سے بڑے معبود تین ہیں: برہما' وشنو اور شیو۔ ان کو وہ ایک ہی خدا کی تین صورتیں مانتے ہیں۔ خالق کائنات کی حیثیت سے وہ برہما ہے۔ پروردگار یا ربّ یا پالنے والے کی حیثیت سے وہ وشنو ہے۔ دنیا کے مٹانے والے کی حیثیت سے وہ شیو ہے۔ یہ تینوں الگ الگ دیوتا نہیں ہیں' بلکہ ایک ہیں' اس لئے کبھی کبھی ان کا مجسمہ یوں بنایا جاتا ہے کہ ایک ہی آدمی کے جسم پر تین سر لگا دیئے جاتے ہیں۔ ایسے بت کو تریمورتی کہتے ہیں۔

(1) برہما: یہ ہندو تثلیث کا پہلا اقنوم ہے۔ خالق کائنات ہے۔ برہما کو دیوتاؤں کی حکومت کا صدر سمجھنا چاہئے۔ برہما کے چار چہرے اور دہن ہیں۔ اپنے ہر دہن کی گرفت میں ایک مقدس وید محفوظ رکھتا ہے۔ برہما اور سرسوتی مل کر ان مقدس کتابوں کے رکھوالے ہیں۔

سرسوتی دیوی برہما کی بیوی ہے۔ اس کا بڑا رتبہ ہے۔ برہما سے بڑھ کر سرسوتی کی پوجا ہوتی ہے' اس لئے کہ کائنات اسی کے بطن سے پیدا ہوئی۔ جس نے حمل سہا' اسی کو دھنیا باد کہیں گے۔ برہما مندر کمیاب ہیں۔ سرسوتی مندر جا بجا رونق افروز۔ سرسوتی سنسکرت رسم الخط کی موجود ہے۔ علم و حکمت کے خزانوں کی امانت دار ہے' اسی لئے ودیا مندروں اور درسگاہوں کے دروازوں پر اس کی حمد کے کتبے نصب کئے جاتے ہیں۔ سنگیت کی علامہ بھی یہی ہے۔ تصویروں میں سرسوتی بین بجاتی دکھائی گئی ہے۔ سنگیت کی بڑی سبھاؤں میں گانا بجانا سرسوتی کی حمد گا کر شروع کیا جاتا ہے۔

برہما اگرچہ سب سے بڑا معبود ہے' لیکن اس کا کوئی مندر نہیں پایا جاتا۔ عوام کے مذہب میں اسے بالکل ہی نظر انداز کر دیا گیا ہے' اس لئے کہ بحیثیت خالق کے وہ اپنا فرض پورا کر چکا ہے اور اب وشنو کی عملداری ہے۔ برہما کی حیثیت کچھ ایسی ہے جیسے کسی ریٹائرڈ بزرگ کی۔ حکیمانہ مشورے کی ضرورت آن پڑی تو وشنو یا شیو نے برہما سے رجوع کر لیا۔

(2) وشنو: ہندوؤں میں وشنو کے ماننے والوں کا بڑا زور ہے۔ منتروں میں اسے معبودِ شمس (سورج دیوتا) ظاہر کیا گیا ہے۔ اس طرح اس کا تعلق نور و حیات سے رہتا ہے۔ منتروں میں اس کے تین ڈگ (تری وکرما) بھرنے کا ذکر ہے' جس سے سورج کا طلوع' عروج اور غروب مراد ہے۔ اس کی بیوی لکشمی ہندوؤں کی نظر میں مادرانہ وقار کی دیوی ہے۔ اس کا تصور دلوں میں احترام کا جذبہ پیدا کرتا ہے۔ لکشمی اپنے شوہر وشنو کے ساتھ اوتار بن کر آتی ہے۔ چنانچہ جب وشنو رام چندر ہو کر پیدا ہوتا ہے تو لکشمی سیتا ہو کر پیدا ہوتی ہے۔ سیتا وفا اور عفت کی علامت ہے۔

وشنو کے چار ہاتھ دکھائے جاتے ہیں' جن میں سے ایک میں سنکھ' دوسرے میں گرز' تیسرے میں چرخ اور چوتھے میں کنول ہوتا ہے۔ کائنات کی پیدائش کی تصویریں بنائی جاتی ہے کہ وشنو ایک بہت سے سروں والے سانپ پر لیٹے ہیں اور ناف سے ایک کنول اگا ہے' جس پر برہما جی بیٹھے ہیں۔

وشنو نہایت ہی رحیم و کریم ہیں۔ دنیا کو تباہی سے بچانے کے لئے انہوں نے نو اوتار لئے ہیں۔ اوتار کے معنی اترنے یا نزول کے ہیں۔ جب دنیا کی حالت خراب و خستہ ہو جاتی ہے تو خدا اس کی اصلاح کے لئے حیوان یا انسان کی صورت میں جلوہ گر ہوتا ہے۔ اس نظریئے کی بنا پر بعض دیگر مذہب ہندو مت میں جذب ہو گئے' خصوصاً بدھ مت۔ وشنو کے اوتاروں میں رام چندر اور کرشن کے اوتار سب سے اہم مانے جاتے ہیں۔ کل دس اوتار ہیں جن کی ترتیب یہ ہے:

(1) متسیہ اوتار (مچھلی کی صورت میں)
(2) کورم اوتار (کچھوے کی صورت میں)
(3) وراہ اوتار (سور کی صورت میں)
(4) نرسنگھ اوتار (انسان اور شیر کی مرکب صورت میں)
(5) وامن اوتار (بونے کی صورت میں)
(6) پرش رام کی صورت میں
(7) رام چندر کی صورت میں
(8) سری کرشن کی صورت میں
(9) گوتم بدھ کی صورت میں
(10) کلکی اوتار کی صورت میں۔ اس کا آنا ابھی باقی ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق چار لاکھ 25 ہزار سال بعد ظاہر ہو گا۔ بعض مسلم محقق دلائل و شواہد سے یہ ثابت کرتے ہیں کہ کلکی اوتار دراصل آنحضور محمد ﷺ' رحمت للعالمین کی صورت میں تشریف لا چکے ہیں۔

(3) شیو: اس کے معنی ہیں رونے چلانے والا۔ یہ قدرت کی تخریبی قوتوں کا دیوتا ہے۔ یہ تباہی و بربادی کا دیوتا ہے۔ اس کی پیشانی پر ایک تیسری آنکھ (تری لوچن) ہے۔ جب وہ یہ تیسری آنکھ کھول دیتا ہے تو آگ اس طرح

نکلنا شروع ہو جاتی ہے' گویا ایک آتش فشاں پھٹ پڑا ہو اور ہر چیز جل کر خاک ہو جاتی ہے۔ کام دیو (محبت کا دیوتا) اس کی نگاہِ غضب کا شکار ہو کر اپنے جسم سے محروم ہو گیا' اس لئے وہ ''بے جسم'' کہلاتا ہے۔

شیو کی بیوی پاربتی ہے۔ دونوں کا مسکن کیلاش پربت ہے۔ یہ اپنے متناسب جسم کو ورزش سے چست و درست رکھتی ہے۔ شوہر اور بی بی دونوں رقص کے مظاہرے کر کے اپنی خوش وقتی کے سامان کرتے رہتے ہیں۔ زندگی اور موت کے اسرار پر ان میں آپس میں مذاکرے بھی ہوتے ہیں۔ چھیڑ چھاڑ' رقص کے مقابلے' مناظرے' غرضیکہ ان کے ازدواج میں پورا رچاؤ ہے۔

پاربتی کو شکتی بھی کہتے ہیں۔ شکتی کے معنی ہیں سکت' قوت' فعالیت۔ شکتی کے بھگت سب سے زیادہ بنگال میں ہیں۔ ہندوؤں کے بعض علماء اور درویش شنکر اچاریہ' رام کرشن' پرم ہنس' سوامی دویکا نند وغیرہ پاربتی یا شکتی کو ''مادرِ کائنات'' قرار دیتے ہیں۔

جین مت

ہندو مت کا تذکرہ جین مت اور بدھ مت کے ذکر کے بغیر ادھورا ہے۔ یہ دونوں مذاہب ہندو مت کے ردِعمل میں سامنے آئے۔ چھٹی صدی قبل مسیح کو تاریخ انسانیت میں خاص اہمیت حاصل ہے۔ شاید پوری دنیا میں انسانوں پر ویسے ہی نفسیاتی اور جسمانی مظالم ڈھائے جا رہے تھے' جو آریاؤں نے اقتصادی ترقی و خوشحالی اور تہذیبی جم جماؤ حاصل کرنے کے باوجود ذات پات کی تفریق' عقیدۂ تناسخ اور انسانی و حیوانی قربانیوں کی صورت میں روا رکھے۔ شاید انہی مظالم کا ردِعمل تھا کہ اس زمانے میں چین اور ہندوستان سے لے کر ایران اور یونان تک مختلف ملکوں میں بڑے بڑے مصلح' فلسفی اور مذاہب کے بانی پیدا ہوئے۔ اس صدی میں ہندوستان میں مہاویر اور گوتم بدھ پیدا ہوئے' چین میں کنفیوشس' لاؤزے' ایران میں زرتشت اور یونان میں فیثاغورث۔

آج تک مورخین یہ معلوم کرنے سے قاصر ہیں کہ جین مت کی بنیاد کس طرح' کہاں اور کب رکھی گئی' مگر جینی لوگوں کا کہنا ہے کہ جین مت ابدی اور غیر فانی ہے۔ یہ اُسی وقت سے ہے جب کائنات کا ظہور ہوا اور جب تک کائنات قائم ہے' جین مت بھی قائم رہے گا۔ ان کے خیال کے مطابق جینی پیغمبر وقتاً فوقتاً نوعِ انسان کی اصلاح کے لئے ظاہر ہوتے رہے۔ ان کے نزدیک آخری جینی پیغمبر مہاویر (560-468 ق م) ہیں۔ ان کا اصل نام وردھ مان ہے اور مہاویر لقب ہے یعنی بہادرِ اعظم۔ وہ صوبہ بہار کے ایک کھتری حکمران خاندان کے راج کمار تھے۔ پٹنہ کے قریب ویسالی میں پیدا ہوئے۔ گوتم بدھ کے ہم عصر تھے۔ تیس برس کے تھے کہ ان کے والدین کا انتقال ہو گیا اور انہوں نے دنیا اور اس کی آسائشوں سے تنگ آ کر تاج و تخت کو خیر باد کہا اور سچائی کی تلاش میں جنگل کی راہ لی اور تنہا سخت ریاضت کی۔ بارہ برس کی ریاضت کے بعد آخر کار عرفان حاصل ہوا اور وہ مہاویر کہلانے لگے۔ بیالیس برس کی عمر میں اپنے پرانے فرقے کی از سرِ نو تنظیم کی اور اس کا نام جین مت رکھا۔ آئندہ تیس سال مگدھ اور آس پاس کی ریاستوں میں پرچار کیا۔ کئی شاہی خاندانوں سے تعلق ہونے کی وجہ سے انہیں اپنے مذہب کی اشاعت میں بڑی مدد ملی۔ تاہم جین مت بدھ مت کی طرح زیادہ نہ پھیل سکا۔

مہاویر کے عقیدے کے مطابق انسانی زندگی کا مقصد نروان حاصل کرنا ہے جو تین اصولوں پر عمل کرنے سے حاصل ہو سکتا ہے: صحیح عقیدہ' صحیح علم اور صحیح عمل۔ جین مت کے بنیادی اصولوں میں سب سے بڑا اصول یہ ہے کہ کسی جاندار کو ایذا نہ پہنچائی جائے۔ ان کے نزدیک پتھر اور دیگر بے جان چیزیں بھی روح اور زندگی سے خالی نہیں۔ ان کے پروہت تو یہاں تک احتیاط کرتے ہیں کہ پانی چھان کر پیتے ہیں۔ ناک پر کپڑا رکھتے ہیں تاکہ ہوا بھی جراثیم سے چھن کر اندر جائے۔ مسواک نہیں کرتے کہ اس سے دانتوں کے کیڑے ہلاک ہو جاتے ہیں۔ بعض حالتوں میں چلتے وقت آگے سے جگہ صاف کرتے جاتے ہیں کہ کوئی کیڑا مکوڑا پاؤں تلے آ کر کچلا نہ جائے۔ ترکِ دنیا اور نفیٔ حیات کا مسلک بھی ان کا ایک بنیادی اصول ہے۔ فاقہ کشی سے خود کشی کر لینا ان کے نزدیک زندگی کا صحیح انجام' گویا کہ معراج ہے۔ آریاؤں کے ویدوں کو نہیں مانتے اور برہمن اور اس کے اقتدار کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے ہیں۔ ذات پات کی تفریق کو انسانیت کی توہین خیال کرتے ہیں۔ جین مت کا سب سے بڑا اصول اہنسا یعنی جانداروں کو ایذا نہ پہنچانا ہے' اس لئے وہ گوشت خوری کے سخت خلاف ہیں۔

آج کل بھارت میں جینی لوگوں کی تعداد بیس لاکھ کے قریب ہے۔ یہ لوگ عام طور پر خوش حال اور امیر کبیر ہیں۔ تجارت پیشہ ہیں۔ گجرات' کاٹھیاواڑ' راجپوتانہ' بنگال اور بمبئی میں رہتے ہیں۔ کاٹھیاواڑ میں اور راجپوتانہ میں کوہ آلو پر اُن کے بڑے خوبصورت مندر ہیں۔

بدھ مت

برہمنیت کے خلاف جین مت سے بھی زیادہ مؤثر اور شدید تحریک بدھ مت تھی' جس نے غیر معمولی مقبولیت اور کامیابی حاصل کی۔ بدھ مت کا بانی سدھارتھ گوتم (560-483 ق م) ساکیا قبیلے کے کھتری راجا شدھودن کا بیٹا تھا۔ باپ کی خواہش تھی کہ اس کا بیٹا بھی اسی کی طرح فنونِ سپہ گری میں مہارت حاصل کر کے سورما بنے اور اس کے بعد اس کا راج پاٹ سنبھالے' لیکن راج کمار نے تیس برس کی عمر میں بدّی کو پار کیا اور اس کا سنیاس شروع ہوا۔

اس سماج میں اس زمانے میں سنیاس کے سلسلے عام تھے۔ شہروں کی بے روح فضا سے اکتا کر بہت سے حساس لوگ جنگلوں کی طرف نکل گئے تھے۔ وہاں سادھوؤں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں گیان دھیان کی غرض سے خیموں اور جھونپڑوں میں بسیرا کئے ہوئے تھیں۔ شہروں میں دلوں کو لگنے والی کوئی روحانی یا اخلاقی بات عوام الناس کو میسر نہ تھی۔ ویدوں کے اشلوک ایک ہزار سال قبل سوم رس کے نشے میں شاعروں نے تصنیف کئے تھے اور ان میں آریائی فاتحین اور دیوتاؤں کی طاقت اور زور آوری کے مضامین کے سوا کچھ نہ تھا۔ پھر اگر کچھ ہوتا بھی تو ایک اور وجہ فکر و خیال کے قحط کی یہ تھی کہ ویدوں کے اشلوک سب سنسکرت میں تھے اور ان کے ترجمے کسی دیسی بولی میں کرنے کی اجازت نہ تھی۔

اس نے کئی برس جنگلوں میں تپسیا اور ریاضت میں گزار دیئے۔ اب اس کے آخری مراقبے (دھیان) کا وقت آیا۔ وہ بدھی (دانش) کے درخت کے پاس بیٹھ کر دھیان میں گم ہو گیا۔ انچاس روز ساکت و ہیں بیٹھا رہا۔ اس زمانے میں بڑے زور کا مینہ برسا۔ ایک ناگ نے اپنے سر کی چھتری تان کر گوتم کو اس بارش سے بچایا۔ آخر ''حقیقت'' گوتم پر آشکار ہو گئی۔ دکھ کے سوال کا جواب اور نجات کی راہ کا پتا مل گیا۔ شک کے بادل چھٹ گئے۔ سوچ میں روشنی آئی اور آنکھوں میں عرفان کا نور چمکا۔

شہر کی طرف روانہ ہوا تو جنگل میں انہی پانچ سنیاسیوں سے ملاقات ہوئی' جن کے ساتھ اس نے تیاگ کے آغاز میں چند مہینے گزارے تھے۔ یہ سنیاسی اس کے چہرے پر اطمینان کا نور دیکھ کر متحیر ہوئے اور اس کی باتیں سن کر اور بھی متاثر۔ انہوں نے گوتم کو اپنا گورو مانا۔ بدھ مت کے سب سے پہلے پیرو یہی پانچ یار تھے۔

سارناتھ میں' جو بنارس سے دور نہیں' اس نے پہلی بار مجمع کے آگے تقریر کی' جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جیون کا نام ہے دکھ کی حالت۔ ہم یہاں دکھ کی حالت میں اس لئے ہیں کہ پچھلے جنم کے آخر میں ہم جیون کی خواہش لے کر مرے۔ جب تک یہ خواہش ختم نہ ہو نجات نہ ہو گی۔ دکھ جیون کے ساتھ لگا ہوا ہے۔ اس سے نجات کی راہ یہی ہے کہ جیون کی خواہش کا الٹ ہو' یعنی پورے خلوص سے دھرتی کی زندگی تیاگ دی جائے اور اس زندگی کی خواہش رتی بھر بھی نہ رہے۔ آٹھ باتوں کے درست ہونے سے خلوص آئے

گا۔ دھیان' فہم' خیال' قول' عمل' روزی کی کمائی' کوشش اور تدبر۔ تیاگ کی خواہش میں پورا خلوص ہوگا تو تناسخ کا سلسلہ ٹوٹ جائے گا۔ پھر اگلا جنم کوئی نہ ہوگا۔ بیماری' بڑھاپے اور موت کے دکھوں سے پیچھا چھوٹ جائے گا۔ نجات کسی جنت میں داخل ہونے کا نام نہیں۔ نجات اس میں ہے کہ خاتمہ ہو جائے اور ہم نہ رہیں اور نیستی اور سناٹا ہی باقی رہ جائیں۔ اسی کو اس نے خاتمہ بالخیر کہا۔

تناسخ کا عقیدہ گوتم نے ہندو مت کے اثر سے قبول کیا۔ بس یہی ایک بات ہے جو اس کے عقیدے اور ہندو مت کے درمیان مشترک ہے۔ سب سے بڑا فرق تو یہ ہے کہ کسی دیوتا یا دیوی کا ذکر اس کی تعلیم میں نہیں ہے۔ ویدوں کی تعلیمات کو بالائے طاق رہ دینا اور دیوی' دیوتاؤں کی پوجا کو روحانیت سے خارج کر دینا' اور اس زمانے میں' یہ بڑی جرأت کی بات تھی۔

ظاہر ہے کہ گوتم دیوی دیوتاؤں کے فضول قصوں اور آتما پرماتما کی ان بیکار بحثوں سے بیزار ہوا' جن میں دکھی لوگوں کی چارہ گری کا کوئی خیال شامل نہ تھا۔ اس نے محسوس کیا کہ بیدی (دانشور) اور گیانی (عابد زاہد) آتما اور خدا اور دیوتا کی شان میں ڈھول پیٹ کر روحانیت کے اصل اصول کو پس پشت ڈالے رکھتے ہیں اور وہ اصل اصول ہے چارہ گری۔ یہ سوال اٹھانے کی بجائے کہ خدا ہے یا نہیں' اور اگر ہے تو وہ کون ہے' کہاں ہے' یہ سوچنا چاہئے کہ ہم تم آپس میں ایک دوسرے کے لئے رحم دل ہیں یا بے رحم۔ گوتم کی رائے میں روحانیت کا انحصار اسی سوال پر ہے' کسی کو دکھ نہ دینا' کسی خدا کے حکم سے کیوں ہو؟ دکھ نہ دینے کا سبق بس اسی بنا پر ہونا چاہئے کہ دکھ دکھ ہی ہے اور دکھ اٹھانے والا دکھی ہے' بے چارہ ہے' بے کس ہے۔ رحم اور ہمدردی کا مستحق ہے۔ اس نے ایسی سادگی سے یہ بات کہی کہ سب دیکھوں نے کہا' بھائیو' پتے کی بات تو اس نے کی۔

رحم اور ہمدردی کی باتیں سن کر ہندو عوام نے اس کو سچا ہمدرد اور غم خوار جانا۔ اس کے خلوص پر غریب لوگ ایمان لائے۔ ویدوں میں عسکری فتوحات اور جنگ کی جے پکاری گئی تھی۔ ایسے الہام سے عوام کو تسلی نہیں مل سکتی۔ ویدوں کی تصنیف کے ایک ہزار سال بعد ایک راجہ نے تاج و تخت سے منہ پھیر کر رحم دلی اور ہمدردی کا پیغام دیا۔ ویدوں کی تردید اور بطلان کی بجائے اس نے ایک طبع زاد روحانی اصول پیش کیا۔ اگر وہ بول اٹھتا کہ پرانی باتیں غلط ہیں اور ٹھیک بات مجھی کو سوجھی ہے تو سننے والے اس کے قول کو ویدوں اور دیوتاؤں کی توہین سمجھتے اور مشتعل ہو جاتے۔ ویدوں نے آسمانی' فوق الفطری' دیوتاؤں کی حمد گائی' لیکن عملی اور حقیقی رحم دلی نہ سکھائی۔ گوتم نے دیوتاؤں کی جے نہ پکاری' لیکن وہ رحم کا پیغامبر تھا۔ نعرہ لگانے کی بجائے دھیمے سروں میں اس نے جو کچھ کہا' دلوں میں اتر گیا اور فضا بدلنے لگی۔

گوتم چالیس برس سے زیادہ عرصہ اپنے مسلک کی تعلیم و تبلیغ کرتا رہا۔ ہندوؤں کی جانب سے مخالفت بھی ہوئی اور اس کے کردار کو جھٹلانے کے لئے سازشیں بھی ہوئیں' لیکن کسی نے اس کو شہید نہ کیا۔ اس کے حلم' نرم دلی اور دھیمے پن نے اسے قاتل کے وار سے محفوظ رکھا۔

ہندو سامراج کا تاریخی پس منظر

برہمنیت کے خلاف بدھ مت نے تیزی سے ترقی کی منزلیں طے کیں اور یہ دیکھتے دیکھتے ہندوستان کا مقبول ترین انقلابی اور عوامی مذہب بن گیا۔ اس کی وجوہ ظاہر ہیں۔ برہمنیت کا کوئی بانی نہ تھا۔ بدھ مت کا ایک بانی تھا جو ذاتی لحاظ سے نہایت سادہ' پارسا' رحم دل اور پرہیزگار تھا۔ دوسرے یہ کہ برہمنیت میں پرچار سنسکرت زبان میں ہوتا تھا جسے راجہ اور برہمن کے سوا کوئی نہ بول سکتا تھا۔ بدھ مت کی تبلیغ کے لئے عام بول چال کی زبان استعمال کی گئی۔ تیسرے یہ کہ بدھ مت درحقیقت برہمنیت کی ذات پات کی تفریق ہی کے ردعمل میں پیدا ہوا تھا۔ اس تحریک سے عوام جوق در جوق بدھ مت کی طرف راغب ہو گئے۔

عقلی دور

برہمنوں نے اپنی رجعت پسندی کے خلاف اس ترقی پسند تحریک کو دیکھا تو وہ بھی کچھ عقل و دانش کی طرف مائل ہوئے۔ اس دور کو دور رزمیہ (Epic Age) کہتے ہیں۔ نصابی کتابوں میں اسے ''دور شجاعت'' کہا جاتا ہے' حالانکہ اس دور میں شجاعت و بہادری دکھانے کے لئے جنگیں نہیں ہوئی تھیں' بلکہ شعر و شاعری سے منظوم رزمیہ تخلیق کی گئی تھیں' جن میں زیادہ معروف رامائن اور مہا بھارت ہیں۔ یہ دراصل سنسکرت کی برہمنی زبان کے خلاف عوامی زبان کی بغاوت تھی' بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ بدھ مت کی مقبولیت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان کی تقلید میں عوامی زبان کا استعمال۔ اس کو پنڈت جواہر لال نہرو آریوں کا تیسرا دور کہتے ہیں جس میں عقل و دانائی کی باتیں کی گئیں اور سابقہ دو ادوار میں انتہا پسندی سے جو غلطیاں کی گئی تھیں' ان کی اصلاح کی کوششیں کی گئی تھیں۔ چنانچہ چاروں وید' جن کو صرف برہمن جناتی زبان میں پڑھ سکتے تھے' ان کے ترجمے مروجہ عوامی زبان میں کئے گئے۔ عوام کے استفادے کے لئے ان کی شرحیں لکھی گئیں۔ مشکل الفاظ کے معانی بیان کئے گئے۔ مطالب کی تشریح کی گئی۔ اسی زمانے میں اپنشدوں کا آغاز ہوا' جس میں روح' زندگی' کائنات' موت اور خالق مطلق ایسے گہرے فلسفیانہ مسائل بیان کئے گئے۔ ''اپنشد'' دراصل آریائی فکری رسائل ہیں جن میں ویدوں کے اقوال و اشعار کی تشریح سادہ و سلیس نثر میں بیان کی گئی ہے۔ ان کی تعداد دو سو کے قریب ہے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے بھائی نے دس اپنشد کا سنسکرت سے فارسی میں ترجمہ کرایا تھا۔ اس مجموعے کا نام ''سرّ اکبر'' ہے اور اس کے انگریزی' فرانسیسی اور جرمن زبانوں میں ترجمے ہو چکے ہیں۔

ایرانی و یونانی حملے

ویدوں اور زرتشت کی مقدس کتاب ''اوستا'' میں بہت سے مضامین مشترک ہیں۔ انسانی زندگی کے متعلق دونوں کے نظریات میں بھی خاص مشابہت پائی جاتی ہے۔ ایک وقت ایسا آیا کہ ایرانی حکمرانوں نے ہندوستان کی سرزمین پر قبضہ جمانے کی کوشش کی۔ ایران کے حکمران خاندان ہخامنشی کے بانی سائرس یا کیخسرو (558-530ق م) نے بیس سال کی قلیل مدت میں میڈیا' بابل' اشوریہ اور لیڈیا کو فتح کر کے اپنی مملکت میں شامل کر لیا' اور مشرق میں اس نے کوہ ہندوکش کو پار کر کے اپنی سلطنت کو وسعت دی' جس میں پاکستان کا موجودہ شمال مغربی سرحدی صوبہ شامل تھا۔

داراوّل (521-485ق م) نے حملہ آور ہو کر دریائے جہلم تک کے علاقے کو فتح کر کے ایرانی سلطنت میں شامل کر لیا۔ ایران اس وقت 27 صوبوں پر مشتمل تھا اور پاکستان کے موجودہ دو صوبے یعنی صوبہ سرحد اور پنجاب ان میں شامل تھے۔

سکندر یونانی نے 327ق م میں جہلم کے کنارے راجہ پورس کو شکست دی اور واپس ہو گیا۔ 323ق م میں سکندر کا انتقال ہو گیا۔ اس کے ایک سردار سلوکس کے حصے میں ہندوستان کا شمال مغربی علاقہ بھی آیا جو سکندر نے فتح کیا تھا۔ لیکن وہ ہندوستان پر کوئی اقتدار نہ رکھ سکا۔ سکندر کے حملے اور اس کی موت کا ہندوستان پر یہ اثر پڑا کہ ایک زبردست سلطنت یہاں قائم ہو گئی' یعنی سلطنت موریہ۔

موریہ خاندان کی حکومت سے لے کر مکہ معظمہ میں پیغمبر اسلام حضرت محمد ﷺ کی ولادت (570ء) تک' تقریباً نو صدیوں کا فاصلہ ہے۔ ان نو صدیوں کے دوران میں ہندوستان کی سرزمین بدھ مت اور ہندو مت کے درمیان غلبے کی جنگیں ہوتی رہیں۔ چندر گپت موریہ اور اس کا مشیر چانکیہ اور اس کا بیٹا بندوسار کٹر ہندو تھے' اور انہوں نے بدھ مت کو مٹانے کی سرتوڑ کوششیں کیں' لیکن چندر گپت کا پوتا اشوک بدھ مت کا زبردست مبلغ پیدا ہوا۔ پنڈت جواہر

لال نہرو اشوک کے بارے میں لکھتے ہیں: ''ساری دنیا کے مذہبی مشاہیر میں سے شاید کسی نے اتنی رواداری برتی ہو جتنی اشوک نے برتی۔ اس کے برخلاف انہوں نے لوگوں کو اپنے مذہب میں داخل کرنے کے لئے شاید ہی کبھی جبر' زبردستی' دھونس' دھمکی اور دھوکے سے پرہیز کیا ہو۔ دنیا کی تاریخ مذہبی مظالم اور لڑائیوں سے بھری پڑی ہے' اور مذہب اور خدا کے نام پر جتنا خون بہایا گیا ہے' شاید ہی کسی اور نام پر بہایا گیا ہو۔ ایسی صورت میں یہ چیز یاد رکھنے کے لائق ہے کہ ہندوستان کے ایک مایہ ناز سپوت نے' جو سخت مذہبی آدمی بھی تھا اور ایک عظیم الشان سلطنت کا مالک بھی' مذہب کی اشاعت کے معاملے میں کیا رویہ اختیار کیا۔ یہ خیال کرنا کتنی بے وقوفی کی بات ہے کہ کوئی مذہبی عقیدہ لوگوں سے زبردستی تلوار کے زور سے منوایا جا سکتا ہے۔''

اس کے باوجود گپت خاندان کے برہمن حکمرانوں نے تلوار کے زور سے بدھوں کو دوبارہ ہندومت اختیار کرنے پر مجبور کیا۔ برہمنیت کی اخلاق سوز برائیوں اور گوتم بدھ کی اعلیٰ اخلاقی تعلیمات کے باعث بدھ مذہب ایک وسیع وعریض اور عظیم الشان سلطنت کا سرکاری مذہب بن گیا' جس کی سرحدیں مغرب میں کابل سے شروع ہو کر مشرق میں بنگال کی آخری حد تک اور شمال میں ہمالیہ کی ترائی سے لے کر جنوب میں بحیرۂ عرب کے ساحل تک پہنچتی تھیں۔ اشوک اور کنشک دو عظیم حکمران بدھ مت کے پیرو تھے۔ انہوں نے مصر' یونان' شام اور دوسرے ملکوں سے سفارتی تعلقات قائم کئے۔ دنیا بھر میں بدھ مذہب کے مبلغ اور واعظ بھیجے۔ ان کوششوں کا نتیجہ تھا کہ بدھ مذہب چین' جاپان' برما' سری لنکا' انڈونیشیا' جاوا' ساٹرا' ہندچینی' غرض ایشیا کے بیشتر حصے میں پھیل گیا۔

یہ ہندوستان کی تاریخ کا بہت بڑا المیہ ہے کہ وہ مذہب جس نے یہاں کے جاہل اور غیر مہذب لوگوں کو جہنم سے نکال کر خوشحالی' مساوات' رواداری اور امن و آشتی کی جنت میں پہنچا دیا تھا' اسے برہمن راجاؤں اور ان کے شنکر اچاریہ اور کمارلہ بھٹ جیسے متعصب مشیروں نے منظم تحریک چلا کر بدھ مت کو ہندوستان سے نکال باہر کیا۔ دوبارہ ہندو راج کے قیام کے بعد بدھ مذہب اور اس کے پیروؤں پر مظالم ڈھائے گئے۔ بدھوں کی تمام خانقاہیں مسمار کر دی گئیں۔ ان کی مذہبی کتب نذر آتش کر دی گئیں۔ بدھ مت کے پیروؤں کو ملک بدر کیا گیا۔ سورج بنسی اور چندر بنسی راجپوتوں نے ہندو مذہب کی حمایت کا بیڑا اٹھایا۔ ان لوگوں نے بدھوں کے مندر اور خانقاہیں سرکاری طور پر منہدم کرا دیں اور ان کی جگہ ہندو مندر تعمیر کرائے۔ مغرب کا محتاط مورخ ریورنڈ ڈبلیو ولکنس یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا:

''بدھ کے ماننے والوں پر اس قدر ظلم و ستم توڑے گئے کہ یا تو انہیں قتل کر دیا گیا یا ملک بدر کر دیا گیا یا مجبور کیا گیا کہ وہ واپس ہندومت میں داخل ہو جائیں۔ تاریخ انسانی میں شاید ہی کوئی ایسی نظیر ملے کہ کسی تحریک کو مذہبی ظلم و جبر میں اتنی کامیابی حاصل ہوئی ہو' جتنی کامیابی برہمنوں نے بدھ مذہب کو ہندوستان سے دیس نکالا دینے میں حاصل کی۔''

آنحضور ﷺ کی ولادت و بعثت اور ہندوستان میں اسلام کے ورود کے وقت بدھ مت ہندو مذہب سے قریب قریب شکست کھا چکا تھا۔ گوتم اور مہاویر نے ہندومت کی آغوش سے نکل کر بدھ مت اور جین مت کی صورت میں ہندوؤں کی اصلاحات کے لئے جو تحریکیں شروع کی تھیں' انہیں نو صدیوں کے دوران میں کٹر اور متعصب برہمن راجاؤں اور آخر میں راجپوتوں نے ادھ موا کر دیا تھا۔ جب **570ء** میں آنحضور ﷺ کی ولادت ہوئی تو اس وقت وردھن خاندان کے بانی پشپامتر کا بیٹا حکمرانی کر رہا تھا۔ وہ شیو دیوتا کا پجاری تھا۔ **583ء** میں پشپا کا پوتا پربھارکر وردھن تخت نشین ہوا۔ اس نے آنحضور ﷺ پر پہلی وحی اقراء کے نزول **610ء** سے پانچ سال پہلے یعنی **605** تک حکومت کی۔ اس نے پہلی مرتبہ ''ادھیراج'' کا لقب اختیار کیا۔ اس سے پہلے اس کے باپ دادا اپنے آپ صرف ''مہاراج'' کہلواتے تھے۔ پربھارکر کے تین تھے۔ راج وردھن' ہرش وردھن اور ایک بیٹی راجشیری۔ ان کے وقت ہندو مذہب یعنی بت پرستی' دیوتاؤں کی پو اور ذات پات کی تفریق دوبارہ اپنے عروج پر تھی' اور عرب سا زمانۂ جاہلیت ہندوستان میں بھی جاری و ساری تھا۔

لیکن راجہ ہرش کے انتقال **647ء** سے پہلے بلوچستان اور سندھ کے مطلع پر بادل کا ایک ٹکڑا نمودار ہوا۔ ٹکڑا اس زبردست فکری و عملی انقلاب کا پیش خیمہ تھا جس ایشیا' افریقہ اور یورپ پر اپنا سایہ ڈال دیا۔ عرب میں اللہ آخری رسول کا لایا ہوا' پوری انسانیت کے نام ایک نیا سلا والا دین اسلام چہار اطراف پھیلنے لگا۔ نظریۂ پاکستا وردھن خاندان ہی کے عہد میں بلوچستان پہنچ گیا تھا۔

4

ہندوؤں کا مذہب — آنکھوں دیکھا حال

اس باب میں ہندوؤں کے مذہبی عقائد و رسوم کے بارے میں خیالات و افکار نہیں' بلکہ بعض مشہور شخصیتوں کے چشم دید احوال' جو انہوں نے ہندوؤں میں برس ہا برس گھوم پھر کر مشاہدہ کئے اور قلم بند کئے' پیش کئے جاتے ہیں۔ ان شخصیات میں البیرونی' خالدہ ادیب خانم' بیورلے نکلسن' ڈاکٹر امبید کر' راج گوپال اچاریہ اور سری پرکاش کی تحریروں سے اقتباسات لئے گئے ہیں' جو اپنی طوالت کے باوجود ''نظریۂ پاکستان'' کی حقیقت کو سمجھنے میں مددگار ثابت ہوئے ہیں۔ اس باب کے مندرجات کا مطالعہ کرتے وقت گزشتہ باب (اسلام) کے مندرجات پیش نظر رہنے چاہئیں۔

ابوریحان البیرونی

مورخ' سائنسدان' جغرافیہ دان' شاعر' فلسفی البیرونی (**973ء۔1048ء**)' مسلسل دس سال ہندوستان بلکہ پنجاب میں رہا۔ اس نے اپنی سیاحت پنجاب کے شہروں ہی تک محدود رکھی جو محمود غزنوی کے دائرہ اختیار میں آ چکے تھے۔ پنجاب سے آگے اس کے قدم نہیں بڑھے۔ البیرونی کو غزنی کے قیام کے دوران ہی میں اہل ہند کے حالات معلوم کرنے اور ان کی زبان سنسکرت اور ہندی علوم بالخصوص ریاضی و ہیئت سیکھنے کا شوق تھا۔ پنجاب میں اس کا قیام ملتان میں زیادہ عرصے رہا۔ دس سال کے قیام میں البیرونی نے ہندوؤں کی زبان' ہندوؤں کے مذہب اور رسوم و رواج کے متعلق قابل قدر معلومات حاصل کیں۔ ہندوستان سے واپسی پر' غزنی پہنچ کر اس نے تنہائی اختیار کر لی اور تصنیف و تالیف میں مصروف رہا۔ اس نے ہندوستان کی سیاحت اور مشاہدات کا احوال ''کتاب الہند'' میں پوری تفصیل سے بیان کیا۔

ہندوؤں کے مذہب و معاشرت کے بارے میں البیرونی لکھتا ہے: ''ہندو بال نہیں منڈاتے۔ ڈاڑھی کی حفاظت کے لئے چوٹیاں گوندھ لیتے ہیں اور جسم کے سارے بال چھوڑ دیتے ہیں۔ نکمے رہنے پر فخر کرنے کے لئے ناخن بڑھائے رکھتے ہیں' اس لئے کہ بڑھے ہوئے ناخنوں سے محنت طلب کام نہیں ہو سکتے۔ کھانا کھانے کے

ر کے دسترخوان پر کھاتے ہیں۔ نہار منہ شراب پیتے
کھانے کے ساتھ گائے کا پیشاب پیتے ہیں۔ مذہبی
وں پر اپنے بدن پر عطر کی بجائے کیچڑ ملتے ہیں۔ شوہر
ام کرتے ہیں اور سارا کام حتیٰ کہ کھیتی باڑی بھی عورتیں
تی ہیں۔ جو شخص لباس میں اختصار کرتا ہے' وہ صرف دو
ں کی دھجی پر قناعت کرتا ہے' جسے وہ دودھاگوں سے ستر پر
ھ لیتا ہے۔ جو شخص لباس میں زیادتی کرتا ہے' وہ ایسا لہنگا
تا ہے' جس کی روئی کئی لحاف کے لئے کافی ہوتی ہے۔
عورتوں جیسا لباس پہنتے ہیں۔ رنگوں کا استعمال کرتے
۔ کان میں آویزے' ہاتھوں میں کنگن اور پاؤں میں
ونے کی انگوٹھیاں پہنتے ہیں۔ مخنث اور ہیجڑوں سے اختلاط
تے ہیں جو نہایت مکروہ' گندی اور فحش حرکتیں کرتے
۔ رفع حاجت کے وقت منہ دیوار کی طرف اور ستر راہ
روں کی طرف کھلا رکھتے ہیں۔ لنگ کی' جو مہادیو کی طرف
وب ہے' پوجا کرتے ہیں۔ مصافحے میں ہاتھ کو' ہتھیلی کی
ئے پشت کی طرف سے پکڑتے ہیں۔ گھر کے اندر آنے
لئے اجازت طلب نہیں کرتے اور مجلس میں چار زانو
تے ہیں۔ ریاح کے اخراج کو مبارک اور چھینک کو منحوس
یال کرتے ہیں۔ بڑوں کا ادب کئے بغیر تھوکتے اور جوں
رتے رہتے ہیں۔ اپنی زبان کے مذکر اسماء کو مؤنث بنا کر
ان میں عظمت پیدا کرتے ہیں۔ بڑے بیٹے کو غلبۂ شہوت
ور چھوٹے کو فکر و ارادے کا نتیجہ سمجھتے ہیں۔ مست ہاتھیوں
کے بدبودار پسینے کو' جو ان کے منہ پر بہتا ہے' بطور خوشبو
ستعمال کرتے ہیں۔ جولاہے کو ناپاک اور مردار جانوروں
کے لادنے والے کو پاک سمجھتے ہیں۔ کم سنی کی شادی کا رواج
ہے۔ طلاق کی اجازت نہیں۔ بیوہ عورتوں کا نکاح ممنوع
ہے۔ بیوہ عورت کو اس قدر منحوس خیال کیا جاتا ہے کہ وہ عام
طور پر زندہ جل مرتی ہے''۔

ہندو مسلم مغائرت کے اسباب

البیرونی نے ''کتاب الہند'' میں ہندو مسلم مغائرت و
داوت کے پانچ اسباب بتائے ہیں:

پہلا سبب: ہندو قوم ہم (مسلمانوں) سے اُن تمام
چیزوں میں مغائر ہے جو قوموں کے درمیان مشترک ہوتی
ہیں۔ مغائرت کے اسباب میں سب سے پہلی زبان ہے۔
کوئی شخص جو مغائرت رفع کرنے کے لئے یہ زبان
(سنسکرت) حاصل کرنا چاہے' نہیں کر سکتا؟''

آخر کیوں؟ ''اس لئے کہ سنسکرت زبان کی تقدیس کو
برقرار رکھنے کے لئے جو دیوتاؤں کی بولی خیال کی جاتی ہے'
تمام اجارہ داری برہمنوں کے سپرد تھی۔ عوام کے لئے نہ
صرف اس کی تحصیل بلکہ سماعت تک جرم قرار دی گئی تھی۔
سنسکرت پڑھنے والے کی زبان کاٹ دی جاتی تھی اور سننے
والوں کے کانوں میں پگھلا ہوا سیسہ ڈال دیا جاتا تھا۔

دوسرا سبب: ''ہندو مذہب کے معاملات میں ہم
(مسلمانوں) سے مکمل مغائرت رکھتے ہیں۔ نہ ہم کسی ایسی
چیز کا اقرار کرتے ہیں جو ان کے یہاں مانی جاتی ہے اور نہ
وہ ہمارے ہاں کی کسی چیز کو تسلیم کرتے ہیں۔ اگرچہ یہ لوگ
آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ مذہبی نزاع اور بحث
مباحثہ کم کرتے ہیں' مگر غیروں کے ساتھ اُن کی یہ روش
نہیں۔ غیروں کو یہ لوگ ملیچھ (ناپاک) کہتے ہیں۔ اس وجہ
سے ان سے ملنا جلنا' شادی بیاہ کرنا' قریب جانا یا ساتھ
بیٹھنا اور مل کر کھانا جائز نہیں سمجھتے' بلکہ جس چیز میں غیر قوم کی
آگ اور پانی سے کام لیا گیا ہو' اور جن دونوں ضروریات
زندگی پر انسانی زندگی کا انحصار ہے' اپنے لئے ناپاک سمجھتے
ہیں۔ ہندوؤں کے ہاں کسی طریقے سے اصلاحِ حال کی
کوئی صورت ہی نہیں ہے۔ ہندوؤں میں کسی شخص کو' جو اُن
کی قوم سے نہیں' اپنے اندر داخل کرنے کی مطلق اجازت
نہیں۔ یہ حالت ایسی ہے جو ہر رشتے کو توڑ دیتی ہے اور مکمل
طور پر منقطع کر دیتی ہے''۔

تیسرا سبب: ''یہ لوگ رسم و رواج اور عادات و اطوار
میں ہم (مسلمانوں) سے اس درجہ اختلاف رکھتے ہیں کہ
اپنے بچوں کو ہم سے اور ہمارے لباس کی وضع قطع سے
ڈراتے ہیں اور ہم لوگوں کو شیطان کی طرف منسوب کرتے
ہیں۔ ہم کو یاد ہے کہ ایک ہندو راجا نے اپنے دشمنوں سے
انتقام لینے کے لئے انہیں ہم مسلمانوں جیسا لباس پہننے پر
مجبور کیا۔ یہ قصہ سن کر ہم نے راجا کا شکریہ ادا کیا کہ اس نے
ہم لوگوں کو ہندو بننے اور اس کی رسمیں اختیار کرنے کی سزا
نہیں دی''۔

(ہزاروں سال کی مدت گزرنے کے بعد ہندوؤں
کی یہ مغائرت و منافرت آج تک کم نہیں ہوئی۔ مسلمانوں
کو تکلیف پہنچانا' دکھ دینا' ذلیل کرنا' بائیکاٹ اور نفرت سے
دور رکھنا اور قتل و غارت سے نیست و نابود کر دینا' ایک ہندو
کی زندگی کا لازمی جز ہے۔ ہندو عورتیں آج بھی اس بات
کی دیسی ہی متمنی ہیں کہ اُن کی اولادیں چھ ہزار سال پرانے
توہمات و خرافات کی گود میں پل کر جوان ہوں۔ مسلمانوں کو
ہندوستان میں اجنبی اور ملیچھ خیال کریں۔ کسی مسلمان
دکاندار سے سودا نہ خریدیں اور خود بازار میں چلتے وقت ایسے
مختلف زاویے اور نیم دائرے بناتی ہوئی چلیں کہ اُن کا
آنچل کسی مسلمان سے چھو نہ جائے۔ مغلیہ عہد حکومت تک
مسلمان چھوت چھات کے اس اذیت ناک اثرات سے
اس لئے محفوظ رہے کہ وہ حاکم تھے' لیکن سلطنت کھو دینے
کے بعد انہیں یہ محسوس ہوا کہ وہ سماج کی سیڑھی کے آخری
زینے پر سے بھی اتار دیئے گئے ہیں)

چوتھا سبب: البیرونی نے لکھا: ''کچھ اسباب ایسے
ہیں کہ جن کو بیان کرنا گویا ہندوؤں کی ہجو ہے' لیکن حقیقت
میں وہ اُن کے اخلاق میں سموئے ہوئے ہیں اور کسی سے مخفی
نہیں۔ حماقت ایک ایسی بیماری ہے جس کا کوئی علاج نہیں۔
ان لوگوں کا اعتقاد یہ ہے کہ ملک ہے تو ان کا' انسان ہیں تو
ان کی قوم کے لوگ۔ بادشاہ ہیں تو ان کے۔ دین ہے تو وہی
جو ان کا مذہب ہے اور علم ہے تو وہ جو ان کے پاس ہے۔ اس
لئے یہ بہت تکبر کرتے ہیں' اور جو تھوڑا سا علم ان کے پاس
ہے' اُس کو بہت سمجھتے ہیں۔ نتیجہ یہ کہ خود پسندی میں مبتلا ہو کر
جاہل رہ گئے ہیں۔ جو کچھ یہ جانتے ہیں اس کو بتانے میں
بخل کرنا اور غیر اقوام سے تو درکنار' خود اپنی ہی قوم کے نااہل
لوگوں سے بھی شدت کے ساتھ پوشیدہ رکھنا ان کی سرشت
میں داخل ہے۔ علاوہ ازیں ان لوگوں کے گمان میں بھی
نہیں کہ دنیا میں اُن کے شہروں کے سوا دوسرے شہر اور اُن
کے باشندے کے سوا کہیں اور بھی انسان بستے ہیں۔ یہ
حالت یہاں تک پہنچی ہوئی ہے کہ اگر اُن سے فارس و
خراسان کے علم اور اہلِ علم کا ذکر کیا جائے تو بتانے والے کو
جاہل سمجھیں گے اور مذکورہ بالا عیوب کی وجہ سے اس کو ہرگز
سچا نہیں مانیں گے' حالانکہ اگر یہ لوگ سفر کریں اور دوسرے
لوگوں سے میل جول رکھیں تو اپنی رائے سے باز آ جائیں''۔

(مگر یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے جبکہ شاستروں کے
قوانین کی رو سے ایسا ہندو جو سمندر کا سفر اختیار کرے' ہندو
مذہب ہی سے خارج ہو جاتا ہے۔ خود موہن داس کرم چند
گاندھی کے ساتھ بھی یہی پیش آیا۔ انگلستان سے واپس
آنے پر برادری نے مکمل بائیکاٹ کر دیا اور اُس وقت تک یہ
گناہ معاف نہ کیا جب تک بعض مضحکہ خیز رسومات کی
ادائیگی سے کفارہ کی صورت پیدا نہ ہو گئی۔)

پانچواں سبب: ''ہندوؤں اور ہم (مسلمانوں) میں بڑا
اختلاف یہ ہے کہ ہم آپس میں سب کو برابر سمجھتے ہیں اور صرف
تقویٰ کی بناء پر فضیلت دیتے ہیں۔ یہ اختلاف ہندوؤں اور
مسلمانوں کے درمیان سب سے بڑی رکاوٹ ہے''۔

جہنم کی تعداد 88 ہزار:

البیرونی نے ہندو مسلم مغائرت کے اسباب بیان
کرنے کے بعد بعض دیگر انکشافات بھی کئے ہیں' جو ممکن
ہے کہ آج کی جمہوریت پسند' ترقی پسند' روشن خیال اور بالغ
نظر دنیا کے لئے پریشان کن ڈرامائی منظر پیدا کریں۔ مثلاً
ہندوؤں کے مذہب میں جرم و سزا کی جو کیفیت ہے' اُس
کے متعلق لکھا ہے:

''اپنی روایات کی بناء پر یہ لوگ جہنم کی تعداد' ان کی
صفات اور نام بہت زیادہ تعداد میں بیان کرتے ہیں اور ہر
گناہ کے لئے جہنم کا ایک خاص مقام قرار دیتے ہیں۔ ''بش

پران'' میں کہا گیا ہے کہ ان کی تعداد 88 ہزار ہے۔ مثال کے طور پر:

o تپت کند (اس دوزخ میں قاتل' سونا چرانے والا چور اور اُن کی صحبت میں رہنے والا شخص داخل ہوگا۔

o شول (اس دوزخ میں استاد کی تردید کرنے والا' بازار میں وید پڑھنے والا اور پُرانوں کی تجارت کرنے والا داخل ہوگا)

o لارپکش (تیر کمان بنانے والا)

o بشسن (تلوار اور چھڑی بنانے والا)

o روہراند (مرغیوں' بلیوں' بکریوں' چڑیوں اور سور کو پالنے اور موٹا کرنے والا)

o رودھر (کھیل تماشا کرنے والا' شعر باز اور کنواں کھودنے والا)

o مہتر ن (مکھی کے چھتے سے شہد نکالنے والا)

o اسپتر ن (درخت کاٹنے والا)

o سندشک (رسوم سے لاپروائی برتنے والا)

کھانا: ''اگر برہموں کی صف میں دو نا جنس اشخاص ہوں اور دونوں کی نشست قریب ہو تو دونوں کی نشست گاہوں کے درمیان کوئی تختہ یا کپڑا تان کر پردہ کر دیا جائے گا۔ بعض حالتوں میں اگر دونوں کے درمیان خط بھی کھینچ دیا جائے تو دونوں الگ الگ متصور ہوں گے۔ دو ساتھ ساتھ کھانے والوں میں سے اگر ایک شخص ایک برتن میں سے کچھ کھانا لے لے گا تو جو کچھ باقی بچے گا' دوسرے کے لئے حرام ہو جائے گا''۔

وید: ''ہندو وید کو برہما کے منہ سے نکلا ہوا کلام سمجھتے ہیں اور برہمن بغیر مطلب سمجھے ہوئے اس کی تلاوت کرتے ہیں۔ کھشتری کو وید پڑھنے کی اجازت نہیں۔ ویش اور شودر کے لئے اس کا سننا بھی ممنوع ہے' چہ جائیکہ پڑھنا اور زبان سے ادا کرنا۔ اگر جرم ثابت ہو جائے تو برہمن اس کو حاکم کے حوالے کرے گا اور وہ زبان کاٹ دینے کی سزا دے گا۔ اُن کے عقیدے کے مطابق جس وقت یہ زمین غرق کر دی جائے گی' وید زمین کے سب سے نچلے طبقے میں چلے جائیں گے اور مچھلی کے سوا دوسرا کوئی اس کو نکال نہیں سکے گا۔ سور زمین کو اپنے دانتوں سے اٹھا کر پانی سے نکالے گا''۔

خالدہ ادیب خانم

خالدہ جدید ترکیہ کی ایک نامور ادبی و سیاسی شخصیت ہیں۔ 1935ء میں ڈاکٹر مختار احمد انصاری کی دعوت پر ہندوستان آئیں اور جنوری اور فروری میں جامعہ ملیہ' دہلی میں آٹھ لیکچر دیئے۔ ہر لیکچر کی صدارت ملک کے ممتاز رہنما کرتے تھے۔ علامہ اقبال اور گاندھی جی نے بھی ایک ایک جلسے کی صدارت کی۔ انہوں نے لاہور' پشاور' لکھنؤ' بنارس' کلکتہ' حیدر آباد دکن اور بمبئی کی سیاحت بھی کی۔ ہندوستان سے واپسی پر استنبول یونیورسٹی میں انگریزی زبان کی پروفیسر مقرر ہوئیں۔ 1950ء میں ترکی کی پارلیمنٹ کی رکن منتخب ہوگئیں۔ مئی 1964ء میں انتقال ہوا۔ ہندوستان کا سفرنامہ Inside India کے نام سے لکھا جس کا اردو ترجمہ ''اندرونِ ہند'' چھپا۔ اس سفرنامے میں انہوں نے ہندو مذہب اور ہندوؤں کے جو چشم دید حالات رقم کئے' وہ ہمارے لئے چشم کشا ہیں۔

''میں نے فیصلہ کیا کہ ہندوستان میں جو کچھ مشاہدہ کروں گی' اپنی طبیعت کو بے لاگ رہنے دوں گی۔ کسے خبر' شاید میں اس باب میں کوئی کام کی بات قلم بند کر جاؤں۔ بیسویں صدی کے ہندوستان نے مجھے بھی اُسی قدر متاثر کیا' جس قدر کہ البیرونی کو دسویں صدی کے ہندوستان نے کیا تھا' اور میں نے چاہا کہ اپنے ''زمانے کے ہندوستان کا حال بھی اُسی قدر سچائی اور غیر جانب داری کے ساتھ لکھ جاؤں' جیسا کہ البیرونی اپنے زمانے میں لکھ گیا ہے۔

''راقمہ کی نظر میں ہندومت ایک بہت بڑی نامرتب قوت ہے' جس کی بے شمار سوئڈیں ہیں اور زندگی اور خیالات کی جس شکل میں بھی اُن کی رسائی ہے' اُن کو وہ چوس رہی ہیں' لیکن یہ بے ترتیبی حسی نہیں' بلکہ معنوی ہے' کیونکہ جونہی کوئی چیز ہندو دائرہ اثر میں آ جاتی ہے' اُسے ہندو چار خانے میں ایک خاص مقام دے کر بن لیا جاتا ہے۔ اسی کا نتیجہ ہے کہ ہندو کی زندگی شدید پابندیوں کا نظام ہے اور اس کی ذہنیت میں عجیب و غریب ابہام پایا جاتا ہے۔ کسی انسانی جماعت میں آدمی کو ایسے افراد نہیں مل سکتے جن کی طبیعت میں ایسی غیر محدود آزادی ہو' لیکن اس کے ساتھ ساتھ نہایت جزئی قواعد کی ایسی سخت پابندی کے ساتھ زندگی گزار رہے ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ ایک ہندو رہنما کا تصورِ الوہیت اپنے عہد کے خیالات سے ایک ہزار سال آگے ہو اور دوسرا ہندو ایسا ملے جس کا تصورِ کائنات ایسا قدیمی اور ابتدائی ہو جیسے قدیم ترین جنگلی انسان کا۔ بایں ہمہ یہ دونوں ہندو جو ذہنی نشوونما میں اس درجہ تفاوت رکھتے ہیں' ہرگز گوارا نہ کریں گے کہ ہندومت نے ان کی ذاتوں کے لئے جو قاعدے ضابطے بنا دیئے ہیں' اُن سے تجاوز کیا جائے''۔

ہندو مذہب کی لچک:

وہ نئی قوتیں جن سے اندیشہ تھا کہ ہندومت کے اس جامد نظام کو درہم برہم کر ڈالیں گی' انہیں اس ہندو مذہب کی باطنی لچک نے ہمیشہ اپنا لیا ہے۔ اس کا طریق کار یہ رہا ہے کہ افکار کے نئے جراثیم کی خود پیکاری لے لے اور اس طرح اپنے جسم کو زیادہ متاثر ہونے سے محفوظ رکھے۔ فرض کیجئے کہ یہ نئی طاقت کوئی مذہب ہے تو اس صورت میں ہندومت اُس کے خداؤں کو اپنی دیوبانی میں جگہ دے دے گا۔ فرض کیجئے کہ کوئی اجتماعی یا اقتصادی نظریہ ہے' تو اُسے ہندو فلسفہ اپنے نظام زندگی میں فرق آئے بغیر جذب کر لے گا۔

بدھ مت کا حشر:

اس انجذاب کی شاید سب سے عبرت آموز مثال بدھ مت کا حشر ہے۔ اس کی جنم بھومی ہندوستان تھا اور یہیں اس کی نشوونما انتہائی مدارج تک پہنچی۔ لیکن بالآخر ہندومت نے' اس میں سے جتنا کچھ حاصل کر سکتا تھا' جذب کر لیا اور باقی کو ہندوستان سے اس طرح خارج کر دیا کہ اب وہ بالکل جداگانہ چیز رہ گیا اور ہندومت اس سے محفوظ و مامون ہے۔ ان دونوں مذہبوں کے درمیان جو تنازعہ تھا' وہ بھی ایسے ہی یاد رکھنے کے لائق ہے' جیسے ہندومت کی آخری فتح کیونکہ اس تنازعے کی نوعیت سے بھی ہندومت کے سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ دراصل بدھ مت کو اصرار تھا کہ اپنی شریعت کو عامۃ الناس کی زندگی کے قریب لے آئے۔ ہندومت کو ایسی یکسانی پیدا کرنے والی شریعت گوارا نہ تھی' جس سے ذات پات کے نظام میں خلل واقع ہو۔ بدھ مت ذات بندی کے خلاف ہے' لیکن پیشے کے لحاظ سے تقسیم کو جائز رکھتا ہے' اس حد تک کہ اس کا اقتصادی نظام اہلِ حرفہ کی جماعت بندی کی بنیاد بنایا جا سکتا ہے۔ لہٰذا ہندومت میں جو ذاتیں پہلے سے موجود تھیں' ان ہی میں پیشے کی ذاتیں بڑھا لیں اور اپنے نظام کو توڑے بغیر بدھ مت کی اقتصادی ساخت اختیار کر لی''۔

اسلام سے نبرد آزمائی

''ہندومت کو توڑنے پھوڑنے والی دوسری قوت اسلام ہے۔ ہندومت کی سوئڈیں دوبارہ آگے بڑھیں اور جس حد تک جذب کر سکتی تھیں' اسلام کا مادہ اپنے جسم میں داخل کر لیا۔ اگرچہ یہ انجذاب اتنا کافی نہ تھا کہ اسے بالکل مامون و محفوظ کر دے اور جو کچھ بھی ہو' مگر اللہ اور محمدؐ ہندو دیوبانی میں نہ سما سکتے تھے نہ سمانا چاہتے تھے۔ پھر اسلام کے اقتصادی اور اجتماعی اصول' قومی نظام میں کسی قسم کی بھی تفریق و تقسیم کی اجازت نہ دیتے تھے۔ ایک اسلامی اصول' جس میں کسی قسم کا تغیر و ترمیم و کمی ممکن نہیں' یہ ہے کہ اپنی شریعت کو عامۃ الناس تک پہنچائے اور اسی کا نتیجہ تھا کہ اسلام کی آمد نے ہندو نظام کو جگہ جگہ سے بدلنا شروع کیا۔ سکھ تحریک اس کی ایک مثال ہے۔ پھر ہندو دنیا کے جس حصے کو اسلام بدل نہ سکا تھا' وہاں بھی بے دلی اور بے اطمینانی ضرور پیدا کر دی۔ اس لئے کہ اسلام ہندوستان پر مستقل سکونت کے لئے آیا تھا اور اپنی اصلیت کو چھوڑے بغیر ہندوستانی زندگی کا جز ہو گیا تھا۔ چنانچہ ہندوستان کے

اندر کشمکش پیدا ہوئی کہ اسلام اور ہندومت کے پہلو بہ پہلو رہنے کی کیا سبیل کی جائے۔ یہ پہلا موقع تھا کہ ہندومت ایک ایسی قوت سے دوچار ہوا جسے نہ جذب کرنا ممکن تھا نہ نکال باہر کرنا۔ ہندومت کو یہ عجیب طرح کی انقلاب انگیز صورت پیش آئی۔ اس کے معنی یہ تھے کہ اُسے ایک ایسی قوم کے ساتھ زندگی بسر کرنے کی تدبیر نکالنی پڑی جو ہندومت سے بالکل مختلف تصور پر مبنی تھی۔

یہ تدبیر کیا تھی؟ آیئے تاریخ کے مدارج سے اس کا کھوج لگائیں۔

مغلیہ عہد حکومت:

خالدہ ادیب خانم لکھتی ہیں: ''مغلیہ درباروں میں قصیدہ خوانی' حرم میں ہندو رانیوں کا داخلہ' مغل مزاج میں غیر محسوس دخل' مراعات کا حصول' نظامِ حکومت میں شرکت' صوبوں کی گورنری' افواجِ مغلیہ کی سپہ سالاری' مالیات پر تسلط' محلاتی معاملات میں مداخلت' سازش' غداری اور بغاوت' حیدر علی' ٹیپو سلطان اور سراج الدولہ کے خلاف انگریزوں کی امداد اور مسلم اقتدار کے خاتمے میں انگریزوں کے ساتھ تعاون''۔

انگریزوں کا عہد حکومت:

سرکاری دفتروں پر بلا شرکتِ غیرے قبضہ' نظامِ حکومت میں شرکت کے لئے انڈین کانگریس کا قیام' ہندوستانی واحد قومیت کی اجارہ داری' مخلوط انتخابات کی سازش' ہندو مسلم اتحاد کی فریب کاری' شدھی اور سنگھٹن تحریکوں کا اجراء' مسلم تہذیب کے وجود سے انکار' مسلم قومیت کی مخالفت' اردو کو مٹانے کے اقدام' مسلمانوں پر اقتصادی تسلط اور سیاسی غلبہ' تجارت ملازمت اور تعلیم کے شعبوں سے مسلمانوں کا اخراج' مسلم اقلیتوں پر بے پناہ مظالم' وارد ھا اسکیم کا ظہور' مسلمانوں کو مراعات دینے سے انکار' بہار کا قتلِ عام' ملک کے طول و عرض میں فسادات' پاکستان کی شدید مخالفت اور آخر وقت تک ہندو راج کے لئے جدوجہد۔ یہ ہے وہ تدبیر جو مغلیہ عہد سے لے کر پاکستان کے قیام تک' مسلمانوں کے ساتھ زندگی بسر کرنے کے سلسلے میں بروئے کار آتی رہی۔ یعنی پہلے مسلم اقتدار کو اپنی سازشوں سے متزلزل کیا اور پھر انگریز کی مدد سے اُسے کلی طور پر ختم کر دیا۔ اب ہندو مسلمان سے بھی مامون و محفوظ تھا اور بڑی بے فکری کے ساتھ عروج حاصل کرتا رہا' لیکن وہ آخر وقت تک اسلام کی اِن مخفی قوتوں سے بے پروا رہا' جس نے بعد میں چل کر مسلمانوں کی بیداری کو ہندو کے لئے پھر بے چینی کا سامان بنا دیا۔ اگر ہندو نے مسلمانوں کو پست کر کے یہ سمجھا کہ اس نے اسلام کو ختم کر دیا' تو یہ اُس کی سب سے بڑی تاریخی غلطی تھی' کیونکہ اصل قوت مسلمان نہیں' بلکہ خود اسلام ہے۔

مسیحیت سے کشمکش

اس کے بعد مسیحیت اور مغربیت کی باری آئی اور ہندومت کے لئے یہ مزید تخریب ساتھ لائے۔ اب ہندو مت کو ایک دوہری اُلجھن پیش آئی۔ اب تک وہ اندرونی چولیں بٹھانے میں مصروف تھا (جو اسلام کے نبرد آزمائی کرنے سے ڈھیلی پڑ گئی تھیں) لیکن اب بیرونی دنیا سے بھی اپنی مطابقت کرنی ضروری ہوئی۔ اس کا اپنا نظام' جو اسلام کے ارتباط سے پہلے ہی جا بجا سے تُرخ چکا اور پیوند زدہ ہو گیا تھا' اب اور بھی متزلزل ہونے لگا۔ اُنیسویں صدی میں ہندو مت کی مذہبی اور معاشرتی اصلاحات گویا اس بات کی کوشش تھی کہ رسمی تغیر کے بغیر ان جدید اثرات کو جذب کر لیا جائے۔ لیکن نتیجہ اس کے برخلاف یہ نکلا کہ شگاف اور زیادہ کھل گئے۔ ہندو قوم جو اب تک متحد تھی' گویا الگ الگ جزیروں میں کٹ گئی جن کے درمیان پُل باندھنے کی ضرورت پڑنے لگی۔ اس اثناء میں مغرب کے سیاسی نظریات یونیورسٹی تعلیم کے ذریعے پہنچے اور قومیت کا ایک جدید تصور لائے۔ سیاسی بیداری کی پہلی علامت ''انڈین نیشنل کانگریس'' کا افتتاح تھا۔ کیسی ہی تشنہ سہی' یہ پہلی کوشش تھی کہ پوری ہندوستانی قوم یا متحدہ ہندوستانی قومیت کی نمائندگی کی جائے۔

خالدہ ادیب خانم نے ہندو لیڈروں سے ملاقات کر کے ہندومت سے متعلق معلومات حاصل کیں۔ ہندوستان کی گزرگاہوں سے اس کا بچشم خود مشاہدہ بھی کیا' جہاں ہندو زندگی اپنی پوری گہما گہمی اور چہل پہل کے ساتھ رواں دواں ہے۔ مثلاً بمبئی کی ایک ہندو رقاصہ' بنارس کی سیر اور کلکتہ کا کالی مندر' یہ خانم صاحبہ کے جذبات و مشاہدات کے ایسے لطیف مرقع ہیں جو اپنی باطنی کیفیات کے لحاظ سے بھی اُن کے سفرنامے کو ایک ادبی شاہکار بناتے ہیں۔ آیئے اُن کی نظروں سے ہندو زندگی اور ہندو تہذیب و مذہب کے نقوش کا تماشا کریں۔

بنارس کی سیر

''منڈی میں جس قدر آدمی پھر رہے تھے' اُسی قدر گائیں ہوں گی' لیکن بہ یک نظر معلوم ہو جاتا تھا کہ یہ گائیں اعلیٰ طبقے کی رہرو اور شاہی امتیاز رکھتی ہیں۔ وہ کسی سبزی کی دکان کے سامنے رُک جاتیں اور جو ترکاری انہیں پسند آتی' چبانے لگتیں۔ کسی کی مجال نہ تھی کہ اُنہیں بھگا دے۔ اس کے برعکس لوگ ادب سے ایک طرف کھڑے ہو جاتے اور انہیں گزرنے دیتے۔

''ہم ایک کھلی ہوئی ڈھلان پر پہنچے۔ ایک چھوٹا سا بچھڑا بہت ہی پیارے بادامی رنگ کا' بی بیانہ گردن میں سفید ہار پڑا ہوا' وہاں کھڑا ہے۔ نرم بھوری بھوری آنکھیں حیرت سے اس ہجوم کو دیکھ رہی ہیں جو گرداگرد جمع ہے۔ اس کا پیٹ بھرا ہوا ہے کہ اس کے پرستار جو تازہ گھاس پیش کر رہے ہیں' وہ اسے چھونے پر بھی مائل نہیں ہوتا۔ ایک آدمی قریب کھڑا ہے اور بازوؤں کو حرکت دے دے کر اس پیارے ننھے بچھڑے ''دیوتا'' کے اوصاف و کرامات بیان کر رہا ہے۔

''گنگا کے سارے کنارے پر چھوٹی چھوٹی ٹولیاں ہیں۔ یہ بھی مسلسل حرکت میں معلوم ہوتی ہیں۔ خود نہا رہے ہیں یا برتن بھانڈے مقدس پانی میں دھو رہے ہیں۔ لکڑی کی سینکڑوں ڈھیریاں لگی ہوئی ہیں۔ یہ چتائیں ہیں۔ سفید کپڑے سے ڈھکی ہوئی لاشیں اُن کے پاس یا اوپر دھری ہیں۔ بعض لاشیں بہت ہی چھریری اور اس قدر کم عمروں کی ہیں کہ ترس آتا ہے اور بعض بہت بھاری بڈھوں کی۔ اُن کے رشتہ دار گھبرائے ہوئے پھر رہے ہیں کہ تھوڑی دیر میں اُن کے عزیز راکھ ہو جائیں گے اور گنگا میں بہا دیئے جائیں گے۔ کنارے کنارے تختوں سے بندھے ہوئے بیڑے ہیں جن میں ایک ایک آدمی یا پورے پورے کنبے بیڑے کے سائز کی مناسبت سے نہا رہے ہیں۔ سب نہائے چلے جا رہے ہیں۔ ڈبکی کھاتے اور سر نکالتے ہیں۔ انہی بیڑوں کے بیچ میں شہر کا گندا نالا' میلا' غلیظ' گھناؤنا پانی دریا میں آ کر گرتا ہے۔ مجھے حیرت ہوئی کہ ہیضہ' تپ محرقہ یا اسی قسم کی وبا کیوں نہیں پھیل جاتی۔

وشنو کا مندر

''بنارس کا سب سے بڑا مندر وشنو کا مندر ہے۔ اندر سے بیچ در بیچ' سنگ مرمر کی چوکیاں اور طمع کئے ہوئے پیپل پایوں پر ستونوں کی کثرت نے عجیب حصے در حصے کاٹ دیئے ہیں اور چھتیں بھی انوکھی وضع کی ہیں۔ دیوتا کے سامنے ایک طمع کی ہوئی جالی ہے اور دیوی دیوتاؤں کی مورتیں ہر جگہ پھولوں کے انبار میں ڈھکی ہوئی ہیں۔ سینکڑوں مرد اور عورتیں طواف کر رہے ہیں اور پھول پھینکتے یا باتیں کرتے جا رہے ہیں۔ بعض چہروں پر وجد کی ایسی کیفیت نظر آتی ہے' جیسے کسی جذباتی یا اعصابی تشنج کی کیفیت میں۔ اُن کی حرکات و سکنات اور چہروں سے ان کے محسوسات کو سمجھنا دشوار ہے۔ بڑے زور کی گونج سنائی دیتی ہے جیسے مہال کے چھتے میں یا کسی ترکی حمام میں جب وہ بہت بھرا ہوا ہو۔ پجاریوں کے سانسوں سے بھی بخارات کی ویسی ہی ہوا تیار ہوتی ہے اور تھوڑی دیر کے بعد یہ لوگ عالمِ خواب کا دھندلا دھندلا گروہ بن جاتے ہیں' جو ناقابل

شناخت اور مسلسل حرکت میں ہے۔

''یہاں کی سب عمارتیں چھوٹے چھوٹے مندر ہیں' جن میں اکثر ''حیوان دیوتاؤں'' کے نام پر وقف ہیں۔ قریب قریب سارا جنگل خدا بنا دیا گیا ہے۔ (مطلب یہ کہ جنگل کا ہر جانور کسی نہ کسی دیوتا کے روپ میں ظاہر ہے) ان بتوں پر ہار پڑے ہیں اور ان کے استھان پھولوں سے بھرے پڑے ہیں۔ خود عمارتیں عجیب عجیب کھلونے معلوم ہوتی ہیں۔ سب سے مانوس اور نہایت خوش مزاج ہاتھی دیوتا ہیں۔ یہ اپنے پچھے کے بل بیٹھتے ہیں۔ سونڈ ایک طرف کر رکھی ہے اور سر پر ہار لپٹا ہوا ہے۔ آنکھوں سے ہوشمندی ظاہر ہے اور معلوم ہوتا ہے کہ مزا لے رہے ہیں۔

''ہر شخص نے خدا کے پیرائے میں ایک ایک چیز کا تصور کیا' جو اُس کی مصیبتوں میں کام آئے اور ظاہر ہے کہ آدمی کی مصیبتیں بے شمار اور نہایت مختلف ہیں۔ ان میں پُر جوش صورت پرستی اور اس کے ساتھ بدوی تخیل کی کیفیت ہے۔ آدمی جس طرح دنیا میں آمد کے وقت تھا' اسی طرح اب بھی مانوس اشیاء کو پوجنے میں کوشاں ہے اور ہندوستان میں جنگل (یعنی جنگلی جانوروں) سے زیادہ مانوس چیز کیا ہوگی۔

''بنارس کے منظر دیکھ کر خیال کے عجیب سلسلے نے مجھے وہ تمثیل یاد دلا دی جو میں نے لڑکپن میں پڑھی تھی۔ اس کا نام ''عقیدہ'' تھا اور یہ قدیم مصر کا ایک قصہ تھا۔ قصے کا ہیرو خالص صداقت کا پُر جوش دلدادہ تھا اور جو فریب اور ریاکاری کی جملہ صورتوں کو نیست و نابود کرنے نکلا تھا۔ اُسے سب سے بڑی ریاکاری وہ مذہب نظر آیا جس کی مصری مہنت عوام کو تعلیم دیتے تھے اور جو اُن کی جہالت و ضعیف الاعتقادی سے فائدہ اٹھا کر محض حرص اور حب جاہ کی خاطر یہ جعل سازیاں کرتے تھے۔ بڑے مہنت نے اُسے یہ سمجھانے کی کوشش کی کہ خود لوگوں کے دل میں دنیاوی عیش واقتدار کی جو ہوس بھری ہے' وہ بھی بت پرستی کو قائم رکھنے کا کچھ نہ کچھ سبب ضرور ہے۔ چنانچہ یہ مہنت صداقت کے دلدادہ ہیرو کو مندر میں لے گیا اور اُس دیوی کے پیچھے بٹھا دیا جو سال میں ایک دفعہ سر ہلاتی تھی اور جس کا یہ معجزہ روحانی قوت کا ثبوت سمجھا جاتا تھا۔ ظاہر ہے کہ یہ کارستانی مہنت کی تھی کہ وہ ایک ڈوری ہلا کر دیوی کے سر کو جنبش دلاتا تھا۔ اب ہیرو نے یہ کیفیت دیکھی اور لوگوں کو دعائیں مانگتے' گڑگڑاتے سنا۔ بڑے مہنت نے اس سے کہا کہ ڈوری ہلاؤ' تاکہ یہ فریب عظیم قائم رہے' اور اگر نہیں ہلاؤ گے تو معجزہ واقع نہ ہوگا اور عقیدہ ختم ہو جائے گا۔ مندر میں جو لوگ آئے وہ بہت مجبور' بے کس' بے بس' لنگڑے لولے' اندھے' شکستہ دل اور مصیبت زدہ تھے۔ ان کی چیخوں اور آہوں سے مندر گونج اٹھا اور ہیرو کو دیوی کے عقب سے اندھوں کے حلقۂ چشم کے کرب و اذیت کا مشاہدہ ہوا اور اس کی آہ و بکا سنی کہ دیوی کا اشارہ ہو جائے' جس سے وہ اپنی زندگی کے مصائب اور دکھوں کا بوجھ برداشت کر سکیں۔ انفرادی اور اجتماعی انسانی تکلیفوں اور مصائب کا یہ دل خراش منظر اس قدر پُر اثر تھا کہ ہیرو نے ڈوری کھینچ لی اور دیوی نے اپنا سر ہلا دیا۔''

اسلام ہضم کیوں نہ ہو سکا؟

خالدہ ادیب خانم انتشار و ابہام کی ان بھول بھلیوں سے نکل کر اب ایک کشادہ صحن میں داخل ہوتی ہیں' جہاں ہمسایہ قوم (مسلمان) کے افراد ترتیب و تنظیم کی عمدہ قابلیت کے ساتھ صف بہ صف جمع تھے۔ یہ لوگ موصوفہ کی تقریر سننے کے لئے آئے تھے۔ ہندو مت اپنی ساحرانہ صلاحیتوں کے باوجود اسلام کو ہضم یا خارج کیوں نہ کر سکا؟ اس کا واضح جواب اس پُر شکوہ اور پُر وقار مجمع کے یہ لوگ تھے جو بنارس جیسے ہندو مذہب و تہذیب کے بہت بڑے مرکز میں محصور' اسلام کی سادہ اور صاف ستھری زندگی کے بے داغ دامن کو صدیوں سے بدستور تھامے ہوئے تھے۔

خانم صاحبہ اس اجتماع کے بارے میں "Inside India" میں لکھتی ہیں:

''یہ سو ڈیڑھ سو آدمی ہوں گے۔ اکثر غریب کاریگر اور تجارت پیشہ۔ سیدھے سادے' شرمیلے' منکسر المزاج' جیسے سب غریب لوگ ہوا کرتے ہیں' مگر لاشعوری طور پر خودداری لئے ہوئے۔ سب کا لباس غریبانہ تھا اور سب کے چہروں پر غریب الوطنی اور کچھ ایسی اداسی تھی جو بیان میں نہیں آ سکتی۔ ان میں وہ متانت' شرافت' ثقاہت اور شدت تاثر پائی جاتی تھی کہ سارے ماحول اور خود ہم پر بھی اس کا رنگ چھا گیا۔ بنارس میں مجھے یہ پہلا مجمع ملا' جس میں نہ جذبات کا غلبہ تھا' نہ میلے ٹھیلے کی نتی رونق اور چہل پہل' اور اسی لئے ان کی غربت اور اداسی دیکھ کر ترس آتا تھا۔ اس کے باوجود ان سب میں وہی پیوستگی اور واضح حد بندی نمایاں تھی جو ہندوستانی مسلمانوں میں عام طور پر نظر آتی ہے۔ میں نے سوچا' بھگت کبیر کی طرح ان لوگوں نے بھی گنگا کے پانی کو بے کار اور پتھر کی بے جان مورتیوں کو بے فیض پایا ہے۔ ان کا خدا تصور و روح کا خدا تھا جسے پتھر کی صورتوں میں ظاہر نہیں کیا جا سکتا۔ یہ ایک ناقابل تغیر قانون ارتقا نافذ کرنے والا خدا تھا جو ہر ہستی کو اپنے مقرر کئے ہوئے صحیح وقت پر حد کمال کو پہنچاتا ہے۔ وہ اس کا اظہار کر سکتے ہوں یا نہیں' یہ تخیل ان کے مذہب کا جزو ترکیبی تھا' اور اس کی روح ان کی آنکھوں اور ان کی ذات میں موجود تھی۔ بنارس کے مذہبی میلے کی خوشیاں' ذاتی عیش و راحت کی کیفیت اس اجتماع میں مطلق نہ تھیں۔ میں نے اپنے دل میں ان کے لئے بے انتہا احترام محسوس کیا۔ میرے تصور میں یہ بات کچھ بھی نامناسب و ناممکن نہ تھی کہ یہ لوگ مہاتما گاندھی کے مکان کے سامنے کھلے میدان میں اور خدا کے اپنے چراغوں کے نیچے اور خدا کی اپنی دنیا کے مندر میں نمازیں پڑھتے ہوں' انسان کی بنائی ہوئی کوئی شبیہہ یا مورت یا بت یا علامت سامنے نہ ہو' لیکن خود اپنے دلوں میں اس روح الارواح تک پہنچنے کی لو لگی ہوئی ہو' مگر وہ اس سے بھی مستغنی تھے کہ کوئی مذہبی پیشوا انہیں بتائے کہ اِس خدا کی یا اُس خدا کی پرستش کریں۔ انہیں کسی واسطے اور کسی وسیلے کی ضرورت نہ تھی۔ ہر آدمی' آدمی کے برابر ہے۔ اس لئے وہ آزاد ہے اور کسی پیر پروہت کی بنائی ہوئی صورت کے آگے نہیں جھکے گا۔ مانا کہ آدمی کی بنائی ہوئی انسانی یا دوسری مورتیوں کو نہ ماننے سے یہ لوگ الگ ہو گئے اور بے مونس و بے رفیق رہ گئے۔ اس کے باوجود یہ اپنے مسلک پر جمے رہے اور انہوں نے حق کے سوا کسی دوسری شے میں سکون و اطمینان ڈھونڈنے سے انکار کر دیا۔ اگرچہ یہ حق پرستی ظاہری راحت و مسرت سے خالی کیوں نہ ہو۔ یہ اسی واحد و نادیدہ ہستی کے خیال پر ایک ہزار برس تک برابر قائم رہے' حالانکہ ان کے چاروں طرف مندروں کی دھوم دھام اور انسانی شکل و صورت کے زرق برق دیوتاؤں کا مجمع تھا۔ اس خاموش اجتماع نے مجھے حق کا وہ پیغام دیا جو زندگی میں خواہ ہم اسے کسی نام سے پکاریں' ہم سب کا رہنما ہونا چاہئے۔

''میں نے اپنے دل سے سوال کیا کہ کیا وجہ ہے کہ ہندومت' غیر حاضر کو جذب یا خارج کر دینے کی ساحرانہ صلاحیت کے باوجود اسلام کو نہ ہضم کر سکا اور نہ خارج کر سکا ہے؟ میرے اس سوال کا جواب ان غریب لوگوں کے چہروں میں تھا جو اس اجتماع میں شامل تھے۔''

بمبئی کی ہندو رقاصہ

خالدہ ادیب خانم نے لکھا: ''کمرے کے وسط میں جہاں سے قالین اسی غرض سے ہٹا دیئے گئے تھے۔ اس نے ناچنا شروع کیا۔ رخساروں کے پاس کھڑتالوں کی باقاعدہ جھنکار بھی دوسرے سازوں کے ساتھ مل گئی تھی اور ان کی تال سم پر بدن باقاعدہ جنبش کرتا تھا۔ لوگوں نے مجھے بتایا کہ وہ رقص ایک مذہبی مفہوم رکھتا ہے۔ یہاں ہر چیز میں' حتیٰ کہ جنسی جذبات کے اظہار میں بھی مذہب معنوی وجود رکھتا ہے۔ اس کا رقص ایک حد تک انہی جذبات کا اظہار کرتا تھا۔ وہ ایک ہندو دیومالائی کہانی کا کمال دکھا رہی تھی' جس میں کرشنا' جو ہندوؤں کے بڑے اوتار ہیں' ایک گوالن کا تعاقب کر رہے ہیں۔ رخسار جنبش کرتے تھے اور ان کے گرد کھڑتال کی جھنکار میں نغمہ اور ترنم بڑھتا جاتا تھا۔ مجھے تو

انجمن خدام القرآن سندھ، کراچی کی کاوشیں

کیسٹ کلب اسکیم

قرآن وحدیث کی روشنی میں حالاتِ حاضرہ پر ایمان افروز تبصرے کے ساتھ خطابِ جمعہ کا کیسٹ ہر ہفتہ آپ کے گھر پہنچانے کی اسکیم

سالانہ ممبرشپ فیس: 500 روپے

آسان عربی گرامر ویڈیو کیسٹس/VCDs

گھر بیٹھ کر عربی گرامر کے قواعد سیکھیے یا کسی بھی مقام پر عربی گرامر کلاسز منعقد کیجیے۔
مکمل عربی گرامر کی تدریس
28 ویڈیو کیسٹس/84 VCDs
میں دستیاب ہے

"قواعدِ تجوید ویڈیو کیسٹ"

قرآنِ حکیم کی درست تلاوت کے لئے قواعدِ تجوید کا علم ضروری ہے۔
"قواعدِ تجوید" کے موضوع پر کتابچہ کی تدریس ایک ماہرِ فن استاد کے تعاون سے ویڈیو ریکارڈنگ ایک ہی ویڈیو کیسٹ میں دستیاب ہے۔

سود

[illegible] اشکالات

ایک مختصر لیکن نہایت جامع اور مفید کتاب جس میں قرآن وحدیث کی روشنی میں سود سے متعلق تمام ضروری و بنیادی معلومات اور اعتراضات کے مدلل جوابات شامل کیے گئے ہیں۔

منتخب نصاب

حصہ اوّل تا سوم

نکات برائے درس و تدریس
دینِ اسلام اور اس کے تقاضوں کے فہم کے لئے منتخب نصابِ قرآنی کی درس وتدریس انتہائی مفید ہے۔
نکات کی صورت میں آیات کا لفظی ترجمہ، تمہیدی وتفسیری تفاصیل موضوع سے متعلق قرآنِ کریم کی دیگر
آیات واحادیث کے حوالہ جات

چہرے کا پردہ

علماء ومشائخ، مفکرین اور ادباء کے مستند مضامین کا ایک گراں قدر مجموعہ
قرآن وسنت کی روشنی میں شرعی پردے کے احکامات، ان احکامات کی حکمت، چہرے کے پردے کے لئے دلائل، اُمت کا متواتر عمل اور اس حوالے سے اشکالات واعتراضات کے جوابات کتابی صورت میں

اہم دینی موضوعات

☆ اسلام مذہب ہے یا دین؟
☆ دینِ اسلام پر عمل کیسے کریں؟
☆ جہاد فی سبیل اللہ
☆ نبی اکرم ﷺ نے دین کیسے غالب کیا؟
☆ اسلام میں اجتماعیت کی اہمیت اور اساس

نکات برائے درس وتدریس کتابی صورت میں

ایک سالہ قرآن فہمی کورس

دنیا اور آخرت کی کامیابی کے حصول کے لئے دینی وجدید علوم کا سیکھنا ضروری ہے۔
جدید تعلیم یافتہ حضرات وخواتین کو قواعدِ تجوید، عربی گرامر، ترجمہ وتفسیرِ قرآن و حدیث اور دینی وتحریکی لٹریچر کی تعلیم کا اہتمام باصلاحیت اساتذہ کے زیرِ نگرانی۔

آغاز ہر سال رمضان المبارک کے بعد

لائبریریز اور مکتبہ جات کے پتے

1- 11۔ داؤد منزل، نزد فریسکو سویٹ، آرام باغ
2- حق اسکوائر، عقب اشفاق میموریل ہسپتال، یونیورسٹی روڈ، گلشن اقبال
3- قرآن مرکز، نزد مسجد طیبہ، سیکٹر 35/A، کورنگی نمبر 4
4- فلیٹ نمبر 2، محمدی منزل، بلاک "K"، نارتھ ناظم آباد
5- C-113، نادام اپارٹمنٹس، نزد چھوٹا گیٹ، ایئرپورٹ
6- قرآن اکیڈمی، یٰسین آباد، فیڈرل بی ایریا
7- متصل محمدی آٹوز، اسلام چوک، سیکٹر 111/2، اورنگی ٹاؤن
8- رضوان سوسائٹی، بس اسٹاپ، یونیورسٹی روڈ

قرآن اکیڈمی، DM-55، خیابانِ راحت، درخشاں، ڈیفنس فیز 6، کراچی

فون 5340022-23 فیکس 5840009 ای میل: karachi@quranacademy.com ویب سائٹ: www.quranacademy.com

کرشن مہاراج ایسے ہی بے وفا شوہر اور ہرجائی عاشق نظر آئے' جیسے زیوس دیوتا۔ اپنے یونانی ہم صفیر کی طرح کرشن بھی ارضی لذتوں کا مزا لینا چاہتے تھے' اور معلوم ہوتا ہے کہ عاشق کے لئے سیدھی سادی عورتوں میں دیویوں سے کچھ بڑھ کر دل ربائی تھی۔ رقص جاری رہا۔ کرشن مہاراج پیچھا کر رہے ہیں۔ ان کے جوش اور کوشش میں کمی نہیں آتی اور گوالن بھی اسی طرح گریز پائی' لگاوٹ اور دعوت بوس و کنار دیئے جاتی ہے۔ مجھے یہ سب کچھ ان قدیم یونانی تصویروں کے مشابہ نظر آیا جن میں زیوس دیوتا کے عشق اور ناچ دکھائے گئے ہیں لیکن اگر یہ بات میں کسی ہندو دوست سے کہتی تو اس کا جواب یہی ہوتا ''آپ سمجھتی نہیں' یہ سب استعارے ہیں۔''

کلکتے کا کالی مندر

''چڑیا گھر میں بنگالے کا سیاہ ببر شیر یا کالی کا مندر؟ میں نے سوچا کہ کالے ببر شیر تو دوسرے چڑیا گھروں میں بھی مل سکتے ہیں' مگر کالی کا مندر اور کہیں نہیں ہے۔ لہٰذا میں نے اسی کے حق میں فیصلہ کیا۔ دوسرے کالی مندر کو چھوڑ دینے کا مطلب یہ تھا کہ ہندوستانی نفسیات کا ایک خاص پہلو نظر انداز ہو جائے۔ کالی دیوی کے تین سر ہیں' لیکن یہ آدمی کے مزاج کی تین کیفیتوں اور بہت سی خواہشوں پر تسلط رکھتی ہے۔ جس طرح انسان میں نر کی نسبت مادہ زیادہ مہلک ہے' اسی طرح دیوتاؤں کی نسل میں یہ دیوی سب سے بڑھ کر خونخوار ہے۔ دیوی ماتا ہونے کے باوجود وہ مطلق رحم دل ہستی نہیں ہے' کیونکہ وہ خون' قربانی حتی کہ انسانی قربانی کی طالب ہے۔ وہ انارکسٹ جو جان لیتے ہیں اور دہشت گرد جو بذریعہ تشدد اپنے سیاسی مقاصد حاصل کرنے کی تدبیر کرتے ہیں' انہیں کالی دیوی سے سند جواز ملتی ہے۔ پیشہ ور ڈاکو خونی' ٹھگ اور سیاسی قزاق سب کالی کو اپنی مربیہ سمجھتے ہیں جو اسے انسانی قربانیاں دیتے ہیں۔

''جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہندو صرف امن و محبت کے جذبات رکھتا ہے اور مارے مرجانے کی قابلیت سے عاری ہے' وہ غلطی پر ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ وہ ظلم و قانون شکنی تک ہر چیز کا مذہبی جواز ڈھونڈتا ہے۔ کالی اس چیز کو پورا کرتی ہے۔ جس وقت گاؤ حوروں (مسلمانوں) کو ہندو قتل کرتے ہیں تو گویا ان دیوتاؤں کا بدلہ لیتے ہیں' جو نہیں چاہتے کہ جانوروں کا خون کیا جائے' لیکن اسی کے ساتھ وہ کالی کو بھی جو انسانی قربانی چاہتے ہیں' خوش کرتے ہیں۔''

''مندر کے آس پاس گداگری کا پیشہ کمال فن اور انتہائی تکمیل تک پہنچ گیا ہے۔ اندھے' لنگڑے' لولے' نیم برہنہ' لنجے' آپ کے لباس یا کوٹ کو اس طرح پکڑتے ہیں جیسے گدھ کے پنجے۔ ان کی بیماریاں اکثر بناوٹی ہوتی ہیں' لیکن اس کمال کے ساتھ کہ ناٹک کے اداکاروں کو بہروپ بھرنے کے فن میں ان سے سبق لینا چاہئے۔ ان گداگروں کی فوج نے مجھ پر بھی حملہ کیا۔ ان کے نزدیک دیوی کا ہر زائر رحم دلی اور خدا ترسی کے جذبات میں سرشار ہوتا ہے۔ (حالانکہ کالی دیوی ان سے بالکل متضاد جذبات کی طالب ہے) لہٰذا ہر گداگر چاہتا تھا کہ ان جذبات سے اپنا کام نکالنے میں دوسرے پر بازی لے جائے۔ یہ مجمع آدمی کے اعتقاد کی کمزوری سے یا بلامشقت مادی یا اخلاقی فوائد حاصل کر لینے کی ہوس سے کام لے کر اپنا الو سیدھا کرنا چاہتا ہے۔

''یہاں پھلوں اور پھولوں کی دکانیں بھی ہیں۔ وہ دیوی بھی جو خون پی کر جیتی ہے' پھولوں کے بغیر نہیں رہ سکتی۔ یہ ہندو فطرت کا ایک ناگزیر شعبہ ہے۔ صحن کے وسط میں ایک چوکور چبوترہ تھا اور اس کے نیچے سنگ مرمر کے فرش پر بڑے بڑے عالم فاضل اور مقدس ہندو بیٹھے ہوئے مطالعہ یا مراقبہ کر رہے تھے۔ چبوترے کے سامنے خود وہ مندر تھا جس میں کالی دیوی براجمان تھی اور اس کے تینوں سر پھولوں سے ڈھکے ہوئے تھے۔ پوجا کرنے والے اس کے سامنے جنگلے سے لپٹے ہوئے تھے اور ایک عورت پیٹ کے بل رینگ رہی تھی۔ اس کا جسم اینٹھ رہا تھا اور منہ ہی منہ میں دیوی سے گڑگڑا کر کوئی مراد مانگ رہی تھی۔ چبوترے کے عقب میں قربان گاہ تھی۔ یہاں پتھر کے فرش پر خون کے دھبے پڑے تھے..... میں نے اپنے دل میں کہا: ''کالی دل سے معراد دماغ کے غلیے کا نام ہے۔ جب دماغ دل کی رفاقت سے جدا ہو جائے تو ہمارا سب سے مہلک دشمن ہو جاتا ہے۔ خدا ہم سب کو زندگی کی اس بدترین شے یعنی دل سے بچھڑی ہوئی عقل سے محفوظ رکھے''۔

متحدہ قومیت

ہندوستان میں انگریزوں کی آمد سے مغرب کے نئے سیاسی نظریات کا بھی داخلہ ہوا اور ان میں سے ''قومیت'' کا تصور ہندومت کی مقصد برآری کے لئے سب سے زیادہ مفید تھا۔ تیسری طاقت کی موجودگی میں مسلمانوں کا کھلم کھلا استیصال کسی طرح ممکن نہ تھا اور نہ مسلمانوں کو ساتھ ملائے بغیر ہی انگریزوں کو ملک باہر کرنا آسان تھا' اس لئے قومیت کے اس نئے حربے سے ہندومت نے ایک کو نگلنے اور دوسرے کو ملک بدر کرنے کی بیک وقت کوششیں شروع کیں۔ اس سلسلے میں برہمو سماج اور آریہ سماج کی تحریکیں خاص طور پر قابل ذکر ہیں جو متحدہ قومیت یعنی ''ایک ہندوستانی قوم'' کے متعلق متضاد نظریے رکھتی تھیں۔ برہمو سماج تمام ہندوستانیوں کو' خواہ ان کا مذہب کوئی بھی ہو' جذب کرنا چاہتی تھی مگر آریہ سماج کا طریق کار اس سے مختلف تھا۔ وہ مختلف مذاہب رکھنے والے ہندوستانیوں کو شدھ کر کے ''ایک قومیت'' کی بنیاد رکھنے کی قائل تھی۔ دوسرے لفظوں میں احیائے ہندومت کی یہ دونوں تحریکیں ''متحدہ قومیت'' کے سہارے ایک نئی ہندو قوم کے خواب دیکھ رہی تھیں۔ خالدہ ادیب خانم نے ان تحریکوں کے بارے میں بھی اپنے تاثرات قلم بند کئے تھے۔ لکھتی ہیں:

''ہر چند برہمو سماج اور آریہ سماج دونوں ایک نئی ہندو قوم پیدا کرنا چاہتی تھیں' لیکن اس قوم کی شکل و نوعیت جو ان دونوں کے پیش نظر تھی' ایک دوسرے سے مختلف تھی۔ برہمو سماج اس لئے میدان میں آئی کہ تمام ہندوستانیوں کو' خواہ وہ کسی مذہب کے ہوں' متحد کرے۔ برہمو سماج کی یہ تحریک مذہبی' معاشرتی اور اصلاحی تھی' جس کا قوم پرستی (نیشنلزم) کی شکل میں عملی سیاست کی طرف رجحان بہت کم تھا' لیکن آریہ سماج مذہبی اور معاشرتی تنظیم کے ساتھ ساتھ سیاسی تحریک بھی تھی اور اس کی سیاست محدود اور تنگ نظری کی بنیاد پر تھی۔ وہ اسلام اور عیسائیت دونوں بیرونی مذاہب کو ہندوستان میں تفرقہ انگیز قوتیں سمجھ کر مٹا دینا چاہتی تھیں' مگر عیسائیت قلیل تعداد میں سہی' مٹائی نہ جا سکی' کیونکہ حکومت وقت کا یہی مذہب تھا' اور اسلام کی بیخ کنی بھی نہ ہو سکی' کیونکہ وہ سات کروڑ کا مذہب ہے اور بہت سے مسلمان اسی نسل کے ہیں' جس کے ہندو۔ دوسرے اسلام اپنی تہذیب رکھتا ہے جسے اس نے ہندوستان کو بھی سکھایا۔ پھر اگرچہ مسلمان کل آبادی کا پانچواں حصہ ہیں' لیکن وہ ایک پیوستہ قوم ہیں اور سرحد پر نہایت جنگجو انسان ہیں۔ مسلمانوں میں کوئی ذات پات بھی نہیں ہے کہ باہمی اتحاد میں مانع ہو۔ غرضیکہ دیانند سرسوتی کی قوم پرستی کسی وسیع معنی میں قوم پرستی بھی نہ رہ سکی۔ بلکہ صریحاً ایک محدود فرقہ واری تحریک ہو گئی۔ اس کے ساتھ وہ مسلسل اور اعلانیہ مسلمانوں کے مخالف رہی۔ مثال کے طور پر گئو رکھشا کی تحریک زرعی علاقوں میں مفید ہو سکتی تھی' لیکن جب اسے گائے کا گوشت کھانے والوں کے خلاف کھڑا کیا گیا تو ایک تفرقہ انگیز چیز بن گئی۔ اس نے ہندو مسلمانوں کے اختلاف کو اور وسیع کر دیا اور فرقہ واری بلووں میں زیادہ کشت و خون ہونے لگا' کیونکہ آریہ سماج برے آدمیوں کو مار ڈالنے کی قائل ہے اور مسلمان بھی انہی میں تھے جنہیں وہ برا سمجھتی ہے۔

''غرض ہندو مذہب کے اس نظریاتی تنازعے نے متحدہ قومیت کا خواب پورا نہ ہونے دیا اور ملک کی فضا فرقہ وارانہ کشیدگی سے اور زیادہ کثیف ہو گئی۔ اب چند ہوش مند آگے بڑھے اور انہوں نے سیاسیات کے فریبی پردے میں اس ادھورے کام کو پورا کرنا چاہا جسے برہمو سماج اور آریہ

سماج انجام دینے میں ناکام رہی تھیں۔ ڈاکٹر پٹا بھی ستیارامیہ جو مہاتما گاندھی کے منظور نظر ہونے کے علاوہ کانگرس کی مجلس عاملہ کے رکن اور آل انڈیا اسٹیٹس پیپلز کانفرنس کے صدر بھی ہیں' اپنی کتاب ''تاریخ کانگریس'' میں ان کوششوں کا ان الفاظ میں اعتراف کرتے ہیں:

''یہ تمام تحریکیں حقیقتاً ہندوستانی قومیت کی زنجیر کی مختلف کڑیاں تھیں' اور اب قوم کا فریضہ تھا کہ ایک جامع چیز پیدا کی جائے' جس کے ذریعے اوہام اور تعصبات کو رفع کیا جائے اور قدیم دین یعنی ''ویدانت'' کا احیا کر کے اسے عہد جدید کی قومیت سے مطابقت دے کر چلایا جا سکے۔ انڈین نیشنل کانگرس کے ذریعے اس مشن کا پورا ہونا مقدر تھا۔''

انڈین نیشنل کانگرس

خالدہ ادیب خانم برہمو سماج اور آریہ سماج کے نظریۂ متحدہ قومیت کے بارے میں اپنے تاثرات بیان کرنے کے بعد لکھتی ہیں: ''اور کون کہہ سکتا ہے کہ اس مشن کے پورا کرنے میں کانگرس نے ملک کی سیاسی بے چینی سے پورا پورا فائدہ نہیں اٹھایا۔ اس زمانے میں ترکی کی شکست' فلسطین پر برطانوی انتداب اور سب سے بڑھ کر خود خلافت اسلامیہ کی تباہی نے ہندی مسلمانوں کو اس حد تک مشتعل و مضطرب کر دیا تھا کہ انہوں نے ترک موالات اور ہجرت کی طوفانی تحریکوں سے ملک میں انگریزوں کے خلاف انقلاب خیز صورت پیدا کر دی۔ ''متحدہ قومیت'' کی داغ بیل کے لئے کانگرس کو اس سے بہتر موقع اور کونسا میسر آ سکتا تھا؟ گاندھی جی فی الفور ہندو کیمپ سے باہر نکلے اور انہوں نے مسلمانوں کی ہمدردی میں ہندوؤں کی طرف سے تعاون و حمایت کا ولولہ خیز اعلان کر دیا۔ جلیانوالہ باغ کے سانحۂ عظیم نے ان دونوں قوموں کو مزید قریب کر دیا' اس قدر قریب کہ ایک ہی پیالے میں سے پانی پینے اور مسجد کے منبر سے ہندو لیڈروں کی تقریروں کے معجزے رونما ہونے لگے۔ مسلمان پہلے ہی کافی مایوس اور زخم خوردہ تھا اور ''خلافت اسلامیہ'' کی بربادی نے تو اس کی امیدیں بالکل ہی ختم کر دیں۔ مایوسی کے اس عالم میں ہندو کا یہ دست تعاون' جو دراصل متحدہ قومیت کا زبردست پنجہ تھا' اسے اس قدر غنیمت معلوم ہوا کہ اس نے بڑھ کر اپنے سینے سے لگا لیا۔

''اس میں کچھ شک نہیں کہ متحدہ قومیت کی یہ سیاسی چال اپنی پیشرو مذہبی تحریکوں سے زیادہ جاذب نظر' مسحور کن اور کامیاب ثابت ہوئی' کیونکہ اس کی ترکیب و تشکیل میں مصائب و تکالیف کے مشترکہ احساس نے بہت زیادہ کام کیا تھا۔ قریب تھا کہ اس بار مسلمان اس کے حصار میں داخل ہو کر ''جدید ہندو قوم'' میں ہمیشہ کے لئے جذب ہو کر رہ جاتے' مگر عین وقت پر ہندو شعور کے خلاف توقع اور بے موقع جوش نے سیاست کے پردے میں جا بجا اس طرح شگاف ڈال دیئے کہ متحدہ قومیت کے مذہبی پس منظر کی عریانی نے مسلم لیڈروں کو خطرے سے آگاہ کر دیا۔ اس کے باوجود کانگرس اپنے اس ڈرامے کی کامیابی کے لئے آخری ایکٹ تک مصر رہی اور اس نے مسلم اکابرین کے مسلسل احتجاج کو نظر انداز کر کے روپیہ' اقتدار' تحریص' تخویف اور تشدد کے ذریعے مسلم عوام کو جذب کرنے کی مہم کو زور و شور سے جاری رکھا۔

''میں نے مہاتما گاندھی سے پوچھا: ہندوستان کو انگریز کا سب سے بڑا عطیہ کیا ہے؟''

''قومیت'' انہوں نے بغیر تامل جواب دیا۔

یہی سوال میں نے قدرے مختلف پیرائے میں سروجنی نائیڈو سے کیا: ''جب کبھی انگریز یہاں سے رخصت ہوں گے تو کیا چیز اپنے پیچھے چھوڑ جائیں گے؟''

''ایک قوم'' انہوں نے بھی بلا تامل جواب دیا۔

مگر ''متحدہ قومیت'' کے متعلق خود انگریزوں کے تاثرات کیا تھے' یہ بیورلے نکلسن کی زبانی ملاحظہ فرمایئے:

بیورلے نکلسن

بیورلے نکلسن انگلستان کا ایک بہت مشہور اور مقتدر صحافی اور کالم نگار تھا۔ وہ اپنے ادارے ''الائیڈ نیوز پیپرز'' کے نامہ نگار کی حیثیت سے 1943ء میں ہندوستان آیا' لیکن ایک طویل اور خطرناک علالت کی وجہ سے ہندوستان میں قیام اتنا طویل ہو گیا کہ اسے نوکری سے مستعفی ہونا پڑا۔ وہ اپنی صداقت پسندی' بے لاگ سیاسی تجزیے اور چبھتے تلے تبصروں کی وجہ سے ہندوستان میں بھی مشہور ہوا۔ اس کی کتاب ''فیصلۂ ہند'' (Verdict on India) شائع ہوئی تو ہندو پریس کی جانب سے اس قدر ہنگامہ برپا ہوا کہ ضبطی کتاب کا مطالبہ ہونے لگا۔ اس کتاب میں قائداعظم سے ایک طویل انٹرویو بھی شامل تھا جس میں پاکستان کی وکالت کے ساتھ ساتھ کانگرس کا بھی کچا چٹھا کھول کر بیان کیا گیا تھا۔ اس کتاب نے ہندوستان اور انگلستان میں ایک کہرام مچا دیا۔ مصنف نے اپنی کتاب کے مواد کے لئے ہزاروں میل کا سفر اختیار کیا۔ یہ سفر پیدل' موٹر' بیل گاڑی' ہوائی جہاز اور کبھی کبھی سٹریچر پر بھی ہوا۔ کتاب کے دیباچے میں اس نے ہندو پریس کے عائد کردہ الزامات کی تردید میں اپنی پوزیشن اس طرح صاف کی: ''یہ برطانوی پروپیگنڈا نہیں' نہ اس میں سرکاری نقطۂ نظر کی نمائندگی کی گئی ہے۔ اس کا محرک انڈیا آفس بھی نہیں۔ اس امر پر زور دینے کی ضرورت یوں لاحق ہوئی کہ جس دن سے میں نے ہندوستان میں قدم رکھا ہے' یہاں کے قوم پرست (ہندو) اخبارات نے میری انتہائی لاعلمی اور حیرت کے باوجود مجھ سے ایسا سلوک کیا ہے جیسے میں برطانوی شہنشاہیت کا نمائندہ ہوں یا بھیس بدلے ہوئے ایک قاصد ہوں جو تمام اقسام کے پوشیدہ سیاسی و ملکی ہتھیاروں سے مسلح ہو۔''

اب اس کی کتاب کے چند اقتباسات ملاحظہ کیجئے جن کے مطالعے سے ہندو مت اور متحدہ قومیت اور اس کے برعکس نظریۂ یعنی نظریۂ پاکستان کی حقانیت اجاگر ہوتی ہے۔

ہندو مذہب کیا ہے؟

''ہندوستان کی ہر ساکن و متحرک چیز کے پس پردہ ہندو مذہب کی روح کارفرما ہے۔ ہندو مذہب صرف ایک ہی اصول کا نام ہے' جس پر آپ کو اپنے قلب اور روح کے ساتھ یقین رکھنا چاہئے کہ اگر آپ خاص خاص غذائیں کھا لیں تو ملیچھ (ناپاک) ہو جائیں گے۔ اسی طرح کچھ لوگ ہیں جن کے ساتھ بیٹھ کر آپ کچھ کھا پی لیں تو آپ مردود ہو جائیں گے۔ ذات پات کا یہ امتیاز ہندو جہاز کا لنگر ہے۔ اگر اس کے لئے اس لنگر کا سہارا نہ ہوتا تو یہ جہاز زیادہ محکم اور مضبوط مذاہب سے ٹکرا کر پاش پاش ہو گیا ہوتا۔''

''میکالے سکول کا کوئی بھی طالب علم آپ کو یہ بتا دے گا کہ ہندو مت میں چار ورن ہوتے ہیں۔ سب سے پہلے برہمن۔ یہ خاندانی مقدس اشخاص ہوتے ہیں' البتہ ان کے ساتھ کوئی کلیسا نہیں ہے۔ طوفانی اور ذہین پنڈت نہرو ایک برہمن ہے اور عقل کی بات یہی ہے کہ ان کے برہمن پن کو کبھی فراموش نہ کیجئے۔ ان کا ہارورڈ اور کیمبرج میں تعلیم پانا' ان کے وزن میں اتنا اضافہ نہیں کرتا جتنا کہ ان کا برہمن نژاد ہونا ان کے وزن کو بڑھاتا ہے۔ سی آر راج گوپال اچاریہ سابق وزیراعظم مدراس برہمن ہیں۔ اسی طرح انتہا پسند ہندوؤں کے لیڈر پنڈت مالویہ اور کانگرس کے اکثر بڑے لیڈر برہمن ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ ہندوستان کی سیاسی زندگی میں برہمنوں نے وہی کام کیا ہے جو برطانیہ میں قدیم اینگلین نے کیا تھا۔ فرق یہ ہے کہ برہمنوں کے ساتھ منظم عمال نہیں جو ان کو نظم و ضبط میں رکھ سکیں۔ برہمن جہاں تک نظر اٹھا کر دیکھتے ہیں' بڑی حد تک ان کو اپنی حاکمانہ شان ہی نظر آتی ہے' البتہ جب وہ پیچھے مڑ کر مسلمانوں پر نظر ڈالتے ہیں تو یہاں ان کو اپنی یہ شان نظر نہیں آتی۔''

اچھوتوں کی زندگی کا نقشہ پیش کرتے ہوئے بیورلے نکلسن لکھتا ہے: ''وہ عام کنوئیں سے پانی نہیں لے سکتے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ ہر ایسی گندی اور مانع چیز پینے پر مجبور ہیں جو انہیں میسر آ سکے۔ ان کے بچے سکولوں میں داخل نہیں ہو سکتے۔ وہ باہر بیٹھنے پر مجبور ہیں' چاہے برسات چھوڑ' کوئی موسم ہو۔ وہ کبھی اشنان گھاٹ کے قریب نہیں

پھٹک سکتے' کیونکہ وہ پیدائشی اور تسلیم شدہ نجس ہیں۔ مندروں کے دروازے ان پر بند ہیں جو ان پر بے رحمی کی سب سے کاری ضرب ہے۔ اگر تم ایسے لوگوں سے جو اس قدر محرومیوں میں غرق ہوں ان کا مذہب بھی چھین لو تو گویا تم نے ان سے آخری وجہ تسلی بھی چھین لی۔ یہ تسلیم کہ پچھلے چند سال میں چند روشن دماغ حکمرانوں اور رہنماؤں کی طرف سے ایک یا دو ڈرامائی مہم بھی چلائی گئی' جس نے ہر آنے والے کے لئے مندر کا دروازہ کھول دیا' لیکن اس کے بعد کیا ہوا۔ جیسے ہی اچھوت مندر میں داخل ہوئے' کٹر مذہبی فوراً باہر چلے گئے۔ مندر اچھوتوں کا مندر ہو کر رہ گیا' آلودہ ہو گیا' غیر مقدس ہو گیا۔ حتیٰ کہ خود اچھوتوں کی نظر میں بھی تعظیم کا مقام باقی نہ رہا۔ اچھوتوں پر جو پابندیاں ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ حجام ان کی حجامت نہیں بنا سکتا اور دھوبی ان کے کپڑے نہیں دھو سکتا۔ ہاں ایک اچھوت یہ ضرور کر سکتا ہے کہ زمین دوز پاخانوں میں گھسے اور رات کی غلاظتوں کو اٹھا کر لے جائے۔ ٹوکرے غلاظتوں سے ٹپکتے ہیں۔ اس فریضے کی انجام دہی کے بعد اچھوت مردوں اور عورتوں کی شکلیں کیا سے کیا بن جاتی ہیں' قابل بیان نہیں۔

جب اس سلسلے میں بیورلے نکولس سے گاندھی جی کی اصلاحی کوششوں کا ذکر کیا جاتا ہے تو وہ غضبناک ہو جاتا ہے اور سر کے جھٹکے کے ساتھ جواب دیتا ہے: "گاندھی جی بار بار اچھوت پن سے اپنی بیزاری کا اظہار کرتے رہے ہیں۔ اپنے آشرم میں اچھوتوں کو جگہ دیتے ہیں۔ انہوں نے ایک اچھوت بچہ گود بھی لیا ہے اور یہ اعلان کیا ہے کہ اچھوت پن کے باقی رہنے کے مقابلے میں ہندو دھرم کا ختم ہو جانا پسند کرتے ہیں' لیکن اس قسم کے بار بار کیے ہوئے اعلانات حقیقت میں کوئی وقعت نہیں رکھتے۔ اچھوت پن فی الحقیقت ہندو دھرم کا اسی طرح جزو ہے' جیسے سامیت دشمنی نازیوں کا جز لاینفک ہے۔ اچھوت پن کو ختم کرنے کی کوشش کیجئے تو نتیجہ یہ نکلے گا کہ ذات پات کا پورا نظام ہی ختم ہو جائے گا اور ذات پات ہی تو وہ مسالہ ہے جو ہندو دھرم کے اُلجھے ہوئے ڈھچر کو گر پڑنے سے روکے ہوئے ہے۔

جب اس بارے میں ڈاکٹر امبید کر سے اُن کی رائے پوچھی گئی تو انہوں نے کہا: "گاندھی جی ہم سے کہتے ہیں کہ ہم پر اعتماد کرو۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں پر بھروسہ رکھو۔ مگر ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم لوگ تم پر اعتماد نہیں کر سکتے' کیونکہ تم لوگ ہمارے خاندانی دشمن ہو"۔

ہندو مذہب کیا ہے؟ اب بیورلے نکولس اپنے سوال کو پھر دہراتا ہے اور اس کے تنگ و تاریک غاروں کے اندر جھانک کر بتاتا ہے: "یہاں نہ کوئی کلیسا ہے نہ انجیل اور نہ کوئی پوپ۔ سب سے بڑھ کر یہاں کسی تاریخ کا نشان تک نہیں ملتا۔ یہ صرف قدیم نوشتوں' گیتوں اور خرافات کا ایک بڑا ذخیرہ ہے جنہیں انجیل کا قائم مقام کہا جاتا ہے۔ ہندوؤں کی کوئی مرکزی کتاب نہیں ہے جسے ناقابلِ عبور آثارِ قدیمہ تحقیق و تردید اور توثیق کے لئے فیصلہ کن معیار و استناد قرار دیا جا سکے۔ یہ آپ کی پسند پر ہے کہ جس پر چاہیں' ایمان لے آئیں اور جس کا چاہیں' انکار کر دیں۔ غرض دنیا کے مذاہب میں ہندو مذہب ہی ایک ایسا مذہب ہے جس کی کوئی تاریخی بنیاد نہیں۔ بہت سے مورخ ایسے ہیں جو حضرت عیسیٰؑ کی الوہیت کا انکار کر سکتے ہیں' لیکن شاذ ہی کوئی ایسا ہوگا' جس نے آپ کے تاریخی وجود سے سرے ہی سے انکار کیا ہو۔

"پیغمبر اسلامؐ کے وجود مبارک پر تو تاریخی شہادتوں کا ایک طویل اور مستحکم سلسلہ موجود ہے۔ اس سے کم سہی' لیکن مہاتما بدھ کے وجود پر بھی تاریخ موجود ہے۔ رہا ہندو صنم کدہ' تو یہ تمام تر تخیلات و تمثیلات کے بتوں سے بھرا پڑا ہے۔ اس بت کدے میں کسی ایسے نبی کی تصویر ہی تلاش کرنا بے سود ہے جس نے بشر کی حیثیت میں تعلیم و تبلیغ کے فرائض انجام دیئے ہوں۔

"یہاں اوہام پرستی اور ضعیف الاعتقادی کے سیاہ بادلوں میں گنیش جی ہیں' جن کا سر ہاتھی کا اور سواری چوہے کی ہے۔ ایک طرف کرشن جی ہیں جو اپنے پانچ سات ہاتھوں سے بنسری بجانے میں محو ہیں۔ دوسری طرف فنا کے دیوتا شیو جی کا ہیبت ناک چہرہ دکھائی دیتا ہے۔ پھر اندرا اور درونا کے اجسام ہیں جو بارش اور پانی کے دیوتا سمجھے جاتے ہیں۔ ایسے ہیں ہندو دیوتا! ان کے معبود و مسجود ہونے کی حیثیت پر بحث کرنا ایک غیر متعلق سی بات ہے۔ مقصودِ کلام یہ ہے کہ یہ لوگ انسانی اور تاریخی وجود نہیں۔ تاریخی اور واقعاتی پس منظر کا یہ فقدان ہے جس نے ہندو مذہب کو ایک غیر واضح' غیر متعین اور مبہم سی چیز بنا دیا ہے"۔

پھر آخر ہندو مذہب ہے کیا؟ بیورلے نکولس برابر اس سوال کے جواب کی کھوج میں پریشان ہے۔ اب وہ دو تمثیلات پیش کر کے دیکھتا ہے' شاید اُن کے موازنے سے کوئی حل ممکن ہو سکے۔ وہ لکھتا ہے:

"آیئے ان دو مجسموں پر ایک غائر نظر ڈالیں۔ صلیب پر حضرت مسیحؑ کی تصویر عیسائیت کی علامت ہے۔ یہ ایک کامل انسان کی تصویر ہے' جس نے اگر ہم اُن کی الوہیت کا عقیدہ نہ بھی رکھیں تو دنیا کو ایک بہترین کہانی اور بلند ترین لائحہ عمل عطا کیا ہے۔

گنیش جی کا مجسمہ:

اب ہندومت کی علامت ملاحظہ ہو یا یوں کہئے کہ اُس کے بہت سے پوجے جانے والے خداؤں میں سے ایک اہم دیوتا کا مجسمہ دیکھئے۔ یہ گنیش جی کا مجسمہ ہے۔ نصف ہاتھی اور نصف آدمی۔ آیئے ذرا گنیش جی کے قریب سے اُن کا دیدار کریں۔ گنیش مندر میں پہلی بار میرا داخلہ مجھ سے کبھی فراموش نہ ہو سکے گا۔ یہ بنگلور کا واقعہ ہے۔ ہم ایک مقدس پہاڑی پر مغرب کے وقت پہنچ گئے۔ ہندوستان میں شفق کا منظر نہایت دلفریب ہوتا ہے۔ سورج کی آخری کرنیں ایک تھیٹر کا سا ڈرامائی منظر پیدا کر رہی تھیں۔ یہ کرنیں محلاتی اینٹوں کی ایک چھوٹی سی عمارت پر پڑ رہی تھیں اور اس عمارت میں ایک بھوت دھونی رمائے ہمارا منتظر بیٹھا تھا۔ یہ ایک ہی چمکدار سیاہ پتھر سے تراشا ہوا تھا۔ اس کی سونڈ اور اس کے نامتناسب' بے ڈول اعضاء ایک غضب ناک ناگ کی طرح پیچ و تاب کھائے ہوئے تھے۔ وہ گمنام بت تراش' جس نے صدیوں پہلے چٹان سے یہ بت تراشا ہوگا' شیطان کے ہاتھوں مخبوط شدہ انسان ہوگا' یقیناً وہ بڑا ہی ذہین' چالاک اور مجسم ابلیس تھا' اس لئے کہ اُس نے گنیش میں متعدی اور جارحانہ شر کو مجسم کیا تھا۔ مدھم مدھم روشنی میں اُس کے اعضاء دیرینہ شہوت سے جکڑے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا' سونڈ کی ایک حرکت' پیچیدہ بازوؤں کے ایک اشارے کے ساتھ وہ اندھیرے سے بھاگ نکلے اور مندر کی دیواریں منہدم ہو جائیں گی"۔

ہندوستان کے پہلے ہندوستانی گورنر جنرل شری سی راج گوپال اچاریہ اس فیل نما دیوتا گنیش کے بارے میں فرماتے ہیں: "اہل مغرب شاید گنیش جی کی مورتی میں کسی حسن و جمال کو نہ پائیں اور یہ کہہ دیں کہ یہ مورتی تو مضحکہ خیز ہے' یہ تو تماشے کا پتلا ہے۔ لیکن ہندوؤں کے لئے گنیش جی وحدتِ کائنات کی ایک تصویر ہیں۔ حسن اور بدصورتی کی یکجائی' ناقابل یکجائی۔ ان کا جسم ایک موٹے آدمی کا ہے۔ ہاتھی کا سر اور چوہے کی سواری۔ وہ اچھے کھانوں کے بڑے شائق ہیں' لیکن وہ احمق نہیں ہیں' جیسا کہ اہل مغرب یا کسی اور مذہب والے کا ہو سکتا ہے۔ ہم ہندو ایک نادر اور عجوبہ قوم ہیں۔ ہمیں عجائباتِ عالم ہی کی حیثیت میں رہنے دیجئے۔ یہی میری التجا ہے۔

عورت کی حیثیت

عورت کی حیثیت و مرتبت پر' جو انسانی تہذیب و تمدن اور اخلاق و معاشرت کی تکمیل کا ایک افضل ترین اور محترم جزوِ اعظم ہے' اسلام نے خاص توجہ کی اور اسے ذلت کی گہرائیوں سے نکال کر ایسے بلند و ممتاز مقام پر جگہ دی' جہاں سے وہ پہلی بار ایک ماں' بہن' بیٹی اور بیوی کی واجب التعظیم حیثیت میں دنیا سے روشناس ہوئی۔ سرورِ عالم ﷺ نے فرمایا: "جنت ماؤں کے قدموں میں ہے"۔ یہ اس لئے

کہ عورت ہی اپنی تربیت سے آئندہ نسلوں کی سیرت تعمیر کرتی ہے۔ عورت ہی کی پیشانی پر انسانیت کی تقدیر کا خط کھنچا ہوا ہے اور اسی کی تقدیس' طہارت اور پاکیزگی سے اخلاق و معاشرت کی بنیادیں مضبوط ہوتی ہیں۔ اسلام میں ازدواجی زندگی میں عورت کو مساوی حقوق عطا کئے گئے ہیں۔ نکاح کی بنیاد باہمی رضامندی اور معاہدے پر رکھی گئی ہے۔ نامساعد حالات میں عورت کو خاوند سے علیحدگی کا پورا حق دیا گیا ہے۔ عورت کا بہترین زیور عصمت و عفت ہے اور اسلام میں عورت کی عصمت و عفت کا انتہائی احترام کیا جاتا ہے۔

اس کے برعکس بیورلے نکولس کی نظروں سے اُس کے الفاظ میں ہندومت میں عورت کی حیثیت ملاحظہ ہو: ''میں خود بنارس کے ہنومان مندر میں موجود تھا' جہاں لڑکیوں کی ایک قطار لگ جاتی تھی جو بمشکل بارہ برس سے زائد عمر کی ہوں گی۔ یہ مورتیوں کی برکت حاصل کرنے کے لئے لائی جاتی ہیں' تاکہ ان میں بلوغت کے آثار جلد پیدا ہوں۔ اُن کے چہرے بے وقت کے جنسی تعلقات کے باعث وحشت زدہ تھے اور ان کے بدن مارے شرم کے سمٹے جاتے تھے۔ میں نے ایسی ہی کم سن لڑکیاں کلکتہ کے کالی مندر میں بھی دیکھی ہیں جو اپنے سیاہ بالوں سے کچھ بال کتر کر ناگ پھن کی مقدس شاخوں میں لپیٹ دیتی تھیں اور اس اثناء میں برہمن پجاری اُن کے جلد حمل کے لئے منتر پڑھتے رہتے۔

''یہی حال دیوداسی طائفہ کا تھا جو دراصل مندروں کی کسبیاں ہیں اور جنہیں عہد طفلی ہی سے زائرین اور پجاریوں کی خدمت کے لئے وقف کر دیا جاتا ہے۔ آپ معروف مقامات کو چھوڑ کر ذرا غیر معروف مقامات پر جایئے جو جنوبی ہند کے قلب میں واقع ہیں۔ آپ ان کسبیوں کو مندر کے اطراف' کہروں میں اور دروازوں کے قریب بیٹھی ہوئی پائیں گے۔ ان کے بال معطر اور ناخن رنگین کئے جاتے ہیں۔ زائرین ان کے پاس سے گزرتے ہیں..... پاؤں گرد آلودہ' نگاہیں گرم' ہاتھ میں ریزگاری کی فرسودہ تھیلی اور چلتے چلتے اپنی پسند کی لڑکی کے سامنے ذرا ٹھہر جاتے ہیں۔ اکثر وہ محض کم سن لڑکیاں ہوتی ہیں۔ اب وہ مسکراتی ہے۔ اٹھ جاتی ہے۔ زائر تعاقب کرتا ہے۔ دروازہ بند ہو جاتا ہے۔ دیوتاؤں کی خوشی حاصل کی جاتی ہے''۔

یہ ابھی کل کی بات ہے۔ بیورلے نکولس کی یہ چشم کشا تحریر 1944ء میں چھپی تھی جب تحریک پاکستان اپنے عروج پر تھی۔ ہندوؤں کے شاستروں میں جو حقائق درج ہیں' وہ انتہائی دل سوز اور شرمناک ہیں۔ مسلمانوں کے عہد حکومت میں ستی' فاشی' مہنتوں کے شرمناک کارناموں' جبریہ بیوگی اور حیا ساز حرکتوں کو' جو سب کے سب ہندو دھرم کے اجزا تھے' منسوخ و موقوف کر دیا گیا تھا۔ اورنگ زیب عالمگیر نے اس معاملے میں کوئی نرمی اور رعایت روا نہ رکھی۔ غالباً وہ اسی وجہ سے ہندوؤں کی نظر میں بدنام اور معتوب ہے۔ اس کے بعد جب انگریزوں نے اپنے عہد حکومت میں ان غیر انسانی امور کے متعلق قوانین بنانے چاہے تو ہندو مذہب اور دھرم کے نام پر اس کوشش کی شدید مخالفت کی گئی۔

پاکستان میں متعینہ ہندوستان کے پہلے ہائی کمشنر مسٹر سری پرکاش نے 13 نومبر 1948ء کو تھیوسوفیکل سوسائٹی کے ہال میں ''ہندومت: ایک ضابطۂ اخلاق کی حیثیت سے'' تقریر کرتے ہوئے کہا تھا: ''جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ ہندومت کوئی مستقل اخلاقی ضابطہ متعین کرتا ہے' جس پر سماج کی بنیاد رکھی جا سکے' وہ ایک بہت بڑی غلط فہمی میں مبتلا ہے۔ ہندومت انسانی زندگی کے لئے کوئی غیر متبدل اصول و اقدار پیش نہیں کرتا' بلکہ وہ ہر موقع اور ہر مقام کے لحاظ سے مختلف اصول وضع کرتا ہے جو ایک دوسرے سے متضاد ہو سکتے ہیں' مثلاً وہ سماج کے ایک طبقے (برہمنوں) کو عدم تشدد کی تعلیم دیتا ہے تو دوسرے طبقے (کھتریوں) کو قتل و خونریزی سکھاتا ہے یا مثلاً وہ پنڈتوں سے کہتا ہے کہ سچ بولو' لیکن تجارت پیشہ (ویش) کو کبھی اس کا پابند نہیں ٹھہراتا' کیونکہ وہ جانتا ہے کہ سچ بولنے سے تجارت میں نقصان ہوتا ہے' اس لئے وہ انہیں واضح الفاظ میں جھوٹ بولنے کی اجازت دیتا ہے۔ اور آگے بڑھیے' وہ ایک برہمن کو صرف سنیاس (ترک دنیا) کی حالت میں اہمسا (عدم تشدد) اور ست (سچائی) کی تلقین کرتا ہے' لیکن وہی برہمن جب گرہست آشرم (گھریلو زندگی) بسر کر رہا ہو تو وہ اسے ان اصولوں کا پابند نہیں ٹھہراتا۔ مختصر یہ کہ وہ اگر ایک قسم کے حالات میں سچ اور دیانت کی تلقین کرتا ہے تو دوسری قسم کے حالات میں جھوٹ اور فریب کو جائز قرار دیتا ہے۔ کسی کو یہ بات پسند آئے یا نہ آئے' لیکن یہ ایک حقیقت ہے جس کا کھلے بندوں اعتراف کر لینا چاہئے کہ ہندومت میں کوئی اصول قطعی نہیں۔ ہر مصلحت اور ہر موقع کے لئے اس کا الگ اصول ہے۔ ہندومت ایک عملی مذہب ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ہر موقع پر صرف سچائی اور دیانت سے کام چل ہی نہیں سکتا۔ اس لئے وہ کچھ ایسی تعلیم نہیں دیتا جو ناممکن العمل ہو۔ یہی وہ راز ہے جس کی بناء پر ہندومت ہزار ہا سال سے مختلف حالات اور متضاد ماحول میں زندہ ہے اور زندہ رہے گا''۔

اب آخر میں ہندوستان کے ایک نامور اچھوت لیڈر ڈاکٹر امبیدکر کے تاثرات بھی یہاں ریکارڈ ہو جائیں تو ہمارے اس موقف کو تقویت ملے گی کہ ہندوستان میں چھوٹی بڑی تمام اقلیتوں کے خلاف ظلم و شر کی ابتدا کاری ہمیشہ اکثریت (ہندوؤں) کی جانب سے ہوئی اور اقلیتوں نے ہمیشہ اپنی مدافعت کی۔

ڈاکٹر امبیدکر

ہندوستان کی آزادی کے رہنما تھے۔ اقلیتوں کے حقوق کے سلسلے میں انڈین نیشنل کانگریس کے مخالف اور مسلم لیگ کے ہمنوا تھے۔ ایک اچھوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ گورنمنٹ لاء کالج بمبئی کے پرنسپل تھے۔ 1930ء اور 1931ء کی گول میز کانفرنسوں میں اچھوتوں کی نمائندگی کی۔ 1939ء میں جب قائداعظم نے مسلمانوں سے کانگریس کی وزارتوں سے چھٹکارا پانے پر ''یوم نجات'' منانے کی اپیل کی تو ڈاکٹر امبیدکر نے کہا کہ غیر کانگریسی ہندوؤں اور اچھوتوں کو بھی یوم نجات منانے میں مسلمانوں کا ساتھ دینا چاہئے۔ اکتوبر 1956ء میں ہندومت کو مسترد کر کے بدھ مت اختیار کر لیا۔ دو ماہ بعد دسمبر میں انتقال ہو گیا۔ 1997ء میں شیوسینا نے بال ٹھاکرے کی رہنمائی میں اس عظیم رہنما کے مجسمے کے گلے میں جوتوں کا ہار ڈال دیا جس پر ہندوستان بھر کے اچھوتوں نے مظاہرہ کیا۔ ڈاکٹر امبیدکر نے ہندومت کے بارے میں سخت بیانات دیئے ہیں۔ ایک بیان ملاحظہ ہو:

''آج بھی اچھوت پن' انسان کے ساتھ غیر انسانی برتاؤ کا تاریخ میں سب سے بدترین نمونہ ہندو معاشرت میں پورے استحکام کے ساتھ موجود ہے۔ تقریباً ہر وہ کوشش جو اسے ختم کرنے کے لئے کی گئی' ناکام رہی۔ اگر یہ کہا جائے کہ پچھلے سال کے عرصے میں اس میں دس فی صد کمی ہو گئی ہے تو یہ اندازہ بھی مبالغہ آمیز ہو گا۔ انگلستان اور امریکا میں سب لوگ گاندھی جی کے پروپیگنڈے سے دھوکا کھا کر یہ تصور کرتے ہیں کہ یہ مرض اب کم ہو رہا ہے۔ انہوں نے اس طریقے کی ناپسندیدگی کا مہاتمائی اعلان تحسین کے جذبات کے ساتھ پڑھا ہو گا۔ انہوں نے وہ تصویر بھی دیکھی ہو گی' جس میں گاندھی جی ایک اچھوت کے گلے میں بانہیں ڈالے کھڑے ہیں' اور انہیں یہ بھی معلوم ہو گا کہ گاندھی جی نے اپنے اخبار میں جو ملک کے اعلیٰ اور بااختیار لوگوں کے حلقے میں جاتا ہے' اچھوتوں کو ''ہریجن'' (خدا کے بچے) کے لقب سے نوازا ہے۔ یہ لوگ یقیناً اپنے دل میں کہتے ہوں گے کہ اس روشن زمانے میں اتنا زبردست نمونہ اثر انداز ہوئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ لیکن واقعہ یہ ہے کہ ایسا نہیں ہوا۔ اچھوتوں کا گاندھی سے بڑھ کر ہندوستان میں کبھی کوئی دشمن پیدا نہیں ہوا۔ گاندھی جی ہم سے کہتے ہیں کہ ہم پر اعتماد کرو۔ اعلیٰ ذات کے ہندوؤں پر اعتبار کرو۔ مگر ہمارا جواب یہ ہے کہ ہم لوگ تم پر اعتماد نہیں کر سکتے' کیونکہ تم لوگ ہمارے خاندانی دشمن ہو''۔

5

نظریۂ پاکستان کی اشاعت کے بنیادی اُصول

اسلام کے بنیادی اصولوں میں سے ایک اہم اصول یہ ہے کہ ہر مسلمان اپنی بساط کے مطابق اسلام کی دولت کو' جو کہ اللہ تعالیٰ کی عظیم نعمتوں میں سے ہے۔ دوسرے انسانوں تک پہنچائے اور اس کی اشاعت عام کرے۔ اس پر عمل پیرا ہونے کی ترغیب دے۔ اسے اختیار کرنے والوں کو خوشخبری سنائے اور اس سے منہ موڑنے والوں کو برے انجام سے ڈرائے۔

اس ذمہ داری کی ادائیگی کی وجہ سے قرنِ اول میں اسلام پھیلا اور اس طرح پھیلا کہ آنحضور ﷺ نے جب دنیا کو چھوڑا تو تمام عرب میں ایک بھی بت پرست نہ تھا۔ اس لئے پہلا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اس کے اسباب کیا تھے؟ اسلام کے مخالف مورخین اور معترضین کے نزدیک تو اس کا جواب تلوار اور صرف تلوار ہے۔ وہ ایک ہی بات کی رٹ ایک ہزار سال سے لگائے چلے جا رہے ہیں کہ ''اسلام تلوار کے زور سے پھیلا'' لیکن بعض انصاف پسند مثلاً تھامس کارلائل اور تھامس آرنلڈ اور ان کے ہم خیال مورخین اور دانشور اصل حقیقت بھی تسلیم کرتے ہوئے کہتے ہیں: ''یہ تلوار صرف اسلام کی تبلیغ اور دعوت کا خاص اسلوب تھا۔''

آنحضرت ﷺ نے دنیا کی تمام قوموں کو برابری اور مساوات کی ایک ہی سطح پر لا کھڑا کیا اور اللہ کے پیغام کی منادی کا سب کو یکساں مستحق قرار دیا' اس لئے اپنی تبلیغ کے لئے قریش وغیر قریش' حجاز و یمن' عرب و عجم' ہند و روم کی تخصیص نہیں فرمائی بلکہ دنیا کی ہر قوم' ہر زبان اور ہر گوشے میں صدائے الٰہی کا پہنچانا فرض قرار دیا۔ ابتدائی وحی میں ان جانوں کو ہوشیار اور بے خبروں کو آگاہ کرنا سب سے پہلا حکم تھا: ''یاایھا المدثر قم فانذر'' (مدثر) ''اے چادر پوش! اٹھ کھڑا ہو اور ہوشیار و آگاہ کر۔'' پھر بار بار حکم ہوتا رہا: ''بلغ ما انزل الیک'' جو غیری طرف اتارا گیا' اس کی تبلیغ کر' اس کو دوسروں تک پہنچا۔ فادع واستقما کما امرت (شوریٰ) لوگوں کو دعوت دے اور مضبوط رہ' جس طرح تجھے حکم دیا گیا۔ فذکر ان نفعت الذکریٰ (اعلیٰ) لوگوں کو نصیحت کر' اگر نصیحت فائدہ ہو۔'' اور سورہ الذاریات میں ہے: ''اور نصیحت کر کہ نصیحت اہل ایمان کو فائدہ پہنچاتی ہے۔'' اور سورہ ق میں ہے: ''قرآن سے سمجھاؤ اس کو جو میری دھمکی سے ڈرتا ہو۔''

ان کے علاوہ بیسیوں آیتوں میں تبلیغ و دعوۃ کے فرض کی اہمیت ظاہر کی گئی ہے۔ اس سے زیادہ یہ کہ ہر مسلمان کی دعوت امر بالمعروف' نہی عن المنکر اور تواصی بالحق (یعنی باہم ایک دوسرے کو حق کی نصیحت کرنا) لازمی قرار دیا ہے اور مسلمانوں کا یہ فرض بتایا ہے کہ وہ اپنے ساتھ دوسروں کو بھی تاریکی سے نکالنے کی جدوجہد کریں۔

آنحضور ﷺ کو حکم ہوتا ہے کہ ہر قسم کے خطرات سے بے پروا ہو کر پیام الٰہی لوگوں تک پہنچائیے اور اگر ایسا نہ کیا تو رسالت کا فرض انجام نہیں دیا۔ سورہ مائدہ کی آیت 67 میں حکم آیا ہے: ''اے رسولؐ جو کچھ تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے' وہ لوگوں تک پہنچاؤ۔ اگر تم نے ایسا نہ کیا تو اس کی رسالت کا حق ادا نہ کیا۔ اللہ تم کو لوگوں کے شر سے بچانے والا ہے۔ یقین رکھو کہ وہ کافروں کو (تمہارے مقابلے میں) کامیابی کی راہ ہرگز نہ دکھائے گا۔''

اسلام کے سوا اور مذاہب و ادیان جو تبلیغی سمجھے جاتے ہیں' وہ حقیقت میں تبلیغی نہیں۔ خود گوتم بدھ نے ہندوؤں کے علاوہ کسی کو اپنی نجات کا راستہ نہیں بتایا اور نہ اس کا حکم دیا۔ حضرت عیسیٰؑ نے اسرائیل کے علاوہ کسی دوسری قوم کو نہ اپنا وعظ سنایا اور نہ ان کو اپنا مخاطب بنایا اور نہ ان میں سے کسی کو اپنا شاگرد کیا' نہ کسی دوسری قوم میں اپنی زندگی میں اپنا وعظ اور مبلغ سمجھا حالانکہ فلسطین میں رومیوں اور یونانیوں کی بڑی جماعت تھی' جبکہ اسلام نے پوری انسانیت کو مخاطب کیا: ھذا بلغ للناس (ابراہیم) ''یہ قرآن تمام انسانوں کے لئے پیغام ہے۔''

آپؐ کو حکم ہوا کہ تمام انسانوں کو خطاب کر کے یہ اعلان فرما دیں: ''قل یاایھا الناس انی رسول اللہ الیکم جمیعا'' (اعراف) لوگو! میں تم سب کی طرف اللہ کا پیغام دے کر بھیجا گیا ہوں۔'' پوری انسانیت کو تبلیغ و دعوت میں کامیابی کی خوشخبری عین اس وقت دی گئی تھی جب مسلمانوں کے دلوں میں ایک قسم کی مایوسی چھائی ہوئی۔ چنانچہ سورہ ص میں ہے: ''یہ قرآن تو تمام دنیا کے لئے نصیحت ہے اور تم ایک زمانے کے بعد اس کی خبر جانو گے۔''

آنحضرت ﷺ نے مکہ میں رہ کر مکہ اور نواحی علاقوں کے لوگوں کو بیدار و ہوشیار کیا۔ حج کے موسم میں عرب کے ایک ایک قبیلے کے پاس جا کر حق کا پیغام پہنچایا اور اسی زمانے میں یمن اور حبشہ تک آپؐ کی آواز پہنچ گئی اور لوگ تلاش حق کے لئے آپؐ کے پاس آئے۔ مدینہ منورہ آئے تو قریش اگرچہ برسوں تک دوسرے قبیلوں تک اسلام کے پہنچنے میں سدراہ بنے رہے' پھر بھی مبلغ اور داعی بھیج بھیج کر قبیلوں تک آواز پہنچائی گئی اور بالآخر قریش کے خلاف اس لئے تلوار اٹھائی گئی کہ اسلام کو دعوۃ و تبلیغ کی پرامن آزادی ملے۔ چھ برس کی کشمکش اور جنگ و جدال کے بعد حدیبیہ میں قریش نے اسلام کے اس مطالبے کو تسلیم کیا اور تبلیغ کی آزادی ملی۔ قرآن نے اسلام کی اس روحانی' اخلاقی اور سیاسی فتح کو ''فتح مبین'' قرار دیا۔ اس کے بعد ہی عرب اور بیرونِ عرب میں اسلام کے واعظ' قاصد اور مبلغ بھیجے گئے اور دنیا کے امراء اور سلاطین کو دعوت اسلام کے خطوط لکھے گئے اور عربوں کے علاوہ دیلم' ایران' حبشہ اور روم کے لوگ اسلام لائے۔ مشرکین عرب' یہود' عیسائی' پارسی اور ہنود نے آپؐ ہی کے زمانے میں آپؐ کے نور سے روشنی حاصل کی۔

تبلیغ کے تین اصول:

تبلیغ کی اہمیت و فرضیت سے بھی زیادہ اہم چیز تبلیغ کے اُصول ہیں۔ یہ نکتہ کہ لوگوں کو کس طرح حق کے قبول کی دعوت دینی چاہئے' دنیا میں پہلی دفعہ حضرت محمد ﷺ کی زبان وحی ترجمان سے ادا ہوا۔ وہ مذہب بھی جو تبلیغی ہونے کا دعویٰ رکھتے ہیں' یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُن کے صحیفوں نے اُن کے لئے تبلیغ کے اہم اصول کی تشریح کی ہے' لیکن صحیفہ محمدیؐ نے نہایت اختصار لیکن پوری جامعیت کے ساتھ مسلمانوں کو یہ بتایا ہے کہ پیغامِ الٰہی کس طرح لوگوں تک پہنچایا جائے اور اُن کو قبولِ حق کی دعوت کس طرح دی جائے۔ سورہ النحل میں ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿ادع الی سبیل ربک بالحکمۃ والموعظۃ الحسنۃ وجادلھم بالتی ھی احسن﴾

''اپنے رب کی راہ کی طرف لوگوں کو حکمت اور عمدہ نصیحت کے ذریعے سے بلاؤ اور ان سے مناظرہ احسن طریق سے کرو۔''

دعوۃ و تبلیغ کے یہ تین اُصول مسلمانوں کو سکھائے گئے۔ عقل و حکمت' موعظۂ حسنہ اور مناظرہ و گفتگو بہ طریق احسن۔ مسلمان مبلغین نے بیان کیا ہے کہ جب کسی کے سامنے کوئی نئی بات پیش کر کے اُسے قبول کرنے کی دعوت

دیتے ہیں تو عموماً یہی تین طریقے برتتے ہیں۔ یا تو اپنی بات کے ثبوت اور تائید میں کچھ دل نشیں دلائل پیش کرتے ہیں یا اُس کو مخلصانہ نصیحت کرتے ہیں اور موثر انداز سے نیک و بد سے آگاہ کرتے ہیں یا یہ کرتے ہیں کہ اُس کے دلائل مناسب طریقے سے ردّ کر کے اُس کی غلطی اُس پر واضح کرتے ہیں۔

ان ربانی ہدایات و اُصول کی تعمیل میں جب آنحضور ﷺ نے حضرت معاذ بن جبلؓ اور ابو موسیٰ اشعریؓ کو یمن میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کے لئے متعین فرمایا تو رخصت کرتے وقت یہ نصیحت فرمائی: ''دین کو آسان کر کے پیش کرنا' سخت بنا کر نہیں۔ لوگوں کو خوشخبری سنانا اور نفرت نہ دلانا''۔

تبلیغ کا ایک اور اصول آنحضور ﷺ نے یہ تعلیم فرمایا کہ کسی نئی قوم کو دعوت دیتے وقت شریعت کے تمام احکام کا بوجھ ایک دفعہ اُس کی گردن پر نہ ڈالا جائے' بلکہ رفتہ رفتہ اُس کے سامنے پیش کئے جائیں۔ پہلے ایمانیات یعنی توحید اور رسالت کو پیش کرنا چاہئے' پھر عبادات اور فرائض کو۔ حضرت معاذ بن جبلؓ کو یمن بھیجتے وقت حضور ﷺ نے فرمایا: ''تم یہودیوں اور عیسائیوں کی ایک قوم کے پاس جاؤ گے تو اُن کو پہلے اس کی دعوت دینا کہ اللہ کے سوا کوئی خدا نہیں اور محمدؐ اُس کے رسول ہیں۔ جب وہ یہ مان لیں تو اُن کو بتاؤ کہ اللہ تعالیٰ نے اُن پر دن رات میں پانچ وقت کی نمازیں فرض کی ہیں' اور جب وہ یہ بھی مان لیں تو اُن کو بتاؤ کہ اللہ نے اُن پر صدقہ فرض کیا ہے۔ یہ صدقہ اُن کے دولت مندوں سے لے کر اُن کے غریبوں کو دے دیا جائے۔ جب وہ اس کو تسلیم کر لیں تو دیکھو علاقے میں چن چن کر اُن کے بڑھیا اور اچھے مال کو نہ لینا اور ہاں مظلوم کی بددعا سے ڈرتے رہنا کہ اُس کے اور اللہ کے درمیان کوئی پردہ نہیں''۔

تبلیغ کا ایک اور طریقہ بھی اسلام نے پیش کیا ہے' جس کو تالیفِ قلب کے نام سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ سورہ توبہ میں آیا ہے: والمؤلفة قلوبھم۔ اس کے لفظی معنی ہے دلوں کو ملانا اور اس سے مقصود یہ ہے کہ جس شخص کو اسلام کی طرف مائل کرنا ہو' اُس کے ساتھ لطف و محبت' امداد و اعانت اور غم خواری و ہمدردی کرنا' کیونکہ انسان طبعاً شریفانہ جذبات کا ممنون ہوتا ہے اور یہ ممنونیت عناد اور ضد کے خیالات دُور کر کے قبولِ حق کی صلاحیت پیدا کر دیتی ہے۔

دعوۃ و تبلیغ کے جو اصول اسلام نے بتائے ہیں' اُن کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ اسلام ایک عقلی اور استدلالی مذہب ہے۔ اس بناء پر کہا جا سکتا ہے کہ مذاہبِ عالم کی تاریخ میں نبوتِ محمدیؐ سب سے پہلی ربانی آواز ہے جس نے حاکمانہ قانون (تورات) یا صرف لفظوں کے الٹ پھیر (انجیل) یا راجاؤں کے احکام (وید) کی بجائے انسانی عقل کو مخاطب کیا۔ غور و فکر کی دعوت دی۔ فہم و تدبّر کا مطالبہ کیا۔ اُس نے اپنی ہر تعلیم کے ساتھ اُس تعلیم کی خوبی' مصلحت و حکمت خود ظاہر کی اور بار بار مخالفوں کو آیاتِ الٰہی میں غور و فکر کی ہدایت فرمائی۔

دین میں زبردستی نہیں

دنیا میں اس حقیقت کا اعلان سب سے پہلے آنحضور ﷺ ہی کی زبانِ مبارک سے ہوا۔ ظاہر ہے کہ جو مذہب اپنی اشاعت کے لئے صرف دعوۃ و تبلیغ کا راستہ رکھتا ہو' جس نے اُس کے اصول بتائے ہوں' جس نے ہر معاملے میں عقل و بصیرت اور فہم و تدبر کا لوگوں سے مطالبہ کیا ہو وہ کیونکر جبر و اکراہ اور زور و زبردستی کا طریقہ اختیار کر سکتا تھا۔ اسلام نے نہ صرف یہ کہ مذہب کی جبری اشاعت کو ناپسند کیا بلکہ اس کا فلسفہ بتایا کہ مذہب زبردستی کی چیز نہیں۔ اسلام میں دین کا پہلا جز ایمان ہے۔ ایمان یقین کا پختہ ترین درجہ ہے اور دنیا کی کوئی طاقت کسی کے دل میں یقین کا ایک ذرّہ بھی بزور پیدا نہیں کر سکتی' بلکہ تیز سے تیز تلوار کی نوک بھی کسی کی لوحِ دل پر یقین کا کوئی حرف نقش نہیں کر سکتی۔

ایمان و کفر میں سے کسی ایک کو اختیار کرنے پر کوئی زبردستی نہیں ہے۔ عقل و بصیرت والے اسے خود قبول کریں گے اور بے عقل اور نافہم اس سے محروم رہیں گے۔ اسی لئے بار بار یہ واضح کیا گیا کہ رسول کا کام لوگوں تک اللہ کا پیغام پہنچا دینا ہے۔ زبردستی منوانا نہیں۔

- ''ہمارے رسول پر تو یہی فرض ہے کہ وہ صاف صاف ہمارا پیغام پہنچا دے''۔ (مائدہ)
- ''اے پیغمبرؐ تیرا فرض صرف پیغام پہنچا دینا ہے''۔ (شوریٰ)
- ''اے پیغمبرؐ تو صرف نصیحت کرنے والا ہے' تو ان پر داروغہ بنا کر نہیں بھیجا گیا''۔ (غاشیہ)
- ''پھر اگر وہ اسلام کی دعوت سے انکار کریں تو اے پیغمبر! ہم نے تجھ کو اُن پر گماشتہ بنا کر نہیں بھیجا۔ تیرے ذمے صرف پیغام کا پہنچا دینا ہے''۔ (شوریٰ)

میدانِ جنگ میں تبلیغ:

مخالفین نے ایک اور مسئلے کی بھی غلط تعبیر کی ہے۔ اسلام کی امن پسندی نے یہ قانون بنایا ہے کہ اگر کسی مخالف قوم سے لڑائی آ پڑے تو میدانِ جنگ میں پہنچ کر بھی صلح و آشتی کا خیال دُور نہ کیا جائے' بلکہ تلوار کے فیصلے سے پہلے دو باتیں اُن کے سامنے پیش کرنی چاہئیں۔ اوّل یہ کہ تم کلمۂ شہادت پڑھ کر مسلمان ہو جاؤ اور لڑائی سے ہاتھ اٹھا کر ہمارے بھائی بن جاؤ۔ اگر ایسا کرو تو تم دین' حکومت اور عزت کے تمام حقوق میں ہمارے برابر ہو جاؤ گے۔ اگر یہ منظور نہ ہو تو اپنے مذہب پر قائم رہ کر ہماری حکومت کو قبول کر لو۔ اس حالت میں تمہاری حفاظت کی ہر قسم کی ذمہ داری ہمارے سر ہو گی۔ اگر وہ ان دو میں سے کوئی بات قبول کر لیں تو اُن سے لڑنا جائز نہیں۔ اسلام کی تاریخ میں ایسے کتنے مناظر ہیں کہ کسی دشمن قوم نے اسلام یا محض اطاعت قبول کر لی ہے اور خون ریزی رک گئی ہے اور جنگ کا میدان محبت و آشتی کی بزم بن گیا ہے۔

یہ وہ اصولِ جنگ ہے جس سے خون ریزی کی روک تھام مقصود تھی' نہ یہ کہ کسی کو مجبور کر کے بزورِ شمشیر مسلمان بنا لینا۔ صحابہ کرامؓ کے عہد میں جب ایرانیوں سے لڑائی شروع ہوئی تو مسلمانوں نے تین روز میدانِ جنگ میں تلوار نہیں اٹھائی۔ حضرت سلمانؓ فارسی تین روز تک اُن کو سمجھاتے رہے کہ میں تمہاری قوم سے ہوں' لیکن دیکھتے ہو کہ عرب میرے زیرِ فرمان ہیں۔ اگر تم بھی مسلمان ہو جاؤ تو تم کو بھی وہی حقوق ملیں گے جو ہمارے ہیں اور اگر تم اپنے ہی مذہب پر رہنا چاہو تو جزیہ دے کر رہ سکتے ہو' لیکن محکوم ہو کر رہو گے''۔ اس سے معلوم ہوا کہ جنگ میں دشمن کو بھی تبدیلئ مذہب پر مجبور نہیں کیا گیا' بلکہ اس کے سامنے دوسری راہیں بھی کھلی تھیں۔

غزوۂ خیبر میں مسلمان روزانہ بعض قلعوں پر حملہ کرتے ہیں اور ناکام رہتے ہیں۔ بالآخر حضرت علیؓ کو حکم ہوتا ہے کہ فوج لے کر جائیں۔ وہ پوچھتے ہیں' یا رسول اللہ ﷺ' کیا میں اِن سے لڑوں' یہاں تک کہ وہ ہماری طرح ہو جائیں؟ فرمایا' آہستگی سے روانہ ہو' یہاں تک کہ اُن کے میدان میں پہنچ جاؤ۔ پھر اِن کو اسلام کی طرف بلاؤ اور اس میں ان کا جو حق ہو گا وہ اُن کو بتاؤ۔ خدا کی قسم' اگر ایک شخص کو بھی خدا تمہارے ذریعے سے ہدایت دے دے تو اس سے بہتر ہے کہ تمہاری ملکیت میں سرخ اونٹ ہوں۔ لیکن خیبر کے یہود نے اسلام کا مذہب قبول نہیں کیا بلکہ اسلام کی حکومت قبول کر لی اور مصالحت ہونے پر تلوار نیام میں کر لی گئی۔

اسی طرح ایک مسلمان کو کسی دوسرے مسلمان پر ہتھیار اٹھانا جائز نہیں بلکہ کفر کا موجب ہے۔ کفار کو مسلمانوں کا یہ طرزِ عمل معلوم تھا۔ اکثر لڑائیوں میں جب کوئی کافر یا مشرک حملہ آور اپنی کمزوری محسوس کرتا تھا تو اپنی جان بچانے کے لئے کلمۂ شہادت پڑھ دیتا تھا اور بھپرے ہوئے مسلمان کو مجبوراً اپنا غصہ ضبط کر کے ہاتھ روک لینا پڑتا تھا۔ ایک دفعہ ایک صحابیؓ نے حضور ﷺ سے پوچھا کہ اگر لڑائی میں میرا حریف اپنی تلوار سے میرا ہاتھ اڑا دے اور

جب میرے حملے کی باری آئے تو درخت کی آڑ پکڑ کر کہے ''میں مسلمان ہوتا ہوں تو اے اللہ کے رسولؐ میں کیا کروں۔ کیا اُس کو قتل کر دوں؟'' حضور ﷺ نے فرمایا' نہیں۔ اُس کا قتل جائز نہیں۔ عرض کی یا رسول اللہ' میرا ہاتھ اُس نے کاٹ ڈالا۔ فرمایا' پھر بھی اس کا قتل جائز نہیں کہ اگر تم نے اُس کا قتل کیا تو وہ وہ ہو گیا جو تم اس کے قتل سے پہلے تھے اور تم وہ ہو جاؤ گے جو وہ اقرار توحید سے پہلے تھا''۔

مسلح تبلیغی جماعتیں:

مخالفین غلط فہمی پھیلانے کی ایک اور دلیل یہ بیان کرتے ہیں کہ دعوۃ و تبلیغ کے لئے جو جماعتیں ملک میں بھیجی جاتی تھیں' وہ مسلح ہوتی تھیں' لیکن یہ حقیقت نظر انداز کر دی جاتی ہے کہ یہ عرب کا واقعہ ہے جہاں کوئی باضابطہ اور منظم حکومت نہ تھی' جس پر تمام رعایا کی حفاظت کی ذمہ داری ہو۔ ایک ایک وادی میں ایک ایک قبیلہ اپنی اپنی الگ ریاست قائم کئے ہوئے تھا اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے سے برسرپیکار تھا۔ راستوں پر رہزنوں اور ڈاکوؤں کا قبضہ تھا۔ اسی لئے جب کہیں کوئی تبلیغی جماعت بھیجی جاتی تھی تو وہ اپنی ممکن حفاظت کے لئے مسلح جاتی تھی اور اس بات کی دلیل کہ اس مسلح جماعت کا دعوۃ و تبلیغ کے سوا کوئی مقصد نہ تھا' اس سے ظاہر ہے کہ اُن کی تعداد بہت تھوڑی ہوتی تھی جو فوجی حملے کے لئے کافی نہیں ہو سکتی تھی۔

غزوۂ بدر کے بعد جب قریش کا زور ٹوٹ گیا اور ملک میں اسلام بھی ایک قوت شمار ہونے لگا تو آنحضور ﷺ نے بعض قبیلوں کی درخواست پر مسلمانوں کی مختلف جماعتوں کو تبلیغ کے لئے اِدھر اُدھر بھیجا' تب بھی وہ اکثر راستے میں جان سے ماری گئیں۔ واقعہ رجیع میں ستر مبلغین کا مارا جانا' واقعہ بیئر معونہ میں چھ سات مبلغوں کا قتل ہونا' سریہ بن ابی المعوجا میں پچاس مبلغین کی شہادت' واقعہ ذاتِ اطلاح میں چودہ مبلغین کا تیروں سے مارا جانا' عروہ بن مسعود ثقفی کا تیروں سے چھلنی ہو جانا' اس دعوے کی شہادت ہے۔

اشاعتِ اسلام کے اسباب و ذرائع:

اسلام کی نشر و اشاعت کا سب سے مقدم' مؤثر اور اصلی سبب معجزۂ قرآن ہے۔ قرآن حکیم جس مؤثر انداز سے عقائد و معارف و اخلاق کی تلقین کرتا تھا' اس کے سامنے شرک و کفر کی رُکاوٹیں نہ ٹھہر سکتی تھیں۔ تمام بڑے بڑے صحابہ' بڑے بڑے رؤسائے قبائل' بڑے بڑے شعراء اور خطباء قرآن ہی سن کر ایمان لائے۔ حضرت عمرؓ' عتبہ' حضرت ابوذرؓ' خالد بن ولید کے والد ولید بن مغیرہؓ' حضرت عثمان بن مظعونؓ' حضرت جبیر بن مطعمؓ' حضرت طفیل بن عمرؓ الدوسیؓ' خالد العدوانیؓ کے قبولِ اسلام کی مثالیں سامنے کی ہیں۔ ان حضرات نے چند آیاتِ قرآنی سُن کر اپنے پُرانے اوہامِ باطلہ سے توبہ کی اور حلقۂ بگوشِ اسلام ہوئے۔

اہلِ ہند کا معاملہ دوسرا تھا۔ یہاں کے لوگ عربی زبان سے ناواقف تھے۔ یہاں کے لوگ اُن مسلمانوں کے اخلاق و کردار سے متاثر ہو کر اسلام لائے' جو قرآن و سنت کے زیرِ اثر پل کر جوان ہوئے تھے' بلکہ قرنِ اوّل میں تو آنحضور ﷺ کے چند صحابہ کرامؓ ہندوستان کے مختلف حصوں میں تشریف لائے' جو نبوتِ محمدیؐ کے نور سے براہ راست استفادہ کئے ہوئے تھے۔ صحابہ کرامؓ کے بعد تابعین اور تبع تابعین اور محمود غزنوی کی فتح پنجاب کے بعد یہاں صوفیائے کرام کا تانتا بندھ گیا۔ یہ سب حضرات قرآن و سنت اور اسلامی شعائر و اخلاقیات کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ارواح تھیں۔ جو ان سے مس ہوا' وہ مسلمان ہوئے بغیر باقی زندگی نہ گزار سکا۔

ان سچے اور صالح مسلمانوں کے تذکرے سے پہلے یہ معلوم ہونا چاہئے کہ ہندوستان میں اسلام کی اشاعت کن طریقوں اور عناصر و عوامل کے تحت ممکن ہوئی۔ اس موضوع کے لئے اگلا باب وقف ہے۔

6

نظریۂ پاکستان کی اشاعت: جنوبی ایشیا میں

نظریہ پاکستان کی اشاعت جنوبی ایشیا میں

ہندوستان بلکہ جدید اصطلاح میں جنوبی ایشیا میں نظریۂ پاکستان بلکہ قدیم اصطلاح میں اسلام کا تعارف اُنہی دنوں ہو گیا تھا جب رسولِ کریم ﷺ جزیرۂ نمائے عرب میں اپنے تبلیغی فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں' خصوصاً بلوچستان' مکران اور کابل وغیرہ میں جو صحابہ کرامؓ اسلام کی دعوت و تبلیغ کے عزم سے تشریف لائے' اُن میں سے اکثر کے اسمائے گرامی یہ ہیں: حضرت عثمانؓ بن ابوالعاصی ثقفی' حکم بن ابوالعاصی ثقفی' ربیع بن زیاد فارسی' حکم بن عمر و تغلبی' صحار بن عباس عبدی' عبیداللہ بن عمیر اشجعی' عبیداللہ بن معمر تیمی' مجاشع بن مسعود سلمی' عبدالرحمن بن سمرہ' سنان بن سلمہ بزلی۔ یہ صحابہ کرام میں سے تھے۔ سپہ سالار تھے اور منتظم تھے۔ علم دین میں اُن کی حیثیت اس طرح مسلّم ہے کہ امام بخاری تک ان کی روایت کردہ احادیث کو معتبر قرار دیتے ہیں۔ اسی طرح بعض تابعین بھی اِن علاقوں میں آئے اور دینِ اسلام کی تبلیغ کی۔ ان میں معتبر ترین نام خواجہ حسن بصری تھے' جو یہاں میر منشی' قاضی اور مفتی کے طور پر تعینات رہے۔ دوسرا نام سعد بن ہشام انصاری کا سامنے آتا ہے۔ ان دونوں حضرات نے حضرت عمرؓ' حضرت عثمانؓ اور حضرت علیؓ سے احادیث روایت کی ہیں۔ ان کے علاوہ حکم بن جبلہ عدی' حضرت عثمانؓ کے عہدِ خلافت میں یہاں کے قاضی القضاۃ تھے۔

دینِ اسلام کو جنوبی ایشیا میں شروع شروع میں متعارف کرانے کا کام چار عناصر و عوامل نے انجام دیا۔ اوّل زط یا جاٹ' دوم اساورہ' سوم مقامی تاجر' چہارم عرب تاجر۔ اُن کی تفصیل یہ ہے:

1) جاٹ: ساتویں صدی عیسوی میں ہندو پاکستان کے لوگوں کا عرب کی طرف آنا جانا' تاریخی اعتبار سے ثابت شدہ حقیقت ہے۔ یہ لوگ مختلف قبائل سے تعلق رکھتے تھے اور مختلف وجوہ کی بنا پر عرب کی طرف نقل مکانی کرتے رہتے تھے۔ اِن میں سے بعض ایسے بھی تھے جو کسی نہ کسی عرب قبیلے کے حلیف بن چکے تھے اور مستقل طور پر رہ رہے تھے۔ ان لوگوں کو عرب میں ''زط'' کہتے تھے جو جٹ کا معرّب ہے۔ جاٹ قبائل کے علاوہ ایک اور پاکستانی قبیلہ ''سیابجہ'' تھا جو آج بھی عرب میں خاصی تعداد میں موجود ہے۔ جاٹ اور سیابجہ بعثتِ محمدیؐ سے بہت پہلے سے عرب میں موجود تھے اور کسی نہ کسی عرب قبیلے سے منسلک تھے' بلکہ عرب قبائل کی باہمی جنگوں میں بھی یہ اپنے اپنے حلیف قبائل کا ساتھ دیتے تھے۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہدِ خلافت میں جب بعض عرب قبائل نے زکوٰۃ دینے سے انکار کیا تو اسلامی افواج کے خلاف یہ جاٹ اور سیابجہ بھی اپنے اپنے حلیف عرب قبائل کے ہمراہ لڑے۔ ان میں سے بعض اپنے آبائی وطن واپس آ گئے جہاں انہوں نے اسلام کا تعارف کرایا۔ اُن کا یہ آبائی وطن بلوچستان' سندھ اور ملتان تک کا علاقہ تھا۔ اِن لوگوں کی منفرد جسمانی ہیئت سے سب عرب بخوبی واقف تھے۔ مثال کے طور پر

جب آنحضور ﷺ نے معراج کا واقعہ بیان فرمایا تو بعض پیغمبروں سے اپنی ملاقات کا ذکر بھی کیا۔ حضور ﷺ نے فرمایا: ''عیسیٰؑ کشادہ سینے اور سُرخ رنگت کے تھے' جبکہ موسیٰؑ گھٹے ہوئے جسم کے اور سانولی رنگت کے تھے جیسے زط ہوں''۔

یہ جاٹ اور سیابجہ عربوں کے غلام نہیں بلکہ اُن کے حلیف تھے۔ اِن میں سے بعض تو اپنے حلیف قبائل میں ضم ہو گئے تھے' جبکہ بعض تجارت پیشہ تھے' جن کا تعلق تمام ہندوستان سے تھا اور سندھ و ملتان سے لے کر بنگال تک ہر مقام سے لوگ تجارت کی غرض سے اندرونِ عرب پہنچتے تھے۔ اُن کے مال تجارت میں زیادہ تر وہ اشیاء ہوتی تھیں جو عرب میں نایاب تھیں اور بہت پسند کی جاتی تھیں مثلاً مُشک' کافور' لونگ' کالی مرچ' عود' قط ہندی اور ساگوان کے علاوہ ہندی تلواریں اُن کے لئے بہت منافع بخش تھیں۔ ہجرت کے بعد جب حضور ﷺ نے حضرت ابوایوب انصاریؓ کے گھر میں قیام فرمایا تو حضرت اسعد بن زرارہ نے آپؐ کی خدمت میں ایک چارپائی پیش کی' جس کے پایے ساگوان کے تھے۔ یہ چارپائی ہمیشہ آپؐ کے استعمال میں رہی۔ حضرت عائشہؓ کے حجرے کا ایک کواڑ بھی ساگوان کا تھا۔ یہ ساگوان ہندوستانی لوگ عرب لے گئے تھے۔

2) اساورہ: یہ لوگ بھی اسلام کا پیغام ہندوستان پہنچانے میں مددگار ثابت ہوئے۔ یہ لوگ فوجی تھے' جنگجو تھے اور دوسروں کی خاطر تلوار کے جوہر دکھانا اُن کا پیشہ تھا۔ ہندوستان کے مختلف علاقوں سے تعلق رکھنے والے یہ ہندی لوگ زیادہ تر ایرانی فوج میں ملازم تھے۔ انہیں ان کی رنگت کی بنا پر ''سیاہ سوار'' کہا جاتا تھا۔ یہی نام جب معرب ہوا تو اساورہ بن گیا۔ عرب مسلمانوں سے ان لوگوں کا سامنا سب سے پہلے جنگ قادسیہ میں ہوا' جس میں یہ ایرانی فوج کا ایک طاقتور اور مضبوط حصہ تھے اور رُستم کی قیادت میں حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کے خلاف نبرد آزما ہوئے۔ مسلمانوں کی قلیل فوج نے ڈیڑھ لاکھ ایرانی فوجیوں کو شکست دی' جس کی بنا پر یہ اساورہ لوگ بھاگ کر واپس ہندوستان آ گئے۔ ظاہر ہے' یہ لوگ جس علاقے میں بھی گئے ہوں گے' اسلامی فوج کے علاوہ اسلامی دینیات و اخلاقیات کا تذکرہ بھی کیا ہوگا۔ دوسری مرتبہ اسلامی فوج سے اُن کا سامنا جنگ سوس میں ہوا' جس میں مسلمانوں کے کمانڈر حضرت ابوموسیٰ اشعری تھے۔ ایرانیوں کو شکست فاش ہوئی اور وہ تتر بتر ہو گئے' لیکن اُن کی فوج کا ایک حصہ ڈٹا رہا اور شکست قبول کرنے سے انکاری رہا۔ وہ اساورہ تھے اور موت کو ذلت پر ترجیح دیتے تھے۔ مذاکرات ہوئے تو انہوں نے ہتھیار ڈالنے کی خاطر چند شرائط پیش کیں اور اعلان کیا کہ اگر اُن کی شرائط منظور کر لی گئیں تو وہ اسلام قبول کر لیں گے۔ ان شرائط میں دو بہت اہم تھیں۔ اول یہ کہ وہ مسلمانوں کے باہمی اختلافات میں کسی کا بھی ساتھ نہ دیں گے۔ دوم یہ کہ اُنہیں مسلمانوں کے ساتھ مساوی درجہ دیا جائے گا اور انہیں دوسرے درجے کا شہری نہیں سمجھا جائے گا۔ حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ نے اُن کی یہ شرائط حضرت عمر فاروقؓ کو بھجوا دی جس پر انہوں نے اُن کی تمام شرائط منظور کر لیں اور انہیں مسلمان ہونے کی دعوت دی' چنانچہ وہ سب کے سب مسلمان ہو گئے اور انہیں اسلامی معاشرے میں باعزت مقام حاصل ہو گیا' یہاں تک کہ انہیں مختلف مقامات پر بیت المال کی حفاظت پر مامور کیا گیا۔ خلیفۂ چہارم حضرت علیؓ کے وقت اُن کے چار سو افراد کوفہ کے بیت المال کی حفاظت پر تعینات تھے۔

3) مقامی تاجر: ہندوستان کے مختلف علاقوں کے اور بہت کاروباری لوگ تھے جو عرب سے درآمد و برآمد کی تجارت کرتے تھے۔ وہ زیادہ تر برآمد کرتے تھے اور نفع کماتے تھے۔ ایک ہندو تاجر بیرزتن یمن میں بھنگ کا کاروبار کرتا تھا۔ اُس نے اسلامی تعلیمات سے متاثر ہو کر اسلام قبول کیا اور بھنگ کے کاروبار سے توبہ کر لی۔

بنگال کے ایک ہندو راجا نے جب اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے کردار و سیرت کا احوال ایک تاجر کی زبانی سنا تو وہ متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکا اور از راہِ عقیدت اُس نے تازہ زنجبیل (ادرک) ایک گھڑے میں بند کر کے تاجروں کے ذریعے بطور تحفہ بھجوایا۔ صحابیٔ رسولؐ حضرت ابو سعیدؓ کی روایت ہے کہ جب یہ تحفہ حضور ﷺ کی خدمت میں پیش ہوا تو اُس وقت میں وہاں موجود تھا۔ آپؐ نے ادرک کی بڑی تعریف کی' خود بھی تناول فرمایا اور وہاں بیٹھے ہوئے تمام صحابہ کو بھی کھلایا۔ حضرت ابوسعیدؓ بھی اس نعمت سے بہرہ مند ہوئے''۔ (بحوالہ ''مستدرک'')

سری لنکا کے ایک راجہ نے جب ایک تاجر کی زبانی اسلام کا پیغام سنا تو اتنا متاثر ہوا تو اُس نے اپنے خاص خاص درباریوں کا ایک وفد مدینہ روانہ کیا' تاکہ وہ پیغمبر اسلام ﷺ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس بالکل نئے مذہب کے بارے میں صحیح صحیح معلومات حاصل کرے' لیکن سفر کی مشکلات کے باعث یہ وفد آنحضور ﷺ کی رحلت کے بعد مدینہ پہنچا اور صرف حضرت عمر فاروقؓ سے ملاقات کر سکا۔ واپسی پر وفد کا سربراہ ریاست مکران کے دارالحکومت کیچ میں فوت ہو گیا' جبکہ وفد کا ایک رُکن سری لنکا (سراندیپ) تک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا۔ راجہ پہلے ہی فوت ہو گیا تھا' اس لئے اُس کی اولاد اور رعایا نے یہ حالات سنے اور متاثر ہوئے۔

ساحل مالابار کی ایک ریاست ٹراونکور کا راجہ پیرومل' ایک تاجر کی زبانی اسلام کا پیغام سننے کے بعد مسلمان ہو گیا اور اپنا نام عبدالرحمٰن رکھا۔ کہتے ہیں کہ اُس نے شق القمر کا معجزہ اپنی آنکھوں سے دیکھا تھا اور جب اُسے عرب سے آنے والے تاجروں کے ذریعے پتا چلا کہ وہ محض حادثہ نہیں تھا' بلکہ ایک معجزہ تھا تو وہ فوراً مدینہ جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ اُس نے اپنی ریاست اپنے بھتیجے کے حوالے کی اور کہا کہ حج کی سعادت سے بہرہ مند ہونے کے بعد وہ واپس آ جائے گا۔ لیکن زندگی نے وفا نہ کی اور وہ راستے ہی میں فوت ہو گیا' لیکن اُس کی ریاست میں ہمیشہ یہ دستور رہا کہ جب بھی پہلے راجہ کے فوت ہونے کے بعد نیا راجہ تخت پر بیٹھتا تو وہ اسلامی لباس زیب تن کرتا اور عصا ہاتھ میں لے کر اعلان کرتا کہ وہ اُس وقت تک اس تخت پر بیٹھے گا جب تک چچا عبدالرحمٰن حج سے واپس نہیں آ جاتا۔ رواج اُس وقت تک رہا' جب آزادی کے بعد بھارت نے اس ریاست کو اپنے اندر ضم نہ کر لیا۔ (بحوالہ: مظفر مہدی ہاشمی)

فتح ایران سے پہلے مکران کا علاقہ سلطنت ایران کے قبضے میں تھا۔ مکران میں ایرانی گورنر کا نام بازان الفارسی تھا۔ شہنشاہ ایران خسرو پرویز نے اپنے گورنر کو لکھا: ''اطلاع ملی ہے کہ عرب میں کوئی شخص پیغمبری کا دعویٰ کرتا ہے اور ایک نئے مذہب کی تبلیغ کر رہا ہے۔ تمہیں حکم دیا جاتا ہے کہ عرب پر حملہ کرو اور اس شخص کو گرفتار کر کے ہمارے سامنے پیش کرو''۔ مکران کے گورنر نے جب اسلام اور پیغمبر اسلام ﷺ کے بارے میں تاجروں سے رابطہ کر کے معلومات حاصل کیں تو وہ حملہ کرنے کی بجائے مسلمان ہو گیا۔

4) عرب تاجر: لیکن جس عنصر نے ساتویں صدی کے پہلے نصف میں برعظیم پاک و ہند میں اسلام کے پیغام کا سب سے بہتر انداز میں تعارف کرایا' وہ عرب ملاح' جہاز راں اور تاجر تھے۔ ان کی تجارت اور میل جول کا سراغ بعثتِ نبویؐ سے دو سو سال پہلے سے ملتا ہے۔ ایشیا' افریقہ اور یورپ میں عربوں کی تجارتی اجارہ داری تھی اور وہ بحرالکاہل' بحرِ ہند' بحیرۂ عرب' بحیرۂ قلزم کے پانیوں کے واحد مالک تھے۔ یہ تاجر نسلاً عرب' طبعاً مہم جو' بہادر اور فطرتاً باحوصلہ اور باکردار تھے۔ ہیرے' جواہرات' ریشمی کپڑے' خوشبودار مصالحے' عود اور عنبر' ادرک اور ساگوان کے علاوہ لاکھوں کی مالیت کی دیگر اشیاء سمندر کی بے رحم موجوں کے سپرد کر دینا انہی کا کام تھا' جبکہ بحری قزاقوں کا مقابلہ اور طوفانوں کے تھپیڑے اس کے سوا تھے۔

عرب تاجروں کی یہ بین الاقوامی تجارت ویسے تو

پانچویں صدی عیسوی سے جاری تھی' لیکن ظہورِ اسلام کے بعد ان کی تجارت کو جو فروغ ملا' وہ اسلام کے نئے انقلابی عقیدے کی مرہونِ منت تھی۔ وہ اب محض دنیادار تاجر ہی نہ رہے تھے بلکہ آخرت کے خریدار اور اسلام کے چلتے پھرتے مبلغ بن گئے تھے۔ کنٹون (چین) سے لے کر سکندریہ تک وہ جہاں جہاں بھی پڑاؤ کرتے' مقامی لوگ انہیں خوش آمدید کہتے۔ انہیں اپنے گھروں میں ٹھہراتے اور اُن کی خاطر مدارات کرتے۔ یہ انہیں تحفے دیتے۔ باہر کا مال انہیں سستے داموں فروخت کرتے اور اُن کا مقامی مال اُن سے منہ بولے داموں پر خرید کرتے۔ ان علاقوں میں زیادہ تر تجر باتی مذاہب تھے اور ہندومت سے ملتے جلتے عقائد تھے۔ ذات پات کی اونچ نیچ کا تصور ہر مقام پر تھا۔ اب یہ لوگ عرب تاجروں کے نئے مذہب کی باتیں از خود دریافت کرتے اور پھر کلمۂ توحید پڑھتے۔ ساحل مالابار' کھمبابٹ' دیبل اور مکران کے لوگ بھی اسلام سے متاثر ہوئے۔ شادی بیاہ کا سلسلہ چل نکلا اور ہندو عورتوں سے عربوں کی شادیاں ایک معمول بن گئیں۔ ساحل مالابار تو یہ شادیاں اتنی کثرت سے ہوئیں کہ لوگ ہر عرب کو موپلا کہنے لگے۔ مقامی زبان میں موپلا ''دولہا بھائی'' کو کہتے ہیں۔ ہندو نژاد بیویوں سے جو اولاد ہوئی' وہ بھی موپلا کہلائی۔ اس طرح موپلا اسلامی تہذیب آج تک مالابار پر موجود ہے' اور انگریزوں سے آزادی کے بعد جنوبی ہند کے نئے صوبے کیرالا کی سیاست میں اپنا باعزت کردار ادا کر رہی ہے۔ غرضیکہ توہمات' ضعیف الاعتقادی اور بُت پرستی کے ماحول میں گھرے ہوئے اس سارے ایشیائی علاقے کو عرب تاجروں نے اسلام کی روشنی دکھائی اور آج شمالی ایشیا' جنوب مشرقی ایشیا اور افریقہ کے مشرقی ساحل پر جو اسلام نظر آتا ہے' وہ انہی عرب تاجروں کے مساعی کی بنا پر ہے۔ کنٹون' منداناؤ' برونائی' جاوا' سماٹرا' ملاکا' ملایا' برما' مالدیپ' سراندیپ اور افریقہ میں موزمبیق' دارالسلام' نیروبی' حبشہ اور جبوتی میں نہ کبھی کوئی اسلامی فوج گئی اور نہ کوئی اور حکومتی کارروائی ہوئی۔ ان علاقوں میں اسلام کا ظہور ونفوذ صرف ان عرب تاجروں کا مرہونِ منت ہے۔

سے پہلے اروڑ راجا داہر کی راج دھانی تھا اور یہ ایک آباد اور خوشحال شہر تھا۔ سکندر اعظم کے حملے کے وقت یہ راجا موسی کانوس کا دارالحکومت تھا۔ راجا کو شکست دینے کے بعد سکندر نے یہاں ایک قلعہ تعمیر کرایا۔ 641ء میں یہ سندھ کے رائے خاندان کی وسیع حکومت کا صدر مقام تھا۔ 712ء میں راجا داہر کو شکست دینے کے بعد محمد بن قاسم نے یہاں ایک مسجد تعمیر کی۔ یہ شہر جو ملتان کا ہم پلہ تھا' 964ء میں دریائے سندھ کا رُخ بدلنے سے برباد ہو گیا۔ یہاں لال شہباز قلندر (سیہون) کے ہم عصر شاہ گنج شاہ کا مزار اب تک قائم ہے۔

اروڑ ہی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ہندو پاک میں اسلام کا غلبہ اسی شہر سے شروع ہوا۔ زمانے کے سرد و گرم سے یہ عظیم الشان شہر سنسان ہو گیا تو قلعے' محلات اور حویلیوں کے ساتھ محمد بن قاسم کی تعمیر کردہ مسجد بھی محفوظ نہ رہ سکی۔ نہ اذان نہ رکوع و سجود۔ درس و تدریس یہاں سے رخصت ہوئے' لیکن اس کے آثار کو قدرت نے بچائے رکھا۔ تیرہ صدیوں کا یہ طویل سفر اس چھوٹی سی مسجد نے بڑی ہی آزمائشوں سے طے کیا۔ نہ کوئی پُرسانِ حال' نہ کوئی اس کی قدر و قیمت سے آگاہ۔ کسی کو نہیں معلوم کہ ہندوستان کے پہلے مُسلم دارالحکومت کی اوّلین سجدہ گاہ کون سی تھی؟ اس مسجد کے کھنڈر ہماری بے حسی' احسان فراموشی اور تاریخ ناشناسی پر نوحہ خواں ہیں۔ باشعور اقوام اپنے اسلاف کی یادگاروں اور میراث کو شاندار طرز پر تعمیر کراتی ہیں لیکن یہاں یہ ہوا کہ جس عظیم سترہ سالہ نوجوان سپہ سالار نے ہزاروں میل سے آ کر برہمنی سامراج کے چمکتے سورج کو ہمیشہ کے لئے بے نُور کر دیا' اور جس کے جہاد کے نتیجے میں بالآخر نظریۂ پاکستان نے مملکت پاکستان کی صورت اختیار کی' اُس کی حقیقی یادگار کو ہم آنے والی نسلوں کے لئے کوئی یادگار قائم نہ کر سکے۔

عصر حاضر کے عظیم مورخ اور محقق مولانا قاضی اطہر مبارک پوری بھارت سے اروڑ تشریف لائے تو محمد بن قاسم کی مسجد کو دیکھ کر انہوں نے اپنے تاثرات یوں بیان کئے:

''یہ نشان ہماری عظمتِ رفتہ ہیں۔ ان میں ہمارا ماضی پوشیدہ ہے۔ حجاج بن یوسف کا جواں سال بھتیجا محمد بن قاسم شیراز سے آتا ہے۔ پہلی صدی ہجری میں اس سرزمین میں ایمان کا بیج بوتا ہے۔ اب ہمیں اُن عظمتوں کے نشانات کو اندھیروں سے نکال کر باہر لانا ہے۔ یہ دھندلے نشان ہماری عظمتوں کے امین ہیں۔ ہمیں محض دیواروں کی نہیں' اپنے افکار و نظریات کی حفاظت کرنی ہے۔ یہ ویرانے' یہ خرابے کبھی علم و فضل سے عبارت تھے۔ ہمیں اپنے ایمان' بھی اخلاق و کردار' عقائد و افکار کو عظمتِ رفتہ کے حوالے سے بھی روشن کرنا ہے اور آپ کو اِس مملکتِ پاکستان اور

7

محمد بن قاسم کا کردار

محمد بن قاسم کا کردار

محمد بن قاسم کی قیادت میں مسلمانوں کے فوجی حملے سے پہلے اسلام ہندوستان میں بذریعہ تبلیغ داخل ہو چکا تھا اور جنوبی ہند میں اسلام مبلغوں' تاجروں' صوفی درویشوں اور سیاحوں کے ذریعے برابر ترقی کر رہا تھا۔ جب محمد بن قاسم اس خطے میں داخل ہوا تو اسلام گزشتہ 70 برسوں سے یہاں جانا پہچانا تھا۔ حضرت عمر فاروقؓ کے عہد خلافت میں مکران کی فتح (642ء) سے محمد بن قاسم کے ورود (712ء) تک یہاں پانچ مسلم ریاستیں قائم ہوئیں' جن کی حکومت کی مدت 150 سال سے کم نہ تھی۔

خلافت راشدہ کے دور میں اسلامی افواج اس خطے میں بارہ مرتبہ آئیں۔ گویا مسلمانوں کا یوں بار بار آنا بھی اسلام کی اشاعت کا سبب بنا۔ ان افواج کے ساتھ متعدد صحابہ کرام' تابعین' تبع تابعین' مجاہد' سپہ سالار' ادیب' عالم' شاعر بھی ساتھ آئے' جن میں اکثر یہیں رہ پڑے۔ محمد بن قاسم کی فوجی مہم کے وقت ابھی بہت سے صحابہ کرامؓ زندہ تھے' جنہوں نے اس مہم کی کامیابی کے لئے دعائیں مانگی تھیں۔ مدینہ میں حضرت سہل بن سعد ساعدی اور حضرت جابر بن عبداللہ' بصرہ میں حضرت انس بن مالک' کوفہ میں حضرت عبداللہ بن اوفی اور دمشق میں حضرت ابوامامہ بن باہلی تھے۔

محمد بن قاسم کی مسجد: محمد بن قاسم کو حجاج بن یوسف نے بھیجا تھا۔ اُسی نے واپس بلا لیا۔ لیکن اُس کی واپسی کے تیرہ سو برس کے بعد' آج بھی ہندوستان میں اُس کی بنائی ہوئی پہلی مسجد کے کھنڈر کی زیارت کے لئے دور دراز سے لوگ آتے ہیں اور محمد بن قاسم کی رُوح کے لئے ایصالِ ثواب کی دعائیں مانگتے ہیں۔ اس مسجد کے کھنڈر روہڑی (سکھر) سے پانچ میل جنوب میں اروڑ میں زیارت گاہِ خاص و عام ہیں۔ اروڑ اسلامیانِ ہند کا پہلا دارالحکومت تھا۔ اس کی بنیاد محمد بن قاسم نے 712ء میں رکھی تھی۔ اس

اس کے نظریے کی قدر کرنی ہے۔ یہ قدر انفرادی و اجتماعی زندگی کے ذریعے سے کرنی ہے۔ ہمیں اپنے شاندار ماضی کو دہرانا ہے۔''

عالم اسلام کے نامور مفکر مولانا سعید احمد اکبر آبادی' ڈائریکٹر شیخ الہند اکیڈمی' دیوبند' جب 1984ء میں محمد بن قاسم مسجد کے کھنڈر کی زیارت کے لئے اروڑ آئے تو اُن کے جذبات کا یہ عالم تھا: ''تاریخ میں اروڑ بہت اہم جگہ ہے۔ محمد بن قاسم نے راجا داہر کو شکست دینے کے بعد یہاں پہلا کام یہ کیا کہ مسجد کی بنیاد رکھی اور عسکر گاہ (چھاؤنی) تیار کی۔ یہ بات ضروری ہے کہ یہاں پر اسلامی اہتمام و انتظام کے لئے ایک عظیم الشان علمی ادارہ قائم کیا جائے جو ہماری گزشتہ تاریخی روایات کے ساتھ پوری مطابقت رکھتا ہو۔ اگر ایسا ہو جائے تو یہ بہت بڑا کارنامہ ہوگا اور گویا ہم اپنے ماضی کی روایات کا احیاء اور انہیں زندہ کر سکیں گے۔''

خاکسار راقم السطور بھی دو مرتبہ اِس مسجد کی زیارت یعنی اسلام کی درخشندہ روایات کی خوشبو کو اپنے جذبات و محسوسات میں رچانے بسانے کے لئے جا چکا ہے۔ دونوں مرتبہ میں نے پاکستان اور اسلام کے اہل ثروت سے گزارش کی کہ جہاں وہ نئی نئی بستیاں اور نئی نئی مسجدیں آباد کر رہے ہیں مثلاً جماعتِ اسلامی کے زیر اثر اسلام آباد کے نواح میں ایک بہت بڑی نئی بستی آباد کی جا رہی ہے' ظاہر کہ وہاں مسجدیں بھی تعمیر ہوں گی' مثلاً میاں محمد نواز شریف نے ماڈل ٹاؤن میں ایک عظیم الشان محل تعمیر کرایا' اور اُس کے صحن میں ایک مسجد تعمیر کرائی' جہاں ڈاکٹر طاہر القادری جیسے علمائے دین ایک عرصے تک درسِ قرآن دیتے رہے۔ حکومتِ پاکستان اور حکومت سندھ سے اچھی چیزوں کی توقع عبث ہے۔ کیا پوری دنیائے اسلام میں ''ندائے خلافت'' کا کوئی قاری ایسا نہیں ہے جو محمد بن قاسم کی اس چھوٹی سی مسجد کے کھنڈر کو ایک شاندار مسجد میں بلند و بالا کر سکے۔ پاکستان کے عظیم جوہری سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے شہاب الدین غوری کا مزار پختہ کرانے پر زرِ کثیر صرف کر دیا۔ کاش کوئی ڈاکٹر عبدالقدیر خان جیسی شخصیت اروڑ کی طرف توجہ کرے۔ روہڑی جنکشن سے صرف پانچ میل کے فاصلے پر اسلامیانِ ہند کا یہ پہلا دارالحکومت بہت بڑا صنعتی شہر بن سکتا ہے' اور محمد بن قاسم کی مسجد..... اے کاش!

افسوس کہ محمد بن قاسم جیسے بہادر' فاتح اور منتظم نوجوان کو بنی اُمیہ کی گروہی عصبیت اور منتقم مزاجی نے بہت جلد ضائع کر دیا اور نہ صرف عہد اُمویہ بلکہ پورا عالم اسلام ایک عظیم فاتح کی مزید فتوحات سے محروم ہو گیا۔ اُس وقت کچھ ایسے نامناسب حالات پیدا ہو گئے تھے کہ قابل سے قابل افراد کو انتقام اور عداوت کی بھینٹ چڑھانے کو عین کامیابی سمجھا جاتا تھا۔ محمد بن قاسم کو بھی معزول کر کے عراق کے شہر واسط کے قید خانے میں ڈال دیا گیا۔ انہوں نے قید خانے میں بے پناہ مظالم و شدائد کا مقابلہ نہایت ثابت قدمی اور استقامت کے ساتھ کیا۔ اپنی وفات (717ء) سے چند روز پہلے انہوں نے اپنا مرثیہ خود لکھا۔ چند اشعار کا ترجمہ:

اگر میں اس وقت واسط کی سرزمین میں
زنجیروں کے حوالے کر دیا گیا ہوں
اگر میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے ہیں
تو کیا ہوا
میں اس سے پہلے فارس کے بہت سے جوانوں کو
لرزہ براندام کر چکا ہوں
اور بہت سے بہادروں کو موت کا مزا چکھا چکا ہوں
اگر مجھے اطمینان و سکون نصیب ہوتا
تو میدانِ جنگ کو شبِ عروسی بنا دیتا
انہوں نے مجھے ضائع کر دیا
اور کیا سور ما انہوں نے ضائع کر دیا
میں اُن کے لئے میدان میں گھمسان کی جنگ کے لئے
اور محاذ پر اُن کی حفاظت کے لئے
قابلِ قدر اثاثہ ثابت ہوتا۔

محمد بن قاسم سترہ سال کی عمر میں سندھ آیا اور صرف ساڑھے تین سال سندھ میں رہا۔ اس مختصر سی مدت میں انہوں نے پورے سندھ کو فتح کر کے ایک ایسی عادلانہ نظامِ سلطنت کی بنیاد ڈالی جس کے دوست دشمن سب معترف تھے۔ اُن کی دانائی' تدبّر اور سلامت روی کا سکّہ سارے ملک پر بیٹھا ہوا تھا۔ ان تین برسوں میں وہ نظام رائج کیا جس کی بنا پر عرب تین صدیوں (محمود غزنوی کی آمد) تک حکومت کرتے رہے۔ محمد بن قاسم نے اپنی اصلاحات' اپنے ذاتی اخلاق اور اسلامی مساوات و اخوت کے طرزِ عمل سے سندھ کے لوگوں پر گویا جادو کر دیا۔ رعایا میں مسرت اور خوشحالی کی لہر دوڑ گئی۔ ہر طرف اسلامی حکومت کی تعریف ہونے لگی' یہاں تک کہ برہمن خود گاؤں گاؤں پھر کر اسلامی حکومت کے گن گانے لگے اور لوگوں کو حکومت کی وفاداری کی تلقین کرنے لگے۔

محمد بن قاسم جب سندھ سے رخصت ہونے لگے تو سارے سندھ میں اُن کے جانے پر اظہارِ افسوس کیا گیا۔ اُن کی وفات کی خبر موصول ہونے پر شہر کے کچھ ہندوؤں اور بودھوں نے شہر میں محمد بن قاسم کا ایک مجسمہ بنا کر اپنی عقیدت کا اظہار کیا۔

اب ہم برعظیم کی تاریخ کے اُس موڑ پر پہنچ چکے ہیں جہاں سندھ کی حکومت کا تعلق افغانستان کی غزنوی سلطنت سے پیدا ہوتا ہے۔ غزنوی حالات کے شروع ہونے سے پہلے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ سندھ میں عربوں کے تین سو سالہ دور کا جائزہ لیا جائے..... اور وہ بھی صرف مذہبی امور کی حد تک۔

اسلام نے عربوں کو مساوات' اخوت' رواداری' علم و فضل اور اخلاق و سیرت کی دولت سے مالا مال کیا تھا۔ وہ جہاں بھی گئے اور جس ملک میں بھی داخل ہوئے' انہوں نے ان ملکوں میں اسلام کے انہی بنیادی اصولوں کی تبلیغ کی اور حتی الامکان ان اصولوں کی بنیاد پر حکمرانی کی۔ قرائن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ انہوں نے عوام میں اسلام کی اشاعت و تبلیغ کی کوئی منظم کوشش نہیں کی۔ سندھ کی بیشتر آبادی کے مذہب کی تبدیلی رفتہ رفتہ اور کئی مراحل سے گزرنے کے بعد بتدریج ہوئی۔ دیبل' منصورہ' ملتان میں اور جہاں عربوں کی نو آبادیاں تھیں' علمائے دین کی کمی نہ تھی۔

سب سے پہلے جس مصنف کے سندھ میں آنے کا بالوضاحت نام ملتا ہے وہ ربیع بن صبیح سعدی بصری تھے جو 775ء میں فوج کے ہمراہ یہاں تشریف لائے۔ آپ تابعی تھے۔ آپ نے حدیث نبوی کی تدوین میں حصہ لیا۔ سندھ ہی میں وفات پائی۔

ابومعشر سندھی نومسلم تھے اور مدینہ منورہ میں مدت تک رہنے کی وجہ سے مدنی کہلاتے تھے۔ اپنے زمانے میں فن مغازی و سیر کے امام تھے' بلکہ مورخین آپ کو اُن بزرگوں کی فہرست میں شامل کرتے ہیں جو آنحضور ﷺ کے غزوات اور سیر کو اوّل اوّل ضبط تحریر میں لائے۔ 786ء میں وفات پائی۔ آپ کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ آپ کی نمازِ جنازہ خلیفہ ہارون الرشید نے پڑھائی۔

دوسرے نومسلم محدث رجاء السندھی تھے۔ انہیں بعض مورخین نے ''رکن من ارکان الحدیث'' لکھا ہے۔ 933ء میں وفات پائی۔ ان کے بیٹے بھی بڑے ممتاز محدث تھے اور بغداد میں درس دیا کرتے تھے۔ سندھ میں علم الحدیث سے دلچسپی شروع ہی سے تھی۔ قاضی عبدالکریم سمعانی نے متعدد محدثین اور علماء کا ذکر کیا ہے جو سندھی کے مختلف شہروں میں تھے۔ ان کے علاوہ ایک عربی سندھی شاعر ابو عطا سندھی کا نام بھی ملتا ہے' جس کے عربی اشعار کے اہل عرب معترف ہیں۔ حضرت بایزید بسطامی کے ایک استاد ابوعلی سندھی تھے۔ مولانا جامی نے ''نفحات الانس'' میں ہندو پاکستان کے فقط چھ سات صوفیہ کا ذکر کیا ہے جس میں ابوعلی سندھ کا ذکر بھی شامل ہے۔

ایک عرب سیاح مقدسی نے اپنے سفرنامے میں مسلمانوں کی نئی بستی منصورہ کے متعلق لکھا تھا: ''یہاں میں نے قاضی ابومحمد منصوری کو دیکھا جو امام داؤد ظاہری کے پیروکار تھے اور اپنے مذہب کے امام ہیں اور ان کی بہت سی اچھی تصانیف ہیں۔'' مقدسی نے سندھی مسلمانوں کی تعریف کی ہے: ''ان کے ہاں اسلام کو تازگی حاصل ہے اور علم اور اہل علم یہاں بہت ہیں''۔

منصورہ کی قابلِ ذکر ہستیوں میں ایک عرب نوجوان کا بھی ذکر آتا ہے جس نے الور (روہڑی) کے ہندو راجا کی استدعا پر قرآن مجید کا سندھی زبان میں ترجمہ کیا تھا۔

ہندو پاکستان میں سب سے قدیمی زیارت گاہ شیخ ابو تراب کا مزار ہے۔ شیخ تبع تابعی تھے اور عباسی خلافت کے وقت ضلع ساکورہ (سکھر؟) اور اس علاقے کے مضبوط قلعے قمرہ، شہر بکھر اور مغربی سندھ کے بعض مواضعات پر قابض تھے۔ آپ کے مزار کے گنبد پر تاریخ بنیاد 171ھ/788ء درج ہے۔ مولوی ابوظفر ندوی اپنی ''تاریخ سندھ'' میں یہ رائے دیتے ہیں کہ شیخ ابوتراب غالباً والئی سندھ کی طرف سے قلعہ دار (کمشنر) ہوں گے۔ سندھ گزیٹر میں لکھا ہے کہ شیخ ابوتراب نے بکھر (سکھر کے قریب) کا قلعہ فتح کیا اور بہادری کے دوسرے کارنامے انجام دیئے۔ آپ کا مزار ٹھٹہ سے دس میل کے فاصلے پر تحصیل میرپور ساکرو میں موضع گوجو کے قریب ہے۔ آپ کے مزار پر ہر مہینے چھوٹا سا میلہ لگتا ہے اور عوام الناس نے آپ کو ایک باکرامت پیر بنا دیا ہے۔ مقامی روایت ہے کہ اس علاقے میں تھارنہ نام کا ایک ہندو راجہ تھا۔ شیخ نے اپنی کرامت سے اُسے اور اُس کی فوج کو ایک پہاڑی کی صورت میں منتقل کر دیا۔ یہ پہاڑی بھی زائرین کو دکھائی جاتی ہے۔

8

محمود غزنوی: بُت شکن

پاکستان کو ''ہندو دشمنی'' کی بنیاد قرار دینے والے بھارت کے سیاست دان، انگریز مورخ اور پاکستان کے بھی بعض تاریخ داں ماضی کی جس شخصیت کا سب سے زیادہ حوالہ دیتے ہیں، وہ محمود غزنوی ہیں۔ مثلاً ڈاکٹر مبارک علی صاحب، جن کو جدید تاریخی نظریات کی روشنی میں قدیم تاریخی حقائق و واقعات کو ریزہ ریزہ کرنے اور اپنے محبوب موضوع ''طبقاتی کشمکش'' کے مفید مطلب ریزوں کو چُننے میں کمال حاصل ہے، محمود غزنوی کے بارے میں اپنی کتاب ''ہندوستان میں مسلم معاشرے کا المیہ'' میں یوں لکھتے ہیں: ''محمود غزنوی کی سامراجی پالیسی کی سزا اُس کے جانشینوں کو ملی اور اس کے مرتے ہی غزنوی سلطنت ٹکڑے ٹکڑے ہو کر ختم ہو گئی۔ محمود غزنوی کے سترہ حملے اور مندروں کی تباہی و بربادی صرف غزنوی مؤرخوں کے ہاں موجود رہا، جبکہ ہندو مؤرخ بہت جلد اسے بھول گیا اور سومناتھ کا مندر دوبارہ تعمیر ہو گیا اور اس کی تباہی کی کوئی یادگار باقی نہیں رہی، لیکن پاکستان کے فرقہ وارانہ ماحول میں دوبارہ اس کی شخصیت کو ابھارا گیا اور ہندوستان پر اُس کے سترہ حملوں اور مندروں کی تباہی کو فخر کے ساتھ پیش کیا گیا، تاکہ فرقہ پرستی کے جذبات پروان چڑھیں''۔

ابوالقاسم محمود (971ء-1030ء) امیر الپتگین کا نواسہ اور امیر سبکتگین کا بڑا بیٹا تھا۔ وہ بچپن ہی سے بہت ذہین و فطین، ہونہار اور بہادر تھا۔ اُس کی تربیت مشرقی سلاطین کے شہزادوں کی طرح کی گئی۔ اُس وقت کے بڑے بڑے علماء کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اس نے بہت جلد دینی علوم کی تکمیل کر لی۔ وہ حدیثِ رسولؐ اور فقہ میں مکمل واقفیت رکھتا تھا۔ آغازِ شباب میں محمود نے غزنی میں ایک خوبصورت باغ لگوایا اور اس باغ میں ایک نہایت حسین اور خوبصورت عمارت تعمیر کرائی۔ جب باغ اور عمارت کی تکمیل ہو گئی تو اُس نے اپنے والد اور عمائدین کو مدعو کیا۔

جب والد نے باغ اور عمارت کو دیکھا تو بہت خوش ہوا، مگر سب کچھ دیکھ کر محمود سے کہا: ''بیٹے یہ باغ اور عمارت اگرچہ بہت ہی خوبصورت اور دلکش ہے، لیکن اس طرح کا باغ اور اس طرح کی عمارت ہر ایک امیر بنا سکتا ہے۔ بادشاہوں کی شان تو اس کی متقاضی ہے کہ ایسی عمارت کی طرح ڈالیں کہ دوسرے اُس کی مثیل نہ بنا سکیں''۔

محمود نے ادب سے پوچھا ''وہ کون سی عمارت ہے جس کا آپ ذکر فرما رہے ہیں؟''

سبکتگین نے جواب دیا: ''اِس عمارت سے مُراد اہلِ علم کے دل ہیں۔ اس عمارت کی زمین میں اگر تم اپنے احسان اور محبت کی تخم ریزی کرو اور بارآور ہو تو اُس کے پھل البتہ اس قابل ہوں گے کہ اُن کے چکھنے سے تمہیں دین و دنیا کی سعادت کا مزا ملے گا''۔

جس دل میں آغاز ہی میں علم اور اہلِ علم کی محبت بھر دی گئی ہو اُسے ''سامراج'' جیسے بدنما لفظ سے منطبق کرنا بعض مورخین کی جنبہ داری اور ہندو نوازی سے زیادہ کچھ نہیں۔ اُس کی بت شکنی کو اُس کے سولہویں حملے (1025ء) کی وجہ سے ''لٹیرا اور رہزن'' ہونے کا الزام عائد کیا جاتا ہے، اُس حملے کی حقیقت یہ ہے:

سومناتھ کا بُت: بھارت کے موجودہ علاقے گجرات میں، جہاں واجپائی کی موجودہ حکومت میں مسلم کشی کے بدترین واقعات ہوئے ہیں، ایک شہر ہوا کرتا تھا، سومناتھ، اور اُس کے اندر ایک بہت بڑا مندر ہوتا تھا، جسے محمود نے تباہ کر دیا تھا اور جیسا کہ ڈاکٹر مبارک علی صاحب نے فرمایا، اُسے تو ہندوؤں نے دوبارہ تعمیر کر لیا۔ اُس زمانے میں یہاں بحری بیڑوں کا اڈہ تھا اور اکثر عرب جہازوں کو لوٹ لیا جاتا تھا۔ گجرات میں مسلمانوں کے ساتھ اُس وقت بھی بڑی زیادتیاں کی جا رہی تھیں۔ سومناتھ شہر میں مسلمان تاجروں کی ایک بستی تھی، جہاں ایک بڑے متقی بزرگ محمد بن حسن عراقی مقیم تھے، جو محمود شاہ منگرولی کے نام سے مشہور تھے۔ اُن سے مسلمانوں کی حالتِ زار دیکھی نہ گئی اور انہوں نے محمود غزنوی کو خط لکھا کہ وہ آ کر مسلمانوں کو مصائب و شدائد سے نجات دلائیں (سات سو برس بعد ایک ایسا ہی خط شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے افغانستان کے بادشاہ احمد شاہ ابدالی کو تحریر کیا تھا)۔

تواریخ میں یہ بھی لکھا ہے کہ ایک نئے مہنت کی جانشینی کے جھگڑے میں کسی فریق نے سلطان محمود سے مدد مانگی اور اُس کو اپنی فوج کے ساتھ آنے کی دعوت دی۔ اس کے علاوہ عہد وسطیٰ کے ہندوستان میں مندر ایک طرف مال و دولت اور عیاشی کے مراکز بن گئے تھے، دوسری طرف مظلوم عوام کے مقابلے میں ہمیشہ ظالم راجاؤں اور سرداروں کی حمایت کرتی تھیں۔ تیسری طرف مقتدر قوتیں مندروں کو اپنے اقتدار کے لئے بے دریغ استعمال کرتے تھے۔ چنانچہ عبادت گاہوں کو ہر قسم کی سازشوں کا اڈہ اور فتنوں کا سرچشمہ بنا دیا گیا تھا۔

سومناتھ کے مندر اور اُس کے اندر رکھے ہوئے بڑے بُت کے متعلق کرامات، اوہام اور خرافات کی شہرت نے اس کو ان عقائد کا سب سے بڑا مرکز بنا دیا تھا، جن کا سہارا لے کر اور جن کی دہائی دے کر ہندوستان کے راجے مہاراجے ہندوؤں کے مذہبی جذبات کو مشتعل کرتے تھے اور اُن کی اِس اشتعال

انگیزی کے نتیجے میں بار بار سلطنت غزنی کے خلاف شورشیں برپا ہوتی رہتی تھیں۔ پچھلی متعدد جنگوں میں ہارے ہوئے راجے مہاراجے' جن کو محمود معاف کر دیا کرتا تھا اور وہ اس کی اطاعت کا عہد بھی کر لیتے تھے' بہت جلد بغاوت پر آمادہ ہو جاتے تھے۔ یہ خیال عام تھا کہ سومناتھ ناقابل شکست ہے اور جب تک وہ باقی ہے' محمود ہندوستان کو فتح نہیں کر سکتا۔ سومناتھ کو سومنات بھی لکھا جاتا ہے' لیکن کلیم چغتائی صاحب کا یہ خیال درست معلوم ہوتا ہے کہ سومناتھ ہی صحیح ہے۔ یہ دو الفاظ کا مرکب ہے' سوم یعنی چاند اور ناتھ یعنی دیوتا۔ یہ مندر ''چاند دیوتا'' کے لئے وقف تھا۔

محمود غزنوی کو یہ اطلاعات مل گئی تھیں کہ سومناتھ کے مندر میں مسلمانوں کے خلاف بڑے پیمانے پر سازشیں ہو رہی ہیں۔ سومناتھ پر حملے کی غرض سے محمود نے راجپوتانے کا راستہ اختیار کیا' تاکہ گجرات کے راجا کو اُس کی آمد کا پہلے سے علم نہ ہو سکے۔ 18 اکتوبر 1025ء کو محمود اپنے دارالحکومت غزنی سے روانہ ہوا۔ ملتان میں قیام کیا' جس کے دوران صحرائی سفر کی تیاریاں کیں۔ ہر سپاہی کو صرف پانی لے جانے کے لئے دو اونٹ دیئے۔ دیگر سامان کے لئے الگ اونٹ تھے۔ اس کے علاوہ ہنگامی ضرورت کے لئے مزید بیس ہزار اونٹوں پر پانی کا ذخیرہ جمع کیا۔ فوج میں تیس ہزار باقاعدہ سپاہی موجود تھے۔ 26 نومبر کو محمود کی فوج نے ملتان سے کوچ کیا اور راجستھان کا صحرا عبور کر کے لاروہ پہنچے جو اُس زمانے میں جیسلمیر کا دارالحکومت تھا۔ لاروہ کا قلعہ فتح کر کے وہ انہلواڑہ پہنچے (دریائے سرسوتی کے کنارے یہ شہر اب پٹن کہلاتا ہے)۔ یہاں کا راجا بھاگ گیا۔

6 جنوری 1026ء کو محمود سومناتھ پہنچ گیا۔ یہاں کے مضبوط مندر کے پجاری مسلمانوں پر ہنس رہے تھے۔ اُن کا خیال تھا کہ مسلمانوں کی موت انہیں یہاں کھینچ لائی ہے اور سومناتھ کا دیوتا اِن سب کو برباد کر دے گا۔ محمود کی فوج نے پورے شہر کا محاصرہ کر لیا۔ مندر میں موجود ہندوؤں کی فوج بڑی بہادری سے لڑی' لیکن شام کے سایے دراز ہو گئے اور جنگ کا کوئی فیصلہ نہ ہو سکا۔ دوسرے دن جمعہ تھا۔ اسلامی فوج کی جانب سے تیروں کی بارش کے آگے ہندو سینا جم نہ سکی اور قلعے کی فصیل سے ہٹ گئی۔ مسلمان سپاہی فصیل پر چڑھ گئے اور ان کے دل ہلا دینے والے نعرہ ہائے تکبیر سنائی دینے لگے۔ ہندوؤں نے اپنی پوری قوت مجتمع کر کے حملہ کیا اور مسلمانوں کو فصیل چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ تیسرے دن پھر مسلمانوں نے قلعے کی فصیل پر قبضہ کر لیا اور گھمسان کی جنگ شروع ہو گئی۔ ہندو پجاریوں کی حالت دیدنی تھی۔ اب انہوں نے طرح طرح کے شعبدے دکھا کر' کبھی لالچ' کبھی خوف دے کر محمود کو بڑے مندر پر حملہ کئے بغیر لوٹ جانے کی کوشش کی' لیکن جب وہ فتح سومناتھ کے ارادے پر قائم رہا تو تشویش بڑھی۔ وہ بھاگ بھاگ کر مندر میں جاتے اور دیوتاؤں کے آگے گڑگڑاتے۔ پھر لوٹ کر مسلمانوں کے خلاف لڑنے لگتے۔ پروہتوں نے بڑی کوشش کی کہ محمود کو زیادہ سے زیادہ دولت دے کر بتوں کے توڑنے سے باز رکھا جائے' خصوصاً اُس بڑے بُت کو بچا لیا جائے جس کے اندر زر و جواہر کا ایک خزانہ محفوظ تھا۔

اسی موقع پر' جبکہ پروہتوں نے اسے منہ مانگی دولت دینے کی پیشکش کی' محمود غزنوی نے یہ تاریخی جملہ کہا تھا: ''میں بُت فروش نہیں' بُت شکن کہلانا چاہتا ہوں''۔ اس اعلان کے ساتھ ہی محمود نے ہندوستان کے سب سے بڑے بُت کو توڑ ڈالا اور بُت پرستی کی شہ پر ہونے والی تمام سیاسی فتنہ پردازیوں کا خاتمہ کر دیا۔ اب ملک میں اقتدار کا کوئی ایسا بت باقی نہیں رہا' جس کے بل پر ہندوستان کا کوئی راجا سلطنت غزنی کے خلاف محمود کی زندگی میں کوئی سازش اور شورش برپا کرنے کی ہمت کرتا۔ سومناتھ ایک قلعہ تھا' دیومالا کا' خزانوں کا' فتنوں اور سازشوں کا۔ اُس کے ٹوٹ جانے سے پورا ہندوستان محمود غزنوی کے ہاتھوں مفتوح ہو گیا۔ فتح سومناتھ ہندوستان کی تاریخ کا وہ اہم ترین سنگ میل ہے' جس نے اس عظیم ملک کو عہد قدیم کی تاریکیوں سے نکال کر دورِ جدید کی روشنی کی طرف مائل کر دیا۔

کون ہے وہ تاریخ داں جو انصاف کی قسم کھا کر کہہ سکے کہ اُس نے ہندوستان پر حملے دولت کے لالچ میں کئے۔ اگر یہ بات درست ہوتی تو محمود سومناتھ کے بڑے بت کو نہ توڑتا' کیونکہ اُسے بت نہ توڑنے کے بدلے بڑی رقم کی پیشکش کی گئی تھی۔ اس کے علاوہ سومناتھ فتح کرنے کے بعد محمود کھمبایت اور بھڑوچ جیسے دولت مندوں کی طرف بھی جا سکتا تھا' جہاں سے وہ بے تحاشا دولت اکٹھی کر سکتا تھا' لیکن وہ نہیں گیا۔ محمود نے تو سومناتھ میں ایک دن بھی رُکنا گوارا نہ کیا۔ وہ کچھ اور ملتان پہنچا اور واپس غزنی پہنچ گیا۔

سومناتھ کی فتح ایسا واقعہ تھا جس نے دنیا بھر میں دھوم مچا دی۔ خلافتِ عباسیہ' بغداد کے 45 ویں خلیفہ القائم بامر اللہ نے محمود کو علم اور خط بھیجا' جس میں محمود کو خراسان' ہندوستان' اور خوارزم کا گورنر مقرر کیا گیا تھا اور اُسے ''کہف الدولہ'' اور ''جمال الملت'' کے خطابات دیئے گئے تھے۔ اُس وقت تک سلطنتِ غزنویہ بے حد وسیع اور مستحکم ہو چکی تھی اور اُس میں خراسان' طبرستان' پورا پنجاب' موجودہ صوبہ سرحد' افغانستان' اصفہان' عراق' ہمدان' مشرق میں گنگا کا کنارہ' شمال میں دریائے آمو تک اور جنوب میں بلوچستان اور مکران کے ساحل تک کے علاقے شامل تھے۔

محمود اور اشاعتِ اسلام:

محمود حافظِ قرآن تھا۔ عربی' فارسی اور ترکی کا عالم تھا۔ اُسے مروجہ علوم کے ساتھ ساتھ دینیات اور الٰہیات پر عبور تھا۔ عسکریات کے ساتھ ساتھ اخلاقیات کا بھی ماہر تھا۔ شاہ معین الدین احمد ندوی نے اپنی تصنیف ''تاریخ اسلام'' میں لکھا ہے کہ محمود کا شمار ممتاز حنفی فقہاء میں تھا۔ فصاحت و بلاغت میں یگانہ روزگار تھا۔ فقہ' حدیث' قرآن اور خطبات و رسائل میں اُس کی متعدد تصانیف ہیں۔ چنانچہ فقہ حنفی میں محمود کی کتاب ''الفرید فی الفروع'' جودتِ بیان اور کثرتِ مسائل کے حل کے اعتبار سے امتیازی درجہ رکھتی ہے۔

محمود ایک نکتہ سنج شاعر تھا۔ علماء و ادباء اور حکماء و شعراء کی قدردانی کے لئے تو محمود نے ایک مستقل محکمہ قائم کر رکھا تھا۔ باکمالوں کو وہ ہر جگہ سے خود بھی بلاتا تھا اور اُس کی قدر شناسی کا چرچا سن کر ہر علم و فن کے ماہرین اُس کی طرف رجوع بھی کرتے تھے۔ اُس کے عہد میں غزنی ایشیا کا سب سے متمدن شہر تھا۔ غزنی گویا ایشیا کا علمی و ادبی پایہ تخت بھی تھا۔ اُس عہد کے سب سے بڑے عالم' سب سے بڑے شاعر' سب سے بڑے ادیب یہاں جمع تھے۔ فردوسی' عنصری' مسجدی' فرخی' ابوسعید ابوالخیر اور عربی انشاپرداز بدیع الزماں ہمدانی محمود ہی کے دور میں تھے۔ البیرونی خوارزم کا دربار چھوڑ کر غزنی چلا آیا اور پھر کچھ عرصہ ہندوستان میں رہا۔ یہاں کے چشم دید مشاہدات کو اُس نے ''کتاب الہند'' میں رقم کیا۔

محمود غزنوی کے زمانے میں خلافتِ عباسیہ کمزور ہو چکی تھی اور اُس کا زوال شروع ہو چکا تھا۔ یہاں تک کہ وہ قرامطہ کے فتنے سے حج کے راستے کو بھی محفوظ رکھنے کے قابل نہیں رہ گئی تھی۔ ایسے حالات میں علمائے وقت نے محمود سے مدد طلب کی اور اُس نے کئی سال سے رُکے ہوئے حج کی ادائیگی کو دوبارہ جاری کرنے کے لئے اپنے امراء اور سپاہیوں کے ساتھ ایک کاروانِ حج مکہ معظمہ کی طرف روانہ کیا۔ جو شرپسند اُس کے راستے میں آئے' اُن کا خاتمہ کرا کے حج کا راستہ صاف کیا۔ اس کے علاوہ خراسان' ہندوستان میں جہاں جہاں اسلام دشمن قرامطہ نے طاقت حاصل کر لی تھی' وہاں فوج کشی کر کے محمود نے ان کا قلع قمع کر دیا۔

سلطان محمود ایک راسخ العقیدہ مسلمان' عالمِ دین' مجاہد اور مبلغ تھا۔ وہ نہ تو لہو و لعب میں مشغول ہوتا تھا اور نہ بدعات و خرافات کا روادار تھا۔ اُس کے تقویٰ اور خدا ترسی کا یہ عالم تھا کہ متعدد مواقع پر میدانِ جنگ میں اُس نے سربسجود ہو کر اللہ تعالیٰ سے فتح و نصرت کی دعائیں مانگیں اور

وہ سب قبول ہوئیں۔ اپنے ایمان کی مضبوطی کے سبب وہ کبھی دشمن کے لشکر کی تعداد اور ساز و سامان سے خوف زدہ نہیں ہوا اور اکثر اس نے کم سے کم لشکر اور اسلحے کے ساتھ بڑی بڑی فوجوں کو شکست دی۔ امن و جنگ کے سلسلے میں وہ اسلام کی شرائطِ جہاد کی پابندی کرتا تھا' نہ بے قصور عوام کو ستاتا تھا اور نہ اس کے اسبابِ معیشت کو تباہ کرتا تھا۔ وہ اپنے قول و فعل دونوں سے اسلام کی تبلیغ کرتا تھا۔ اُس نے کبھی غیر مسلموں پر جبر نہیں کیا۔

شیخ ابوالحسن خرقانی کے ساتھ محمود کی ملاقات اور گفتگو ایک بڑے عالم اور مرشد وقت کے ساتھ ایک متقی سلطان وقت کا فکر انگیز رابطہ تھا۔ دونوں نے شریعتِ محمدی کی حدود اور اسلامی آداب و اخلاق کی روشنی میں گفت و شنید کی۔ شیخ نے سلطان کی دین داری سے متاثر ہو کر اُسے ایک خرقہ عنایت کیا' جس کے بارے میں روایت ہے کہ وہ محمود کے لئے باعثِ برکت تھا۔

وحشی غوری قبائل کو سلطان محمود نے مشرف بہ اسلام کیا۔ ترکوں اور تاتاریوں تک بھی اسلام کا پیغام کسی نہ کسی شکل میں اُس کے ذریعے پہنچ گیا تھا۔ ہندوستان میں اشاعتِ اسلام کا دروازہ اُس نے کھول دیا۔ سندھ اور ملتان میں اُس نے بدعقیدگی کا استیصال کر کے اسلام کی تجدید کی۔ سلطان محمود کی وجہ سے لاہور اسلام کی اشاعت و ترویج کا ایک بڑا مرکز بن گیا۔ وسط ایشیا کے مبلغین اور علمائے دین کے لئے محمود کی فتوحات کے سبب ہندوستان میں تبلیغ دین کی راہ ہموار ہو گئی۔

اسلام کی اشاعت و حفاظت کے لئے سلطان محمود کی یہی خدمات ہیں جن کے باعث اُسے مختلف وقتوں میں خلیفۂ بغداد نے امین الملت' یمین الدولہ اور کہف الدولہ والاسلام کے خطابات عطا کئے۔ حقیقت یہ ہے کہ گیارھویں صدی عیسوی کی پہلی چوتھائی میں خلافتِ اسلامیہ کا دست بازو سلطان محمود ہی تھا۔ دنیائے اسلام کے خلاف صلیبی جنگوں کا آغاز محمود کی وفات کے ساٹھ سال بعد ہوا۔ خلافت بغداد پر تاتاری آفت ڈھائی سو سال بعد ٹوٹی اور سپین سے مسلمانوں کا اخراج چار سو سال بعد ہوا۔ بعد کی سلجوقی سلطنت' خلافتِ عثمانیہ اور سلطنتِ مغلیہ کے لئے محمود غزنوی ایک نشانِ راہ بن گیا۔

دورِ غزنویہ کے علماء و مشائخ:

عہدِ غزنویہ میں پاکستان کے جس شہر نے سب سے زیادہ فروغ حاصل کیا' لاہور تھا' لیکن اس سرزمین میں اسلام کے قدیمی گہوارے سندھ اور ملتان کے علاقے ہیں۔ ان میں اب عرب کے علاوہ بلادِ عجم سے بھی علمائے دین و صوفیائے کرام آنے شروع ہو گئے تھے۔ اگر سندھ میں شیخ ابوتراب تابعی کے مزار کو' جو فی الواقعی ایک ملکی و انتظامی حاکم تھے' شمار نہ کیا جائے تو سرزمین پاک و ہند میں سب سے قدیم اسلامی زیارت گاہ اُچہ میں شیخ صفی الدین حقانی گارزونی کا مزار ہے۔ وہ مشہور صوفی بزرگ خواجہ ابواسحاق گارزونی کے مرید اور بھانجے تھے۔ شیخ صفی الدین 926ء میں پیدا ہوئے۔ سترہ برس کی عمر میں اُچہ تشریف لائے اور 1007ء میں وفات پائی۔ شیخ عبدالحق محدث ''اخبار الاخیار'' میں لکھتے ہیں: ''قصبہ اُچہ کی بنیاد شیخ صفی الدین گارزونی نے رکھی۔ اُن کے ماموں اور مرشد شیخ ابواسحاق نے انہیں خلافت سے فیض یاب کر کے حکم دیا کہ تم اونٹ پر سوار ہو جاؤ اور جدھر اونٹ جائے' اُسی طرف چلتے جاؤ۔ جب اونٹ اُچہ کی سرزمین میں پہنچا تو ایسا بیٹھا کہ اٹھنے سے انکار کر دیا۔ شیخ نے یہیں توطن اختیار کیا۔ عمارتیں بنوائیں اور اس جگہ کو آباد کیا۔''

شاہ یوسف گردیزی

سندھ و ملتان کی دوسری زیارت گاہ ملتان میں شاہ محمد یوسف گردیزی کا مزار ہے۔ آپ کی تاریخ ولادت 1069ء اور تاریخ وفات 1152ء ہے۔ آپ بہرام شاہ غزنوی کے عہد میں گردیز سے ملتان تشریف لائے۔ آپ کا مزار ملتان کی مشہور زیارت گاہوں میں سے ہے۔ شاہانِ اسلام نے اس کے ساتھ بہت سی جاگیریں معافی میں دے رکھی تھیں' لیکن راجہ رنجیت سنگھ نے انہیں ضبط کر لیا۔

شیخ اسماعیل لاہوری

تواریخ میں سب سے پہلے جس مبلغِ اسلام کا نام آتا ہے' وہ شیخ اسماعیل لاہوری تھے۔ محمود غزنوی کے ہمراہ 1005ء میں لاہور آئے تھے۔ یہاں وعظ کیا۔ اُن کی مجلس وعظ میں سامعین کا ہجوم ہوتا تھا اور ہر روز سینکڑوں لوگ اُن کے ہاتھ پر اسلام قبول کرتے تھے۔ شیخ اسماعیل کے علاوہ لاہور میں ابوالحسن علی بن عمر بن حکم تھے جو ادیب و شاعر ہونے کے ساتھ ساتھ محدث بھی تھے۔

داتا گنج بخش

غزنوی عہد کی سب سے مشہور اور بابرکت شخصیت شیخ علی بن عثمان ہجویری کی ہے۔ وہ 1009ء کے قریب پیدا ہوئے اور مختلف اسلامی ممالک کے سفر کے بعد سلطان مسعود ابن محمود غزنوی کے عہد میں دو ساتھیوں کے ہمراہ لاہور تشریف لائے۔ یہاں آپ نے ایک مسجد کی تعمیر میں حصہ لیا۔ کچھ عرصے تک درسِ قرآن دیتے رہے۔ پھر تصنیف و تالیف میں مشغول ہوئے۔ کشف المحجوب اور کشف الاسرار اُن کی مشہور اور لازوال تصانیف ہیں۔ کئی ہندو آپ کے ہاتھ پر اسلام لائے' جن میں سے رائے راجو خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ وہ سلطان مودود ابن مسعود غزنوی کی طرف سے لاہور کا نائب تھا۔ مسلمان کرنے کے بعد آپ نے اُس کا عرف ''شیخ ہندی'' رکھا اور اُس کی نسل کے لوگ موجودہ محکمۂ اوقاف کے قائم ہونے تک آپ کے مزار کے خادم اور مجاور تھے۔ داتا گنج بخش کی وفات 1072ء کے قریب ہوئی۔

سلطان سخی سرور

آپ کا نام سید احمد تھا اور سلطان سخی سرور یا لکھ داتا کے لقب سے مشہور ہیں۔ مضافاتِ ملتان میں موضع کُرسی کوٹ میں پیدا ہوئے۔ مشہور ہے کہ تصوّف میں اپنے والد کے علاوہ حضرت غوث اعظم اور شیخ شہاب الدین سہروردی سے فیض حاصل کیا۔ وزیر آباد کے پاس موضع سوہدرہ میں اقامت اختیار کی اور یادِ الٰہی اور ہدایتِ خلق میں مشغول ہوئے۔ بعد میں موضع دھونکل (نزد وزیر آباد) میں کئی سال رہے۔ بعد ازاں وطن کی محبت دامن گیر ہوئی اور ضلع ڈیرہ غازی خان کے ایک گاؤں میں' جسے اب شاہ کوٹ کہتے ہیں' واپس تشریف لے گئے۔ وہاں بھی آپ کو بڑا فروغ حاصل ہوا۔ حاکم ملتان گھنو خان نے اپنی بیٹی آپ سے بیاہ دی۔ لیکن اس سے حاسدوں کی آتش حسد بھی تیز ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے یکجا ہو کر آپ کو' آپ کے بھائی اور بیٹے اور اہلیہ محترمہ کو شہید کر دیا۔ یہ واقعہ 1181ء کا ہے۔ مزار شاہ کوٹ کے قریب ہے۔

عزیز الدین مکی

آپ کا وطن بغداد تھا۔ بارہ سال مکہ معظمہ میں مقیم رہے' اس لئے پیر مکی کے نام سے مشہور ہوئے۔ 1178ء میں لاہور تشریف لائے۔ اُس وقت لاہور میں غزنویہ حکومت تھی' لیکن سلطان محمد غوری پنجاب میں آ گیا تھا اور لاہور کا محاصرہ کر رہا تھا۔ لاہور کے غزنوی حاکم خسرو ملک نے آپ سے دعا کی درخواست کی۔ آپ نے فرمایا کہ ابھی چند سال تمہیں امان ہے' اس کے بعد لاہور میں غوریوں کی حکومت ہو جائے گی۔ سلطان غوری لاہور کا محاصرہ ترک کر کے سیالکوٹ کی طرف متوجہ ہوا اور چھ سال کے بعد پھر لاہور آ کر اس مقام کو فتح کیا۔ شیخ عزیز الدین 36 سال تک مصروف ہدایت رہے اور بڑی خلقت آپ سے فیض یاب ہوئی۔ بے شمار لوگوں نے آپ کے ہاتھ پر اسلام قبول کیا۔ آپ نے 1215ء میں رحلت کی۔ لاہور میں داتا گنج بخش کے مزار سے نصف میل کے فاصلے پر راوی روڈ پر آپ کا مقبرہ ہے۔

سید سالار مسعود غازی

سلطان محمود غزنوی کے بھانجے تھے۔ بڑے مجاہد اور

مبلغ تھے اور اُن کا خاص دائرہ کار اودھ تھا۔ سومناتھ کی فتح کے وقت سالار مسعود اپنے والد سالار ساہو اور محمود غزنوی کے ساتھ معرکے میں شریک تھے۔ اس کے بعد سلطان محمود کے ہمراہ غزنی چلے گئے۔ کچھ دنوں بعد سلطان کی اجازت سے آپ لاہور چلے آئے' جہاں اُن کے جھنڈے تلے مبلغوں اور مجاہدوں کی ایک جماعت اکٹھی ہوگئی۔ یہ جماعت دہلی کی طرف بڑھی۔ سالار مسعود غازی نے میرٹھ اور قنوج پر غلبہ حاصل کیا۔ 1032ء میں بہرائچ پہنچے اور وہاں دشمنوں نے مقابلہ کیا تو اُن کو شکست دی۔ 1033ء میں ایک لڑائی میں شہادت پائی۔ بہرائچ میں سالار مسعود غازی کا مزار ہے اور مسلم و غیر مسلم اُن کے یکساں معتقد ہیں۔

9

شہاب الدین غوری: اسلامی سلطنت کا بانی

معروف تاریخ نویس ڈاکٹر مبارک علی نے جس زاویۂ نظر سے محمود غزنوی پر نگاہ کی تھی' اُسی زاویے سے شہاب الدین غوری کو دیکھا۔ وہ اپنی تصنیف ''برصغیر میں مسلمان معاشرے کا المیہ'' میں لکھتے ہیں: ''شمالی ہندوستان میں مسلمان ترکوں کی شکل میں آئے اور یہاں پر اُن کا مقابلہ راجپوتوں سے ہوا جو خود ترکوں کی طرح جنگ جو اور لڑنے والے تھے۔ اس لئے اُن کے مقابلے میں جو جنگیں ہوئیں' وہ بڑی خوں ریز اور تباہ کن تھیں۔ اُس کے نتیجے میں قتل عام ہوئے۔ مندر لوٹے گئے۔ عورتوں اور بچوں کو غلام بنایا گیا اور مال غنیمت لوٹا گیا۔ چونکہ شمالی ہندوستان کی آبادی مسلمان نہیں ہوئی' اس لئے اُن کے ذہن میں ان جنگوں کی تلخ یادیں باقی رہ گئیں اور تاریخی قصے کہانیوں' لوک گیتوں اور خاندانی یادداشتوں کے ذریعے یہ تلخیاں سینہ بہ سینہ ایک نسل سے دوسری نسل تک منتقل ہوتی رہیں' اس لئے ترکوں اور مسلمانوں کا جو تصور شمالی ہندوستان میں اُبھرا' وہ ظالم' سفاک' خون ریز' خون آشام اور لٹیروں کا تھا۔ اس لئے یہاں ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت و عداوت کی خلیج حائل ہوگئی۔''

گویا ڈاکٹر صاحب کے تجزیے کی رُو سے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان نفرت و عداوت کا اصلی سبب وہ لوگ تھے جو ''ظالم' سفاک' خوں ریز' خون آشام اور لٹیرے'' تھے۔ اپنے تجزیے کو آگے بڑھاتے ہوئے ڈاکٹر مبارک علی صاحب رقم طراز ہیں: ''محمود غزنوی کی جنگیں ذاتی نوعیت کی تھیں اور بے مقصد جنگیں تھیں۔ یہ ایک طرف وسط ایشیا میں اپنی سلطنت کی حدود بڑھا رہا تھا تو دوسری طرف ہندوستان میں خون ریزی کے ذریعے مال و دولت لوٹ رہا تھا۔ اُس کی سلطنت کی بنیاد اُس کی ذات اور شخصیت پر تھی' اس لئے اُس کے مرتے ہی غزنوی سلطنت سمٹ کر ختم ہوگئی۔ شمالی ہندوستان کی فتح کا سہرا معز الدین غوری کے سر بندھتا ہے' لیکن غوری سامراج کی بنیاد کسی اعلیٰ مقصد پر نہیں تھی' بلکہ یہ بھی ذاتی عظمت کے لئے تھی۔ وہ اِن فتوحات کے ذریعے اپنے لئے ایک علیحدہ ریاست قائم کرنا چاہتا تھا''۔

شہاب الدین غوری اور اُس کی حکومت ایک پاکستانی تاریخ نویس ڈاکٹر مبارک علی کے نزدیک ''غوری سامراج'' کی حیثیت رکھتی تھی' تو تصویر کا دوسرا رُخ دیکھئے کہ پاکستان کے ایک اور دانشور اور مُسلم تاریخ پر ایک اور ہی مختلف زاویہ نظر سے نگاہ ڈالنے والے جناب مختار مسعود کو شہاب الدین غوری موجودہ پاکستان کے بانی مبانی نظر آتے ہیں۔ اپنی مشہور تصنیف' آوازِ دوست'' میں ایک جگہ لکھتے ہیں: ''تاریخ میں قائداعظم کا مقام متعین کرنے کے لئے ہم نے تاریخ پر نظر دوڑائی تو کتنی ہی فتوحات اور کتنے ہی فاتح یاد آئے۔ ہم نے پہلی نظر میں تین واقعات کو منتخب کیا۔ محمود کا سومنات' شہاب الدین کا تھانیسر اور ابدالی کا پانی پت۔ سومنات سے مقابلہ کیا جا سکتا ہے مگر وہ تاریخ کی رومانی شرح ہو جائے گی' جسے قائداعظم کی حقیقت پسندی کا لحاظ رکھتے ہوئے ہم نے نظر انداز کر دیا۔ پانی پت کی تیسری لڑائی کا مسلم ہند پر خوشگوار اثر پڑا' مگر وہ ناکافی تھا' کیونکہ اُس کا جیتنے والا کسی اور طرف نکل گیا۔ شہاب الدین غوری کے مقصد اور حاصل سے ہم نے قائداعظم کے نظریے اور مملکت کا موازنہ کیا تو ان دونوں میں بڑی مناسبت اور یگانگت پائی.....

''برعظیم کے مسلمانوں میں ملت کے وجود کا احساس اور اُس کے اظہار کے لئے ایک ریاست کی اساس رکھنا بارھویں صدی میں سلطان شہاب الدین غوری اور بیسویں صدی میں قائداعظم محمد علی جناح کے حصے میں آیا۔ شہاب الدین غوری نے برعظیم میں مسلمانوں کی جو حکومت قائم کی' وہ خاندانوں اور علاقوں کے تھوڑے بہت فرق کے ساتھ ساڑھے چھ سو سال قائم رہی۔ انگریزوں کے آنے سے یہ سلسلہ ٹوٹ گیا۔ نئی دنیا میں مسلم ہند کو ایک نئے شہاب الدین غوری کی تلاش تھی جو ایسی نئی فتوحات کرے' جس کا اثر صدیوں تک محسوس ہو۔ یہ کام قائداعظم نے کیا' تن تنہا اور صرف سات برس میں''۔

راقم السطور عرصے تک اس کھوج میں رہا کہ آخر مختار مسعود صاحب نے کس بنیاد پر شہاب الدین اور قائداعظم کا باہمی رشتہ تلاش کیا ہے۔ غوری ایک فاتح' گھڑ سوار' تلوار کا دھنی۔ قائداعظم آئین پسند' میز کرسی پر اطمینان سے بیٹھ کر دلائل کے ساتھ گفتگو کرنے والے۔ بالآخر جب ہم ترائن کے میدان میں پہنچے اور شہاب الدین اور پرتھوی راج کے درمیان پیغام رسانی کا سلسلہ پڑھا تو عقدہ کشائی ہوگئی۔

سلطان محمد غوری نے 1191ء میں ترائن کی پہلی لڑائی میں پرتھوی راج کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد قسم کھائی کہ جب تک وہ اس شکست کا بدلہ نہ لے گا' بیوی کا منہ نہ دیکھے گا اور نہ لباس ہی تبدیل کرے گا۔ چنانچہ ایک سال کی تیاری کے بعد اُس نے ایک لشکر جرار کے ساتھ ہندوستان پر حملہ کیا۔ جب اگلے برس 1192ء میں دریائے سرستی کے کنارے ترائن کے میدان میں خیمہ زن ہوا تو ہندو راجوں کے مشورے پر' پرتھوی راج نے شہاب الدین غوری کو یہ خط بھیجا: ''ہم ہندو راجاؤں کے لشکر کی اہمیت تو تمہیں معلوم ہے۔ ہمارے ساتھ جس قدر لشکر ہے' وہ تمہیں اور تمہاری فوج کو تباہ کرنے کے لئے کافی ہے اور ابھی مختلف افواج کی آمد جاری ہے' جن کے قدموں سے زمین کا سینہ کانپ رہا ہے۔ اگر تمہیں جان عزیز ہے تو اپنے سپاہیوں کی غربت پر رحم کھاؤ اور واپس چلے جاؤ' ورنہ یاد رکھو' کل صبح ہم اپنے تین ہزار ہاتھیوں اور بے شمار توپچیوں کی فوج سے میدانِ جنگ کو میدانِ حشر بنا دیں گے اور اس کے نتیجے میں تمہیں شکست کھا کر ذلت و رسوائی کے ساتھ یہاں سے بھاگنا پڑے گا''۔

ہندو راجاؤں کا یہ مشترکہ تہدیدی خط پڑھ کر شہاب الدین نے سوچا کہ ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ مسلمانوں کا نباہ کبھی نہ ہو سکے گا۔ ہندو اور چیز ہے' مسلمان کا خمیر کسی اور چیز سے بنا ہے۔ اس لئے اُس نے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان آئے دن کے فسادات اور جھگڑوں کو ہمیشہ کے لئے نمٹانے کے لئے صلح کی تجویز پیش کی۔ اس نے پرتھوی راج کے خط کے جواب میں یہ تجویز دی: ''مجھے یقین ہے کہ اس شرط پر صلح ہو سکتی ہے کہ سرہند' پنجاب اور ملتان پر تو غوریوں کا قبضہ رہے اور باقی

تمام ہندوستانی علاقے آپ کی حکومت میں چھوڑ دیئے جائیں"۔

گویا شہاب الدین غوری نے قیام پاکستان سے تقریباً ساڑھے سات سو سال قبل دو قومی نظریے کی شہادت دی۔ 1192ء میں اُس نے ہندوؤں کے سامنے تقسیم ہند کی تجویز رکھی تھی جو اُس وقت انہوں نے نامنظور کردی اور میدانِ جنگ میں عبرت ناک شکست کھانا منظور کیا' لیکن وہی تجویز قائداعظم نے محض آئینی طریق سے دلائل کے ساتھ' گفتگو کر کے انگریزوں اور ہندوؤں سے منوالی' جس کے نتیجے میں ہندوستان تقسیم ہوا اور پاکستان وجود میں آیا۔ مشرق میں بنگال اور مغرب میں وہ پورا علاقہ جس کی سرحدوں کی نشاندہی شہاب الدین غوری نے کی تھی' 14 اگست 1947ء کو آزاد ہوا۔ اور یہ دونوں علاقے ہندوؤں کی غلامی کے اندیشے سے ہمیشہ کے لئے چھوٹ گئے۔

آزاد بھارت کی جدید تاریخ داں محترمہ پروفیسر رومیلا تھاپر ہندوستان میں شہاب الدین غوری کی آمد کے بارے میں خاصی پریشان اور اُداس ہیں۔ قدرے حسرت و یاس کے ساتھ لکھتی ہیں: "محمود غزنوی 1030ء میں فوت ہوگیا اور یوں شمالی ہند کے لوگوں نے سکھ کا سانس لیا۔ محمود کا نام ہی سال کے سال لوٹ مار کے حملوں اور بت شکنی کے لئے مخصوص ہو کر رہ گیا تھا..... لیکن اہل ہند کو محمود کے سال کے سال حملوں سے بھی عقل نہ آئی اور انہوں نے یہ سوچنے تک کی زحمت گوارا نہ کی کہ اُن کے شمال مغرب میں لوگوں پر کیا بیت رہی ہے اور کیسے کیسے قیامت خیز واقعات رونما ہو رہے ہیں۔ قبائل نے چھوٹے چھوٹے اتحاد تو بنا لئے تھے' لیکن صرف اپنے اپنے قبیلے کی حفاظت کے لئے' قومی سطح پر دفاع کو مضبوط کرنے کی غرض سے نہیں۔ دفاع کا ایک ہی مطلب تھا کہ اپنے اپنے رجواڑوں کی سلامتی کی خاطر دوسرے راجاؤں کو فوری امداد دی جائے۔ انہوں نے پوری طرح یہ سمجھا ہی نہیں کہ محمود نے جہاں شمال مغرب کی جانب سے اپنے لئے حملوں کی راہ ہموار کی ہے' وہاں سے کوئی دوسرا حملہ آور بھی وار کر سکتا ہے۔ وہ سب اس پر صبر کر کے بیٹھ رہے کہ محمود مُن قبائل کی طرح ایک بیرونی حملہ آور تھا' محض ایک بلیچھ۔ جس طرح مُن آئے' ہمارے سماج میں جذب ہو گئے اور بھلا دیئے گئے' اسی طرح محمود اور اُس کے لشکری بھی ہمارے سماج میں جذب ہو کر فراموش کر دیئے جائیں گے۔ محمود کی وفات کے بعد تو اہل ہند اپنی شمال مغربی سرحد کے متعلق اور بھی غفلت میں پڑ گئے اور انہیں یہ محسوس ہی نہ ہوا کہ خبردار ہونے کی کس قدر ضرورت و اہمیت ہے۔ اُن کی بے نیازی کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ محمود کے جانشینوں نے بھی شمالی ہند کے میدانی علاقوں میں مزید پیش رفت سے دلچسپی نہیں لی۔ چنانچہ جب ہندوستان کے راجے مہاراجے پھر آپس کے جھگڑوں میں پڑ گئے۔ چنانچہ بارھویں صدی کے آخر میں شمال مغرب سے حملوں کا دوسرا ریلا' شہاب الدین غوری کی سرکردگی میں آیا' تو ہندوستان اس نئی آفت سے اسی طرح بے نیاز' بے خبر اور غیر مستعد تھا' جس طرح محمود غزنوی کے حملوں کے وقت تھا"۔ (ترجمہ)

اُدھر شمالی ہند اور شمال مغربی سرحدی علاقوں (موجودہ پاکستان) کے مسلم فرماں رواؤں کی حالت بھی وسط ہند کے ہندو راجوں مہاراجوں سے مختلف نہ تھی۔ محمود غزنوی کے بعد خاندان غزنویہ کے اختتام (1186ء) تک ڈیڑھ سو برسوں میں یکے بعد دیگرے اُس کے پندرہ جانشینوں نے حکومت کی' لیکن اس پورے عرصے میں وہ یا تو ذاتی مفادات کی خاطر آپس میں الجھتے رہے یا اردگرد کے پڑوسی ملکوں' سلجوق' سنجر' خوارزم شاہ اور خاندان غور سے برسرِ پیکار رہے۔ ان پندرہ غزنویہ سلاطین میں سے کسی نے بھی نہ تو محمود کی سی شجاعت کا مظاہرہ کیا اور نہ ایسے اعلیٰ تدبر کا کہ وہ حالات کو پُرامن اور پُرسکون بنا سکتا۔ یہ پوری ڈیڑھ صدی شورش اور ہنگامہ آرائی میں گزر گئی۔

آخر تاریخ کا لکھا تقدیر کے لکھے کی طرح پورا ہو کر رہا۔ دو سگے بھائی ایسے نمودار ہوئے کہ انہوں نے تاریخ کا یہ دستور باطل قرار دے دیا کہ حصولِ اقتدار کی جنگ میں ایک بھائی کا دوسرے بھائی کا دشمن ہو جانا ضروری ہے۔ شمس الدین (غیاث الدین) اور شہاب الدین (معز الدین) دو ایسے بھائی تھے جنہوں نے ایک طرف افغانستان کے جنوب مغرب میں سلطنت غوریہ کو مضبوط سے مضبوط تر کیا اور دوسری مفتوحات اور مقبوضات میں بھی بیش بہا اضافہ کیا۔

شہاب الدین کا مقبرہ:

شہاب الدین غوری کے حالات کتابوں میں عام ملتے ہیں۔ وہ ہندوستان میں اپنی فتوحات کے بعد غزنی کو واپس جاتے ہوئے جب جہلم کے قریب دمیک کے مقام پر پہنچا تو آرام کی غرض سے وہاں کچھ دیر کے لئے رُک گیا۔ کھوکھروں کی قوم میں سے بیس افراد سلطان شہاب الدین سے بے حد نالاں تھے' کیونکہ اُس نے اُن کے رشتہ داروں کو قتل کیا تھا۔ ان بیس کھوکھروں نے آپس میں مل کر شہاب الدین کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا۔ جس دن سلطان دمیک کے مقام پر خیمہ زن ہوا' اُس کے دوسرے روز 15 مارچ 1206ء کو شہید کر دیا گیا۔ سلطان کے مدفن کا معاملہ بھی خاصا متنازعہ رہا ہے' لیکن اب انجمن شعرائے اہل بیت گوجر خان کے بانی سید حبیب شاہ بخاری اور پاکستان کے عظیم ایٹمی سائنسدان ڈاکٹر عبدالقدیر خان کی کوششوں سے یہ معاملہ ہمیشہ کے لئے ختم ہو گیا ہے۔ اب سلطان کی قبر شناخت ہو گئی ہے جو جہلم سے 31 میل کے فاصلے پر سوہاوہ سے تین میل شمال میں موضع دھمیک میں سلطان کے مقامِ شہادت پر واقع ہے۔ اب اس معمولی قبر پر ایک عالی شان مقبرہ تعمیر کیا گیا ہے جس کی بنیاد پہلے عرس یعنی 15 مارچ 1989ء کو رکھی گئی تھی۔ اس کی تکمیل سات سال کے بعد اپریل 1996ء میں ہوئی۔ تعمیر و آرائش کا سہرا ڈاکٹر عبدالقدیر کے سر ہے۔ یہ ڈاکٹر صاحب کی خوش قسمتی ہے کہ اُن کو ایک نسبت ہندوستان میں اسلامی مملکت کے بانی مبانی شہاب الدین غوری سے بھی ہو گئی۔ ڈاکٹر صاحب نے مختلف اداروں کے تعاون سے تقریباً ایک کروڑ روپے کی لاگت سے 62 فٹ اونچا مقبرہ ڈھائی ایکڑ پھیلی ہوئی جگہ پر تعمیر کرایا ہے۔ یہاں ایک حویلی' ایک جامع مسجد' ریسٹ ہاؤس' ایک کنواں اور ایک کتب خانہ تعمیر کرانے کا منصوبہ ہے۔

شہاب الدین کا مقام:

سلطان غوری کی بہت سی خوبیوں کے علاوہ اُس کے تین اوصاف خاص طور پر تعریف و تحسین کے لائق ہیں۔ وہ ہندوستان میں اسلامی حکومت کا بانی تھا' لیکن اس کے باوجود یہاں کے باشندوں کے خلاف اُس کے دل میں عناد' نفرت یا تعصب کا کوئی جذبہ نہ تھا۔ اُس نے بہت سی لڑائیوں میں ہندو راجاؤں کے ساتھ مل کر کام کیا۔ پنجاب کی اکثر لڑائیوں میں جموں و کشمیر کا ہندو راجا اُس کے ساتھ تھا۔ ہندو مؤرخین لکھتے ہیں کہ ترائن کی دوسری لڑائی میں جب پرتھوی راج کو شکست فاش ہوئی تو قنوج کا طاقتور راجا جے چند سلطان غوری کے پہلو بہ پہلو صف آرا تھا۔ سلطان نے اپنی فتوحات کے بعد یہاں کے ہندو خاندانوں سے دوستی اور مروت کا سلوک کیا۔ پرتھوی راج کو شکست دینے کے بعد سلطان نے اجمیر کی حکومت پرتھوی راج کے بیٹے کو سونپ دی۔ سلطان کی معتدل مزاجی' رواداری اور ملکی رسوم و آئین کی پاسداری کی ایک یادگار اس کے بعض سکے ہیں جن پر حروف اور عبارت ہندی زبان میں ہے' اور جن میں سے بعض سکوں پر سلطان غوری کے ساتھ پرتھوی راج کا نام بھی درج ہے۔

دوسری بڑی خوبی اسلام سے گہری وابستگی ہے۔ "طبقاتِ ناصری" کے مصنف نے لکھا ہے: "وہ پابندِ سنت سلطان تھا۔ دنیا میں اس سلطان کے عدل و انصاف کی جو شان تھی' وہ تحریر نہیں ہو سکتی۔ آنحضور ﷺ کی سنت اور خالص اسلامی طریقِ جنگ پر لڑائیوں کی تیاری اور لشکر کی ترتیب و صف آرائی اس سلطان پر ختم ہو گئی ہے۔ اُس کے

زمانے میں ہندوؤں نے کثرت سے اسلام قبول کیا۔ پنجاب کے لاکھوں کھوکھر مشرف بہ اسلام ہوئے۔ بلوچستان کے پٹھان بھی اسی زمانے میں اسلام لائے۔

سلطان پر بعض مورخین الزام عائد کرتے ہیں کہ اُس نے اسلام تلوار کے زور سے پھیلایا۔ اس کا جواب پروفیسر محمد مجیب (جامعہ ملیہ' نئی دہلی) نے اپنی فاضلانہ اور تحقیقی تالیف: ''انڈین مسلمان'' (انگریزی) میں یُوں دیا: ''ہندوستان ہو یا کوئی بھی ملک ہو' فاتحین کی توسیع پسندی کے انداز یکساں ہوتے ہیں۔ ہندوستان میں مسلمانوں کا پھیلاؤ بھی تین طریقوں سے ہوا۔ لشکر کشی' نقل مکانی اور تبدیلِ مذہب۔ لشکر کشی سے صرف مواقع پیدا ہوئے کہ نقل مکانی ہو' لوگ ہجرت کر کے آئیں اور مقامی باشندے آنے والوں کے بہتر طرزِ زیست کو دیکھ کر اپنا مذہب تبدیل کریں۔ وادیٔ سندھ میں محمد بن قاسم کی مہم جوئی ہو یا محمود غزنوی کے معروف سترہ حملے یا شہاب الدین غوری کے گیارہ حملے' جن کی بنیاد پر سلطنتِ دہلی وجود میں آئی۔ یہ سب سیاسی تاریخ کے امور ہیں۔ مسلمانوں کی فتح کا مطلب یہاں کے باشندوں پر فتح نہیں تھا' بلکہ دشمن افواج پر فتح تھا۔ سلطنت کی وسعت کا مطلب تھا' تجارتی راستوں کا پھیلاؤ اور معاشی ترقی۔ اطاعت گزار حاکم کے علاقے میں ذرا بھی تبدیلی نہ ہوتی تھی۔ اگر کسی علاقے کا حاکم اطاعت قبول نہیں کرتا تھا تو ظاہر ہے' اُس کی جگہ مسلمان حاکم آ جاتا تھا یا ایسا ملکی راجا جو اگر مسلم دوست نہیں تو کم از کم مسلم دشمن نہیں ہوتا تھا۔ گویا تبدیلی حکومت کی ہوتی تھی' علاقائی سرحدوں میں تبدیلی ہوتی تھی نہ لوگوں کے بُود و باش میں''۔

سلطان شہاب الدین غوری کی تیسری بڑی خوبی اُس کی وفاداری تھی۔ ہندوستان میں اُس کی تمام فتوحات اس زمانے میں ہوئیں جب افغانستان کے تخت پر اُس کا بڑا بھائی سلطنت غیاث الدین غوری متمکن تھا اور محمد غوری اس طرح سے اُس کا نائب اور سپہ سالار تھا۔ اگر خود مختاری اور اقتدار کی ہوس اُسے للچاتی یا ضد اور غصہ طبیعت پر غالب آ جاتا تو محمد غوری کے لئے اپنی بادشاہت کا علم بلند کرنا مشکل نہ تھا (اور سلطان محمود غزنوی کے بیٹے اور بعد میں مغل شہزادے بھائی بھائی ہونے کے باوجود جس طرح آپس میں لڑے ہیں' اُسے دیکھ کر کسی کو اس فعل پر حیرت نہ ہوتی) لیکن محمد غوری کا رویّہ ایک وفادار جرنیل اور محبت بھرے بھائی کا رہا۔ اس نے ہمیشہ اپنے بھائی بڑے کے مرتبے کا خیال رکھا۔ تمام فوجی مہموں اور ملکی و انتظامی اُمور میں اُس کی خواہش کی پیروی کی۔ لڑائیوں میں جو مالِ غنیمت ہاتھ آتا' اُس میں سب سے قیمتی تحفے (مثلاً راجا قنوج کے ہاتھی) سلطان غیاث الدین کی نذر ہوتے۔ غیاث الدین کبھی ہندوستان نہیں آیا' لیکن اُس کے چھوٹے بھائی نے اس ملک میں اس کا بھرم اِس شان سے رکھا ہوا تھا کہ قطب مینار' دہلی پر سلطانانِ ہند کی جو فہرست کندہ کی گئی ہے' اُس میں سب سے پہلے اُسی کا نام ہے۔ علاوہ ازیں جب غیاث الدین کی وفات ہوئی اور سلطان محمود غوری اس کا جانشین ہوا تو اُس نے اپنے بڑے بھائی کے لواحقین اور قبیلہ داروں کا پورا پورا خیال رکھا۔ سلطنت کے وسیع حلقے اُنہیں نیابت اور حکمرانی کے لئے دیئے گئے اور ان کا وہی ادب و احترام قائم رکھا جو سلطان غیاث الدین کی زندگی میں اُنہیں حاصل تھا۔

سلطان شہاب الدین غوری کے اولادِ نرینہ کوئی نہ تھی۔ فقط ایک لڑکی تھی۔ جب اُس کے خاص درباری اس بات پر تاسف اور ہمدردی کا اظہار کرتے تو وہ مسکرا دیتا اور کہتا کہ میرے اتنے غلام' جن کو میں نے بیٹوں کی طرح پالا ہے اور جن کی تعلیم و تربیت پر میں نے بے حد محنت کی ہے' وہ سب فرزندوں کی طرح میرا نام روشن کریں گے۔

اور اُس کے فرزندوں نے واقعی ایسی منفرد حکومت قائم کی جو ''خاندانِ غلاماں'' کے نام سے موسوم ہوئی۔ دنیا میں باپ کی وفات کے بعد بیٹا برسرِ اقتدار آتا ہے۔ یہاں غلام' اور غلام کے بعد دوسرا غلام برسرِ اقتدار آیا۔ قطب الدین ایبک (دہلی' لاہور)' تاج الدین یلدوز (غزنی)' ناصر الدین قباچہ (ملتان' اوچ) اور محمد بختیار خلجی (بنگال) اس کے خاص غلام تھے' جنہوں نے پورے ہندوستان کو اسلام کے حلقہ بگوش کر دیا۔

شہاب الدین غوری کے زمانے کے علماء میں امام فخر الدین رازی (1149ء۔ 1209ء) کا نام بہت ممتاز ہے۔ ہرات میں اُن کے لئے ایک مدرسہ قائم کر دیا گیا تھا' جہاں وہ درس دیتے تھے۔ امام رازی نے علم الکلام اور فقہ میں کئی اہم کتابیں لکھیں' لیکن اُن کی شہرت ''تفسیر کبیر'' کی وجہ سے ہے جو قرآن کی بہترین تفاسیر میں شمار کی جاتی ہے۔ سلطان غیاث الدین کے عقائد کی اصلاح میں امام رازی کا بڑا ہاتھ ہے۔ ان کی اصلاحی کوششوں کی وجہ سے باطنی اُن کے جانی دشمن ہو گئے تھے۔

ہندوستان میں شہاب الدین غوری کے ساتھ اسلحے کی طاقت ہی نہیں آئی' اسلام کی روحانی طاقت بھی خواجہ معین الدین چشتی کے پیکر میں ڈھل کر آئی۔ پرتھوی راج کا مقابلہ شہاب الدین ہی نے نہیں کیا' خواجہ اجمیر نے بھی کیا۔

10

خاندان غلاماں (1206ء تا 1290ء)

جس زمانے میں مصر و شام میں مملوکوں کی حکومت قائم ہوئی' اس سے تقریباً پچاس سال پہلے شمالی ہند (موجودہ پاکستان) میں مسلمانوں کی حکومت قائم ہو چکی تھی۔ اتفاق کی بات ہے کہ مصری حکومت کی طرح یہ حکومت بھی غلاموں کی تھی۔ اس حکومت کا بانی شہاب الدین غوری کا ایک غلام قطب الدین ایبک تھا۔ مصر کی طرح دہلی کے غلام بادشاہ بھی نسلاً ترک تھے۔

قطب الدین ایبک (1206ء تا 1210ء)

یہ ایک ترک غلام تھا۔ اس نے تعلیم و تربیت نیشاپور میں حاصل کی تھی۔ اس کی صورت شکل اچھی نہیں تھی' اس لئے جب سلطان غوری نے بہت سے غلام خریدے تو ایبک کو بدصورتی کی وجہ سے نہیں خریدا۔ ایبک نے اس پر سلطان سے کہا کہ آپ نے جہاں بہت سے غلام اپنے لئے خریدے ہیں' وہاں مجھ کو خدا کے لئے خرید لیجئے۔ سلطان اس جواب سے بہت خوش ہوا اور قطب الدین ایبک کو بھی خرید لیا۔

قطب الدین نے اپنی قابلیت کے ذریعے بہت جلد ترقی کر لی۔ خوارزم شاہ سے خراسان میں غوری کی جو لڑائیاں ہوئیں' ان میں ایبک نے بڑی بہادری دکھائی۔ وہ ہندوستان کی لڑائیوں میں بھی سلطان کے ساتھ تھا۔ دہلی سے بنارس تک کا علاقہ اُسی نے فتح کیا۔ 1192ء میں غوری نے اس کی قابلیت کی وجہ سے شمالی ہند میں اس کو اپنا نائب مقرر کر دیا' اور جب سلطان غوری کا انتقال ہوا تو وہ لاہور میں ایک خود مختار بادشاہ کی حیثیت سے تخت نشین ہوا۔

ایبک نے بادشاہ کی حیثیت سے صرف چار سال حکومت کی' لیکن اگر اس کی صوبیداری کا زمانہ بھی شامل کر لیا جائے تو اس نے برعظیم میں تقریباً اٹھارہ سال حکومت کی۔ صوبیدار کی حیثیت سے اس کا دار الحکومت دہلی تھا' لیکن بادشاہ ہونے کے بعد وہ زیادہ تر لاہور میں رہا اور یہیں

اس کا انتقال ہوا۔ اُس کی قبر لاہور میں اب تک موجود ہے۔

ایبک ایک عادل بادشاہ تھا۔ اس کی سخاوت کی وجہ سے لوگ اسے ''لکھ بخش'' کہتے تھے۔ اُس نے دہلی میں ''قوتِ اسلام'' کے نام سے ایک عالیشان مسجد بنائی' جس کے کھنڈر اب تک موجود ہیں۔ مسجد کے بلند و بالا مینار کی تعمیر ایبک نے 1199ء میں شروع کی تھی' لیکن تکمیل سلطان التمش کے عہد میں ہوئی۔ 238 فٹ بلند مینار ''قطب مینار'' کہلاتا ہے۔ اسلامی فنِ تعمیر کے عظیم نمونوں میں سے ہے۔ اب تک موجود ہے۔

التمش 1211ء تا 1236ء)

ایبک کے بعد اس کا ایک غلام التمش تخت نشین ہوا۔ اس نے تقریباً 26 سال حکومت کی۔ اس کے عہد میں چنگیز خاں نے وسط ایشیا اور ایران پر حملہ کیا' لیکن یہ وحشی منگول دریائے سندھ کو پار کر کے شمالی ہند پر حملہ کرنے کی جرأت نہ کر سکے' کیونکہ التمش نے یہاں ایک مضبوط حکومت قائم کر رکھی تھی۔ جس طرح قطب الدین ایبک ہندوستان کی اسلامی حکومت کا پہلا حکمران ہے' اسی طرح التمش کو یہ فخر حاصل ہے کہ اس نے ابتدائی میں اس نئی اسلامی سلطنت کی بنیادیں مضبوط کر لیں۔

التمش بڑا نیک بادشاہ تھا۔ علم و ادب کا بھی سرپرست تھا۔ اسے انصاف کا بڑا خیال رہتا تھا۔ اس نے حکم دے رکھا تھا کہ مظلوم پیلے رنگ کے کپڑے پہنا کریں تاکہ وہ ان کو دیکھ کر پہچان لے اور ان کے ساتھ انصاف کرے۔ اس کے علاوہ اس نے اپنے محل کے باہر دروازے پر گھنٹیاں لٹکا رکھی تھیں تاکہ مظلوم ان کو بجا کر بادشاہ کی توجہ مبذول کر سکیں۔ وہ خدا ترس' قابل اور بیدار مغز بادشاہ تھا۔ روزے' نماز کا پابند تھا۔ بغداد کے عباسی خلیفہ سے ہندوستان کی بادشاہت کا خطاب حاصل کیا۔ جب وہ 1236ء میں فوت ہوا تو تقریباً سارا شمالی ہندوستان اس کے قبضے میں تھا۔

رضیہ سلطانہ (1236ء تا 1240ء)

سلطان التمش کے انیس لڑکے تھے' لیکن وہ صرف اپنی بیٹی رضیہ سے خوش تھا اور کہا کرتا تھا کہ مرد صرف رضیہ ہے' لیکن اسلام میں چونکہ عورت کی ذمہ داری گھر ہے اور حکومت کی ذمہ داری مردوں پر ڈالی گئی ہے' اس لئے امراء نے عورت کی حکمرانی کو منظور نہیں کیا اور اس کے خلاف ہو گئے۔ خود اس کے بھائی اس کے مقابلے پر آ گئے اور وہ ایک لڑائی میں ماری گئی۔ رضیہ کے عہد میں قرامطہ نے دہلی پر یورش کی' لیکن کشت و خون کے بعد شاہی فوج اور مسلمانانِ دہلی نے انہیں مار بھگایا۔

ناصر الدین محمود (1246ء-1266ء)

رضیہ سلطانہ کے بعد چھ سال تک اُس کے بھائیوں کے درمیان اقتدار کے لئے لڑائیاں ہوتی رہیں۔ آخر کار امراء نے اس کے بھائی ناصر الدین محمود کو اپنا بادشاہ منتخب کر لیا۔ وہ ایک درویش صفت بادشاہ تھا۔ سرکاری خزانے کو ہاتھ نہ لگاتا اور قرآن شریف لکھ کر روزی کماتا۔ سلطنت کا نظم و نسق اس نے التمش کے ایک غلام غیاث الدین بلبن (جو ناصر کا خسر بھی تھا) کے سپرد کر رکھا تھا۔ بلبن پنجاب کا صوبیدار رہ چکا تھا۔ اب اپنا وزیر اعظم بنا کر سلطنت کا سارا انتظام اس کے سپرد کر دیا۔ ناصر الدین کی زندگی اولیاء و صُلحاء کے نمونے پر تھی۔ انتظام سلطنت بلبن کے سپرد کر کے اسے کہہ رکھا تھا کہ میں نے تمہیں تمام اختیار دے دیئے ہیں۔ تم ہرگز کوئی ایسا کام نہ کرنا جس سے کل کو اللہ کے حضور میں تمہیں اور مجھے شرمندگی اٹھانی پڑے۔ وہ خود اپنا اکثر وقت حجرے کے اندر عبادت اور تلاوتِ قرآن حکیم میں صَرف کرتا اور مشہور ہے کہ دربارِ عام کے وقت وہ شاہی لباس زیبِ تن کر لیتا تھا' اور اس کے بعد خلوت میں جا کر پھٹے پرانے کپڑے پہنے رہتا۔ اپنا گزارا وہ کلام مجید نقل کر کے کرتا تھا اور اس امر کی بھی بڑی احتیاط کرتا کہ اس کے لکھے ہوئے نسخے معمولی نرخ پر فروخت ہوں اور کسی کو یہ پتا نہ چلے کہ وہ بادشاہ کے ہاتھ کے لکھے ہوئے ہیں۔

غیاث الدین بلبن (1266ء تا 1286ء)

خاندانِ غلاماں کا سب سے مشہور اور باعظمت حکمران ہوا۔ وہ التمش کا غلام تھا۔ بادشاہ بننے سے پہلے شراب بہت پیتا تھا' لیکن بادشاہ بننے کے بعد اس نے شراب سے توبہ کر لی۔ نماز کا ایسا پابند ہوا کہ تہجد تک کی نماز قضا نہیں کرتا تھا۔ وہ علماء اور نیک لوگوں کی صحبت میں رہنے لگا۔

بلبن کے عہد میں ایران اور وسط ایشیا میں منگولوں کا زور بڑھ گیا تھا۔ 1258ء میں بغداد کو تباہ کرنے کے بعد وہ مغرب میں شام اور مصر پر اور مشرق میں شمالی ہند پر مسلسل حملے کرنے لگے۔ بلبن نے ان حملوں کو روکنے کے لئے ایک طاقتور فوج تیار کی اور اس فوج کی مدد سے اس نے منگولوں کو بار بار شکست دی۔ ملتان کے گورنر شیر خاں اور اس کے اپنے بیٹے محمد سلطان نے منگولوں کے حملے پسپا کرنے میں بڑا نام پیدا کیا۔ جس طرح مصر کے مملوک (غلام) حکمرانوں نے منگولوں سے مصر کو تباہ ہونے سے بچایا۔ اُسی طرح دہلی کے غلام بادشاہوں نے اور خصوصاً بلبن نے ہندوستان کو تباہ ہونے سے بچایا۔ بلبن کے زمانے میں اُن اسلامی ملکوں سے' جن پر منگولوں نے قبضہ کر لیا تھا' ہزاروں کی تعداد میں دہلی آ کر پناہ لی۔ صرف اس کے دربار میں پندرہ بادشاہ اور شہزادے پناہ گزین تھے۔

بلبن بادشاہت اور حکومت کے بارے میں واضح تصوّرات رکھتا تھا۔ حسب نسب اور شریعت و سیاست سے متعلق اس کے بعض نظریات پر اعتراض کئے گئے ہیں' لیکن بحیثیت مجموعی بلبن شریعت کی بالادستی کا قائل تھا۔ ایک بادشاہ کے لئے رعایا کا اعتماد حاصل کرنا اس کی نظر میں بہت ضروری تھا۔ چنانچہ وہ رعایا کے حالات سے باخبر رہتا اور اپنے عہدے داروں پر کڑی نگاہ رکھتا تھا اور ان کا سخت احتساب کرتا تھا۔ وہ جنوبی ہند کی طرف اپنی مملکت کو آسانی سے وسعت دے سکتا تھا' لیکن اس کا کہنا تھا کہ دوسروں کے ملک پر قبضہ کرنے سے بہتر یہ ہے کہ اپنی مملکت کو مضبوط و مستحکم بنایا جائے اور بادشاہ کی حیثیت سے اپنی ذمہ داری کو پورا کیا جائے۔ اس نے امراء کے درمیان پھیلی ہوئی شراب خوری' جوئے بازی اور دوسری بڑی عادتوں کا قلع قمع کیا۔ بلبن مصر کے سلطان بیبرس اور مراکش کے یعقوب مرینی کا ہم عصر تھا۔ وہ اپنی قابلیت' رعایا پروری اور عدل و انصاف میں ان میں سے کسی سے کم نہیں تھا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ تینوں مسلم حکمران اس زمانے میں دنیا کے سب سے بڑے حکمران تھے۔

بلبن کا سب سے بڑا لڑکا محمد سلطان منگولوں کے مقابلے میں شہید ہو چکا تھا اور دوسرا لڑکا بغرا خان بلبن کے انتقال کے بعد بنگال کا حاکم تھا' اس لئے بلبن کے بعد اس کا سترہ سالہ لڑکا کیقباد دہلی میں اس کا جانشین ہوا' لیکن کیقباد باپ کے نقشِ قدم پر نہیں چل سکا اور جلد ہی عیش و عشرت میں پڑ گیا۔ جب ملک کے حالات بگڑنے لگے تو پنجاب کے گورنر جلال الدین فیروز خلجی نے تختِ دہلی پر قبضہ کر کے خاندان خلجی کی حکومت کی بنیاد ڈالی۔

آپ کی رائے

''ندائے خلافت'' کے خصوصی شمارے یا عام شمارے جو ہر ہفتے باقاعدگی سے شائع ہوتے ہیں' اُن کے بارے میں اپنی صحیح اور بے لاگ رائے دینا نہ بھولئے۔

11

خاندان خلجی (1290ء تا 1320ء)

خلجی خاندان بھی غلام خاندان کی طرح نسلاً ترک تھا' لیکن افغانستان میں عرصۂ دراز تک رہائش اختیار کرنے کی وجہ سے ترکوں کی خصوصیات کھو چکا تھا اور پٹھانوں کے طور طریقے اختیار کر لئے تھے۔

جلال الدین خلجی (1290ء۔1296ء)

نے کل سات سال حکومت کی۔ وہ بڑا نیک حکمران تھا۔ بادشاہ بننے سے پہلے وہ پنجاب کا صوبیدار تھا اور اگرچہ اس نے سرحدوں کے محافظ کی حیثیت سے منگولوں کے حملوں کو روکنے میں بڑی شجاعت اور بہادری کا مظاہرہ کیا تھا' لیکن خون ریزی سے اس کو طبعاً نفرت تھی۔ وہ کہا کرتا تھا: ''اگر بادشاہی قتل و غارت گری اور مخالفین کو قتل اور قید کرنے کا نام ہے تو میں ایسا بادشاہ نہیں۔ میں پیغمبر اسلام ﷺ کی شریعت و سنت کے خلاف ایک کام بھی نہیں کر سکتا۔''

مورخین نے لکھا ہے کہ اس کے دور میں ملک میں خوشحالی کا دور دورہ تھا اور کوئی مظلوم ایسا نہ تھا جس کے ساتھ انصاف نہ کیا گیا ہو' لیکن اس نیک دل حکمران کو اس کے حریص اور جاہ پسند بھتیجے علاؤ الدین نے دھوکے سے قتل کر کے دہلی کے تخت پر قبضہ کر لیا۔

علاؤ الدین خلجی (1296ء تا 1319ء)

اس کے عہد میں دہلی کی اسلامی سلطنت انتہائی عروج پر پہنچ گئی۔ ناصر الدین محمود اور غیاث الدین بلبن کے عہد میں فتوحات رک گئی تھیں اور حکومت کی پوری توجہ منگولوں کے حملوں کو روکنے پر تھی۔ علاؤ الدین کے زمانے میں منگولوں کا حملہ بڑی حد تک دور ہو گیا تھا' اس لئے اب علاؤ الدین نے فتوحات کی طرف توجہ کی۔ اس کی فوجوں نے سب سے پہلے مالوہ' گجرات اور راجپوتانہ کو فتح کیا۔ اس کے بعد ایک نومسلم سردار ملک کافور کی قیادت میں دریائے نربدا کو پار کر کے اس کی فوجیں دکن میں داخل ہو گئیں اور 1311ء تک جنوب میں راس کماری تک سارا علاقہ فتح کر لیا۔ اس طرح سوائے کشمیر کے پورے شمالی ہندوستان (پاکستان) پر اسلامی حکومت قائم ہو گئی۔

علاؤ الدین اخلاق و عادات میں التمش یا بلبن کی طرح نہیں تھا۔ شراب پیتا تھا' ناچ رنگ کو پسند کرتا تھا۔ لوگوں کو ذرا ذرا سے جرم پر بڑی سخت سزائیں دیتا تھا' لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اس نے سلطنت کا انتظام بہت اچھا کیا۔ اس لحاظ سے وہ نہ بلبن سے پیچھے تھا اور نہ التمش سے۔ اس نے ہر چیز کی قیمت مقرر کر رکھی تھی اور کوئی شخص مقررہ قیمت سے زیادہ وصول نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے اس انتظام کا نتیجہ یہ ہوا کہ سلطنت میں ہر چیز سستی ہو گئی اور لوگ بادشاہ کو دعائیں دینے لگے۔

علاؤ الدین خلجی کے زمانے میں عوام و خواص کی اخلاقی حالت بھی بہتر ہو گئی تھی۔ بادشاہ اگرچہ خود شراب پیتا تھا' لیکن شراب پر سلطنت میں مکمل پابندی تھی۔ شراب نوشی اور دوسرے جرائم پر سخت سزائیں دی جاتی تھیں۔ اِدھر حکومت کی طرف سے سختی تھی اُدھر مشہور صوفی بزرگ خواجہ نظام الدین اولیاء اور ان کے رفقاء وعظ و نصیحت اور تربیت کے ذریعے اخلاقی اصلاح میں مصروف تھے۔ اس دو طرفہ اقدام کا نتیجہ یہ ہوا کہ لوگوں نے جوا' شراب اور سود خوری ترک کر دی اور جھوٹ بولنا اور کم تولنا ختم کر دیا۔

علاؤ الدین ایک ان پڑھ بادشاہ تھا' لیکن اس کے باوجود وہ حکومت اور اس کے مسائل اور نظم و نسق کی غیر معمولی صلاحیت رکھتا تھا۔ اگر وہ پڑھا لکھا ہوتا تو شاید وہ برعظیم کی تاریخ میں اپنی مثال آپ ہوتا۔ اس کے عہد میں اسلامی ہند میں اور خاص طور پر دہلی میں علمائے دین' صوفیائے کرام اور باکمال ادیبوں اور شاعروں کا حسین اجتماع ہو گیا تھا۔ اتنی تعداد میں یہ رہنمائی اور ہدایت کرنے والے حضرات کسی بادشاہ کے زمانے میں جمع نہیں ہوئے تھے۔ ''تاریخ فرشتہ'' میں 46 ممتاز علماء کے نام درج ہیں جو دہلی میں موجود تھے۔ اس عہد کے اکابر میں خواجہ نظام الدین اولیاء' شیخ رکن الدین (ملتان) اور شعراء میں امیر خسرو اور امیر حسن سنجری ممتاز ہیں۔ یہ دونوں شاعر علاؤ الدین کے دربار سے وابستہ تھے۔ اس دور میں کثرت سے مسجدیں' تالاب' سرائیں' خانقاہیں اور قلعے تعمیر ہوئے۔ علاؤ الدین نے مسجد ''قوت الاسلام'' کو توسیع دی۔ 70 ایکڑ پر مشتمل ''حوض علائی'' تعمیر کرایا اور دہلی سے متصل نیا شہر سیری کے نام سے تعمیر کرایا۔

علاؤ الدین کا بیٹا قطب الدین مبارک شاہ اپنے باپ کا نااہل وارث ثابت ہوا۔ اس کے دور میں ایک ہندو نے' جس کو مبارک شاہ نے خسرو خان کا خطاب دیا تھا' سارے اختیارات پر قبضہ کر لیا اور آخر میں مبارک شاہ کو بھی قتل کر دیا۔ ان حالات میں ملتان اور دیپال پور کے صوبے دار غازی ملک نے دہلی پر حملہ کر کے خسرو خان کو شکست دی۔ خلجی خاندان کا چونکہ کوئی شہزادہ باقی نہ رہا تھا اور خسرو خان نے سب کو قتل کرا دیا تھا' اس لئے امراء نے غازی ملک کو بادشاہ منتخب کر لیا اور وہ غیاث الدین تغلق کے نام سے تخت نشین ہوا۔ اس طرح خلجی خاندان کی حکومت ختم ہو گئی اور خاندان تغلق کی حکومت کا آغاز ہوا۔ یہ خاندان بھی پچھلے حکمران خاندانوں کی طرح ترک نسل سے تھا۔

12

خاندان تغلق (1321ء تا 1413ء)

غیاث الدین تغلق (1321ء۔1325ء)

اس نے صرف چار سال حکومت کی' لیکن اس مختصر مدت میں اس نے ایسے بڑے بڑے کام کئے جو بہت سے بادشاہ پچاس سال میں بھی انجام نہیں دے سکے۔ غیاث الدین بادشاہ بننے سے پہلے دیپال پور اور ملتان کا صوبیدار تھا۔ یہ سلطنت دہلی کے سرحدی مقام تھے اور اُس زمانے میں منگولوں کے حملے روکنے کی ذمہ داری ملتان کے صوبیدار پر ہوا کرتی تھی۔ غیاث الدین تغلق نے بھی اپنی صوبیداری کے زمانے میں یہ فرض انجام دیا۔ اس نے 29 لڑائیوں میں منگولوں کو شکست دی اور اس طرح شمالی

ہند کو تباہ ہونے سے بچالیا۔ اپنے ان کارناموں کی وجہ سے وہ "غازی ملک" کہلاتا تھا۔

بادشاہ ہونے کے بعد غیاث الدین نے دکن اور جنوبی ہند کے ہندو ریاستوں کو جو اب تک صرف باج گزار تھیں، ختم کر کے ان کو سلطنت دہلی میں ضم کر لیا اور اس طرح مرکزی حکومت کو زیادہ مستحکم کر دیا۔ غیاث الدین نے رعایا سے بڑا اچھا سلوک کیا۔ اس نے حکم دیا کہ لوگوں سے محصول نرمی سے وصول کیا جائے۔ کسانوں پر سے محصول اتنا کم کر دیا کہ وہ خوشحال ہو گئے۔ اس نے آبپاشی کے لئے بہت سی نہریں کھدوائیں اور باغات لگوائے۔ ویران اور بنجر زمینیں آباد ہو گئیں اور ملک کی پیداوار بڑھ گئی۔ ایک مورخ لکھتا ہے: "اس کے عہد میں رہزن پاسبان بن گئے۔ انہوں نے کمانیں بیچ ڈالیں اور تلواریں توڑ کر آلاتِ زراعت بنالئے۔"

غیاث الدین انعام واکرام دینے میں اعتدال سے کام لیتا تھا اور صرف ان لوگوں کو انعام دیتا تھا جو واقعی اس کے مستحق ہوتے تھے۔ وہ دوسرے بادشاہوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر لاکھوں روپیہ خرچ نہیں کرتا تھا۔ وہ تھوڑا دیتا تھا مگر زیادہ آدمیوں کو دیتا تھا اور بار بار دیتا تھا۔

غیاث الدین تغلق اسلامی شریعت پر عمل کرتا تھا۔ مذہب کا بڑا پابند تھا۔ نماز باجماعت پڑھتا تھا اور اس کے دربار میں کوئی شخص شراب نہیں پی سکتا تھا۔ اس کے عہد میں رعایا جتنی خوش تھی، اتنی کم بادشاہوں کے زمانے میں خوش رہی ہوگی۔

محمد تغلق (1325ء۔1351ء)

غیاث الدین کا بیٹا تھا۔ بادشاہ بننے سے پہلے جونا خان اور اُلغ خان کے خطابات سے جانا جاتا تھا۔ انتہائی ذہین، عالم اور فاضل بادشاہ تھا۔ بہترین خطاط تھا۔ علوم و ادبیات کا سرپرست تھا۔ اس کی حکومت کے ابتدائی دس سال امن وخوشحالی کے تھے۔ اس کے عہد میں سلطنت دہلی اپنے نقطۂ عروج پر پہنچ گئی۔ اسی زمانے میں محمد تغلق نے ایک بہت بڑی غلطی کی۔ یہ کہ 1326ء میں دارالسلطنت دہلی سے دولت آباد منتقل کر لیا، لیکن جب لوگوں کی مشکلات دیکھیں تو ایک سال بعد اس فیصلے کو منسوخ کر دیا اور 1327ء میں دہلی پھر دارالسلطنت ہو گیا۔ اس غلطی کی وجہ سے خزانے پر برا اثر پڑا اور رعایا بہت پریشان ہوئی۔

1330ء میں اس نے تانبے کا سکہ چلانے کی کوشش کی، لیکن بھاری نقصان ہونے کی وجہ سے یہ فیصلہ بھی منسوخ کرنا پڑا۔ 1328ء میں ایران کو ایل خانیوں کے مظالم سے نجات دلانے کے لئے ایک بہت بڑی فوج جمع کی، لیکن سلطان ابوسعید کے دور میں ایران کے حالات بہتر ہو جانے کی وجہ سے ارادہ ملتوی کر دیا۔

1335ء کے بعد ملک بغاوتوں اور مسلسل قحط سالی کا شکار ہو گیا۔ سلطان نے زراعت کو ترقی دینے اور عوام کو سہولتیں فراہم کرنے کی زبردست کوششیں کیں، لیکن بادشاہ کی جلد بازی اور تند مزاجی کی وجہ سے، جو کبھی کبھی ظلم تک پہنچ جاتی تھی، حالات بگڑتے چلے گئے۔ محمد تغلق ایک جگہ کی بغاوت کو فرو کرتا تو دوسری جگہ بغاوت ہو جاتی۔ سب سے پہلے بنگال پر مرکزی اقتدار کمزور ہوا۔ 1335ء میں ہندوستان کے جنوب مشرقی ساحل "معبر" میں ایک آزاد مسلم حکومت قائم ہو گئی۔ 1336ء میں جنوبی ہند میں وجے نگر میں ایک طاقتور ہندو حکومت قائم ہو گئی۔ 1347ء میں دکن بھی دہلی کے اقتدار سے آزاد ہو گیا اور ایک شخص علاؤ الدین گنگو نے دولت آباد میں بہمنی حکومت کی بنیاد ڈالی۔ محمد تغلق سندھ کی بغاوت فرو کرنے میں مصروف تھا کہ اس کا انتقال ہو گیا۔

محمد تغلق کے بارے میں مورخین نے لکھا ہے کہ وہ متضاد شخصیت کا مالک تھا۔ بعض نے اس کو دیوانہ بھی کہا ہے، لیکن اب مورخین کا خیال یہ ہے کہ وہ اپنے وقت کا ذہین، قابل اور رعایا پرور حکمران تھا۔ وہ اپنے زمانے سے آگے کی سوچتا تھا۔ ہاں اس کی شخصیت میں بعض کمزوریاں تھیں۔ کچھ تو ان کمزوریوں کی وجہ سے اور کچھ ناسازگار حالات کی وجہ سے وہ اپنے ہر مقصد میں ناکام رہا۔ مشہور سیاح ابن بطوطہ اُس کے زمانے میں ہندوستان آیا تھا اور اس نے اس دور کے حالات، رسم ورواج اور درباری عادات ورسوم کے بارے میں دلچسپ معلومات فراہم کی ہیں۔

فیروز شاہ تغلق (1351ء تا 1388ء)

محمد تغلق کے بعد اس کا چچازاد بھائی فیروز تغلق تخت نشین ہوا۔ فیروز شاہ خون ریزی کو ناپسند کرتا تھا، اس لئے اس نے سلطنت کے ان صوبوں کو، جو محمد تغلق کے زمانے میں ہاتھ سے نکل گئے تھے، دوبارہ سلطنت دہلی میں شامل کرنے کی کوشش نہیں کی۔ بنگال کو سلطنت دہلی کا مطیع بنانے کے لئے جو لڑائی لڑی گئی، اس میں ایک لاکھ 80 ہزار آدمی ہلاک ہو گئے تھے۔ اس کا فیروز شاہ کے دل پر گہرا اثر ہوا۔ وہ لاشوں کو دیکھ دیکھ کر بہت رویا اور اس نے آئندہ سلطنت کی توسیع کے لئے خون ریزی کرنے سے توبہ کر لی۔ اس کی وجہ سے مورخین فیروز شاہ کو ایک کمزور حکمران قرار دیتے ہیں۔ دکن اور جنوبی ہند کے ہاتھ سے نکل جانے کے باوجود فیروز شاہ ایک ایسی وسیع سلطنت کا حکمران تھا جو بنگال سے درۂ خیبر اور سندھ تک، اور کوہ ہمالیہ سے دریائے نربدا تک پھیلی ہوئی تھی۔

اس نے کوشش کی کہ سلطنت کے اس حصے میں جو اس کے پاس ہے، عوام کو زیادہ سے زیادہ راحت اور آرام پہنچائے۔ اور اس امر سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ وہ اس مقصد میں بڑی حد تک کامیاب ہوا۔ اس نے عوام کو جس طرح آرام پہنچایا اور رفاہِ عام کے کام جس کثرت سے کئے، ان کی مثال بر عظیم کی تاریخ میں بہت کم نظر آئے گی اور دنیا کی تاریخ میں بھی چند ہی مثالیں ملیں گی۔

فیروز شاہ نے سلطنت میں تیس نہریں نکالیں۔ چالیس مسجدیں اور بیس خانقاہیں بنوائیں۔ تیس بڑے بڑے مدرسے قائم کئے۔ ایک سو سرائیں تعمیر کروائیں۔ آبپاشی کے لئے تیس بڑے بڑے تالاب بنوائے۔ سو شفاخانے بنوائے، جن میں مفت علاج ہوتا تھا۔ سو حمام تعمیر کرائے اور دریاؤں اور نہروں وغیرہ پر ڈیڑھ سو پل تعمیر کرائے۔

رفاہِ عام کے ان کاموں کے علاوہ فیروز شاہ نے دو سو کے قریب شہر اور بستیاں آباد کیں۔ جون پور، فیروز پور اور ہوشیار پور کے شہر اُسی کے تعمیر کرائے ہوئے ہیں اور آج تک آباد و شاد ہیں۔

بادشاہ کو زراعت اور باغ لگوانے کا بہت شوق تھا۔ اس نے صرف دہلی کے آس پاس بارہ سو باغ لگوائے۔ نہروں کی وجہ سے ایسے ریگستان جن میں جانوروں کو پانی نصیب نہ ہوتا تھا، وہاں ہزاروں کھیت بن گئے اور باغات لگ گئے۔

اس نے تمام عالموں اور غریبوں کے لئے وظیفے مقرر کر دیئے۔ اس نے کوشش کی کہ سلطنت میں کوئی شخص بیکار نہ رہے اس لئے وہ ہر شخص کی ملازمت کا انتظام کر دیا کرتا تھا۔ وہ تمام ناجائز محصول جو اس سے پہلے کے بادشاہوں نے لگا دیئے تھے، اٹھا لئے۔ مجرموں کو ایسی ظالمانہ سزائیں منسوخ کر دیں جو شریعت کے خلاف تھیں۔ وہ سونے چاندی کے برتن استعمال نہیں کرتا تھا اور ریشمی کپڑے نہیں پہنتا تھا، اس لئے کہ اسلام میں مردوں کے لئے ان کے استعمال کی ممانعت ہے۔ اس نے اپنے محل میں آرائش کے لئے تصویروں کی بجائے مناظر وغیرہ کی تصویریں لگوائیں۔ اس نیک دل بادشاہ نے ملک پر 38 سال حکومت کی۔ اس کے عہد میں لوگ بڑے خوشحال ہو گئے تھے۔ اشیاء کی ارزانی کا یہ حال تھا کہ دو آنے میں ایک من گیہوں اور ایک آنے میں ایک من جو ملتا تھا۔ اس دور کی ارزانی دیکھ کر لوگ علاؤ الدین خلجی کا زمانہ بھول گئے۔

فیروز شاہ کے عہد کی یہی خوبیاں تھیں کہ جن کی وجہ سے اس کے زمانے میں غیر مسلم کثرت سے اسلام لائے۔ فیروز شاہ کے عہد میں اگر کوئی خرابی نظر آتی ہے تو وہ یہ کہ اس

زمانے میں قرآن وسنت پر عمل کمزور ہو گیا تھا اور اسلام ایک رواجی مذہب بن گیا تھا۔ بدعتوں' پیر پرستی اور قبر پرستی کا زور ہو گیا تھا اور خود بادشاہ بھی ان کمزوریوں کا شکار ہو گیا تھا۔ اس دور میں شریعتِ اسلامی کا سب سے بڑا نمائندہ تاتار خان تھا۔ اس نے بادشاہ کو بھی پابندِ شریعت رکھنے کی کوشش کی' لیکن اس کے انتقال کے بعد بادشاہ پر سے یہ دباؤ ختم ہو گیا۔

امیر تیمور کا ہندوستان پر حملہ

فیروز تغلق کے انتقال کے بعد ملک خانہ جنگی میں مبتلا ہو گیا۔ چھ سال کی مدت میں تین افراد تخت پر بیٹھے اور اتارے گئے۔ چوتھا حکمران محمود تغلق اس خاندان کا آخری حکمران تھا۔ چھ سال کی خانہ جنگی نے سلطنت کی بنیادیں ہلا دیں تھیں' اس لئے جب 1398ء میں تیمور نے ہندوستان پر حملہ کیا تو اس کا مقابلہ کرنے والی کوئی طاقت نہ تھی۔ تیمور نے دہلی کی فوج کو شکست دے کر دہلی فتح کر لیا۔ اصفہان اور بغداد کی طرح یہاں بھی قتل عام کیا اور شہر کی اینٹ سے اینٹ بجادی۔ دنیا کا یہ عظیم الشان اسلامی تہذیب کا شہر' جو فیروز تغلق کے عہد میں اپنے عروج پر پہنچ گیا تھا' ملبے کے ایک ڈھیر میں تبدیل ہو گیا۔ کئی شاندار عمارتیں جن میں غیاث الدین کا بنایا ہوا عظیم قلعہ بھی شامل تھا' آج صرف کھنڈر کی شکل میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ تیمور کے حملے نے سلطنت کی رہی سہی ساکھ بھی ختم کر دی اور مختلف حصوں میں صوبیداروں نے اپنی اپنی آزاد اور خود مختار حکومتیں قائم کر لیں۔

محمود تغلق کچھ مدت خضر خان سے لڑتا رہا جن کو تیمور پنجاب کا صوبیدار مقرر کر کے گیا تھا اور جو خود کو ہندوستان میں تیمور کا اور اس کے جانشین شاہ رُخ کا نمائندہ تصور کرتا تھا۔ 1412ء میں محمود تغلق کا انتقال ہو گیا اور 1414ء میں خضر خان نے دہلی پر قبضہ کر کے اپنی حکومت قائم کر لی۔ یہ حکومت سیّدوں کی حکومت کہلاتی تھی' کیونکہ خضر خان آلِ رسول ﷺ سے ہونے کا دعوے دار تھا۔ یہ حکومت 1451ء تک قائم رہی اور اس میں کل چار حکمران ہوئے۔ خضر خان کے قبضے میں دہلی اور نواحی علاقے کے علاوہ پنجاب بھی تھا' لیکن اس کے بعد یہ علاقے بھی ہاتھ سے نکل گئے اور آخری سید حکمران علاؤ الدین عالم شاہ صرف دہلی کا بادشاہ تھا۔ 1451ء میں ایک پٹھان سردار بہلول لودھی نے دہلی پر قبضہ کر کے لودھی خاندان کی حکومت قائم کر دی۔

لودھی خاندان کے ذکر سے پہلے ان آزاد اور خود مختار اسلامی سلطنتوں کا بھی مختصر ذکر ہو جانا چاہئے جو سلطنت دہلی کے دوران میں ہندوستان کے مختلف علاقوں میں قائم ہوئیں۔

13

آزاد اسلامی ریاستیں

جب بھی کسی خطے میں بڑی سلطنت کو زوال ہوا تو اس کی جگہ چھوٹی چھوٹی حکومتوں نے لے لی۔ جب بغداد میں خلافتِ عباسیہ کو زوال ہوا تو اس خطے میں کئی آزاد حکومتیں قائم ہو گئیں۔ اسی طرح جب اُندلس میں اُموی سلطنت کا خاتمہ ہوا تو ملک کئی چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم ہو گیا۔ یہی حال برعظیم پاک و ہند کا ہوا۔ جب عظیم الشان سلطنتِ دہلی کی مرکزی سلطنت کمزور پڑ گئی تو جگہ جگہ آزاد و خود مختار حکومتیں قائم ہوئیں۔ وہ اُندلس کی حکومتوں کے برابر چھوٹی نہیں تھیں اور ان میں دکن کی بہمنی سلطنت تو اپنی وسعت میں اُندلس کی اُموی حکومت سے کم نہیں تھی۔ بنگال اور گجرات کی حکومتیں بھی تقریباً بہمنی سلطنت کے برابر تھیں۔ یہاں ان حکومتوں کا مختصر تعارف کرایا جا رہا ہے:

(1) کشمیر (1339ء تا 1586ء)

یہاں ابتداء ہی سے ہندوؤں کی حکومت تھی۔ کشمیر میں مسلمانوں کی حکومت چودھویں صدی کے شروع میں ہوئی۔ اس وقت دہلی میں محمد بن تغلق حکمران تھا۔ اس مسلم حکومت کا بانی شہ میر تھا۔ اس نے تین سال حکومت کی۔ بعد میں جس طرح پاک و ہند میں صوفیاء کی تبلیغ سے اسلام پھیلا' اسی طرح کشمیر میں بھی سیّد علی ہمدانی (1314ء-1384ء) اور دوسرے بزرگوں کی کوششوں سے اسلام پھیلا۔ عوام نے ہزاروں کی تعداد میں اسلام قبول کیا اور اس طرح وادیٔ کشمیر کے بیشتر لوگ اسلام لے آئے اور یہ علاقہ دنیائے اسلام کا مستقل حصہ بن گئیں۔

کشمیر کے بادشاہوں میں زین العابدین (1420ء تا 1470ء) سب سے مشہور اور نیک نام ہوا ہے۔ وہ کشمیر میں بڈ شاہ کے نام سے مشہور ہے اور اس کے اچھے کاموں کی وجہ سے آج بھی لوگ اس کا نام عزت و احترام سے لیتے ہیں۔ کشمیر کی آزاد اسلامی حکومت تقریباً اڑھائی سو سال قائم رہی۔ اس کے بعد 1587ء میں کشمیر پر مغل بادشاہ اکبر نے قبضہ کر کے اسے مغل سلطنت کا ایک صوبہ بنا لیا۔

(2) دکن کی بہمنی سلطنت (1347ء تا 1527ء)

سلطنت دہلی کے زوال کے بعد یہ سب سے پہلی اور سب سے طاقتور حکومت تھی۔ اس سلطنت کا دار الحکومت پہلے گلبرگہ تھا' پھر بیدر ہو گیا۔ اس خاندان میں کئی قابل حکمران ہوئے۔ ان میں ایک محمد شاہ اوّل تھا۔ شروع میں وہ شراب پیتا تھا۔ اس عہد کے ایک بزرگ شیخ زین العابدین نے بادشاہ کے ہاتھ پر محض اس لئے بیعت نہیں کی کہ وہ شراب نوش تھا۔ اس پر بادشاہ نے غصے میں آ کر ان کو جلا وطن کر دیا۔ بعد میں بادشاہ اپنی اس حرکت پر شرمندہ ہوا اور شیخ زین الدین کو واپس بلا لیا۔ لیکن وہ اس شرط پر آنے پر رضامند ہوئے کہ سلطان شریعت پر عمل کرے' شراب نہ پئے' سلطنت میں تمام شراب خانے بند کر دے۔ علمائے دین اور سرکاری ملازمین کو حکم جاری کر دے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر عمل کرے۔ چنانچہ بادشاہ نے ایسا ہی کیا۔ شیخ زین الدین خوش ہو کر واپس آ گئے۔ محمد شاہ اوّل کا ایک اور قابلِ ذکر کارنامہ اپنے نام کا سکہ جاری کرنا ہے۔ اب تک دکن میں ہندوؤں کے سکے چلتے تھے۔ محمد شاہ پہلا بادشاہ ہے جس نے بہمنی سکے چلائے اور ان کو اسلامی ملکوں کے سکّوں کے مشابہ کیا۔

بہمنی سلطنت کے ایک وزیر محمود گاواں کے عہد میں بہمنی سلطنت پورے عروج پر پہنچ گئی۔ وہ محمد شاہ سوم (1463ء تا 1482ء) کا وزیر اعظم تھا۔ اس نے اراضی کی پیائش کر کے منصفانہ محصول مقرر کیا۔ بدنظمی دور کی اور فوجوں کو ترقی دی۔ اس کی زندگی سادہ تھی اور اہل علم کی صحبت میں رہتا تھا۔ اس نے بیدر میں ایک عظیم الشان مدرسہ قائم کیا جس کے کھنڈرات اب تک موجود ہیں۔ وہ ریاضی اور طب کا ماہر تھا۔ اس نے دو کتابیں بھی لکھیں' لیکن اس اچھے اور مدبّر وزیر کو بادشاہ نے حاسدوں کی باتوں میں آ کر قتل کرا دیا۔ اس کے بعد بہمنی سلطنت کو زوال ہو گیا اور وہ حسب ذیل چھوٹی چھوٹی حکومتوں میں تقسیم ہو گئی:

(1) عادل شاہی۔ بیجاپور (1490ء۔1686ء)

(2) نظام شاہی۔ احمد نگر (1490ء۔1633ء)

(3) قطب شاہی۔ گولکنڈہ (1512ء۔1687ء)

(4) بریدشاہی۔ بیدر (1487ء۔1619ء)
(5) عمادشاہی۔ برار (1490ء۔1574ء)

عمادشاہی حکومت 1574ء میں احمد نگر کی حکومت میں اور بریدشاہی حکومت 1619ء میں بیجاپور کی حکومت میں شامل کردی گئی۔ باقی تین حکومتیں اپنے اپنے وقت آخر میں مغلیہ سلطنت میں شامل کرلی گئیں۔

(3) بنگال (1338ء تا1576ء)

بنگال محمد تغلق کے عہد میں 1338ء میں سلطنت دہلی سے آزاد ہوگیا تھا۔ شروع میں یہاں کے تین صوبیداروں نے تین حکومتیں قائم کرلی تھیں۔ یہ حکومتیں مشرقی بنگال' شمال بنگال اور مغربی بنگال پر مشتمل تھیں۔ الیاس شاہی خاندان (1343ء تا 1487ء) اور حسین شاہی خاندان (1493ء۔ 1538ء) کی حکومتیں زیادہ مشہور ہوئیں۔ 1538ء میں بنگال پر شیر شاہ سوری نے قبضہ کرلیا۔ سوری خاندان کی یہ حکومت 1555ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد کرائی پٹھان بنگال پر قابض ہوگئے جن سے 1576ء میں اکبر بادشاہ نے بنگال چھین لیا اور اس کو مغلیہ سلطنت کا ایک صوبہ بنادیا۔

(4) سندھ (1236ء۔1591ء)

قطب الدین ایبک کے بعد شہاب الدین غوری کے ایک اور غلام ناصرالدین قباچہ نے' جو سندھ کا صوبیدار تھا' یہاں اپنی آزاد حکومت قائم کرلی۔ قباچہ کی سلطنت ملتان اور اوچ بہاولپور تک پھیلی ہوئی تھی۔ اوچہ کا شہر اس کا دارالحکومت تھا۔ قباچہ نے (1210ء تا 1227ء) سترہ سال حکومت کی۔ اس کی حکومت کو التتمش نے ختم کردیا۔ اس کے بعد سندھ سلطنت دہلی کا ایک صوبہ بن گیا۔ جب سلطنت دہلی کو زوال ہوا تو سندھ میں پھر ایک بار آزاد حکومت قائم ہوگئی۔ یہ آزاد حکومت جو سُمرہ راجپوتوں کی تھی' تقریباً اڑھائی سو سال (1336ء تا 1591ء) تک قائم رہی۔ ٹھٹھہ کا شہر سندھ کا دارالحکومت تھا۔ سُمرہ خاندان میں کئی اچھے بادشاہ ہوئے' لیکن ان میں جام نظام الدین (1461ء تا 1519ء) سب سے مشہور اور نیک بادشاہ ہوا ہے۔ جام نظام الدین کسی مسلم علاقے پر حملہ کرنا پسند نہیں کرتا تھا۔ اس کے عہد میں سنتِ نبوی ﷺ کا ایسا رواج ہوا کہ حیرت ہوتی ہے۔ لوگ نماز باجماعت کے عادی ہوگئے تھے۔ جام کے زمانے میں ایران سے کئی علماء سندھ آئے۔

جام نظام الدین کے بیٹے جام فیروز (1509ء۔1520ء) کے عہد میں قندھار کے حکمران شاہ بیگ ارغون نے جام فیروز کو شکست دے کر سندھ پر قبضہ کرلیا اور سُمرہ خاندان کی حکومت ختم کردی۔ سُمرہ حکمرانوں کا لقب "جام" تھا۔

سندھ پر خاندان ارغون کی حکومت 1520ء سے 1556ء تک رہی۔ اس کے بعد ترخان خاندان کی حکومت قائم ہوگئی جو 1591ء تک قائم رہی۔ اس کے بعد اکبر بادشاہ کے سپہ سالار عبدالرحیم خان خاناں نے جانی بیگ ترخان کے عہد میں سندھ پر قبضہ کرکے اسے مغلیہ سلطنت کا حصہ بنالیا۔

(5) ملتان (1438ء تا1527ء)

سندھ کی طرح ملتان میں بھی محمد بن قاسم کے زمانے ہی سے مسلمانوں کی حکومت قائم ہوچکی تھی۔ سلاطین دہلی کے زمانے میں اس شہر نے بڑی ترقی کی۔ یہاں بڑے بڑے اولیاء اللہ گزرے ہیں جنہوں نے ایک طرف مسلمانوں کی اخلاقی اصلاح کی اور دوسری طرف غیر مسلموں میں اسلام کی اشاعت کی۔ ان بزرگوں میں حضرت بہاءالدین زکریا اور حضرت رُکن عالم' حضرت صدر الدین عارف بہت مشہور ہیں۔ امیر خسرو بھی کئی سال اس شہر میں مقیم رہے۔ ملتان کی تعریف میں ان کا یہ شعر بہت مشہور ہے:

ملتانِ ما بہ جنت اعلیٰ برابر است
آہستہ پا بنہہ کہ ملک سجدہ لے کنند
(یعنی ہمارا ملتان عزت میں جنت کے برابر ہے۔ یہاں آہستہ پاؤں رکھو کہ یہاں کی زمین پر فرشتے سجدہ کرتے ہیں)

دہلی کی سلطنت کے زوال کے بعد یہاں تقریباً 90 سال آزاد حکومت قائم رہی۔ اس حکومت کا سب سے مشہور حکمران شاہ حسین لنگاہ ہوا ہے۔ اس نے تیس برس تک کامیابی سے حکومت کی۔ حسین لنگاہ کے بعد ملتان کی حکومت کمزور ہوگئی اور 1527ء میں پہلے مغل حکمران بابر بادشاہ نے اس پر قبضہ کرلیا۔ ملتان کی حکومت پہلی آزاد حکومت تھی جو دہلی کی مغل سلطنت میں شامل ہوگئی۔

(6) گجرات (1396ء تا1572ء)

گجرات میں مسلمان سب سے پہلے محمود غزنوی کے عہد میں داخل ہوئے۔ اس کے بعد شہاب الدین غوری کے عہد میں کئی حملے کیے گئے' لیکن فتح نہ کرسکے۔ گجرات کو پہلے 1297ء میں علاؤالدین خلجی نے فتح کرکے سلطنت دہلی میں شامل کیا۔ اس کے بعد 104 سال تک گجرات سلطنت دہلی کا ایک صوبہ رہا۔ امیر تیمور کے حملے کے بعد جب سلطنت دہلی کمزور ہوگئی تو 1401ء یہاں کے صوبیدار نے آزاد حکومت قائم کرلی۔ یہ حکومت 117 سال قائم رہی۔

گجرات بڑا زرخیز اور آباد صوبہ تھا۔ یہاں پونے دو سو سال کے عرصے میں کئی بادشاہ ہوئے' جنہوں نے ملک کو بڑی ترقی دی۔ ان میں ایک احمد شاہ (1411ء تا 1441ء) تھا۔ احمد آباد کا مشہور شہر اسی نے آباد کیا تھا اور وہ احمد آباد اس وقت سے گجرات کا سب سے مشہور شہر ہے۔ احمد شاہ نے جونا گڑھ اور سورت فتح کیے۔ وہ جب کوئی علاقہ فتح کرتا تھا تو ہر شہر میں ایک جامع مسجد' ایک سرائے اور ایک مدرسہ تعمیر کراتا تھا۔ احمد شاہ کے عدل وانصاف کا ایک واقعہ بڑا مشہور ہے۔ اس کے داماد نے ایک شخص کو کسی قصور کے بغیر قتل کردیا۔ جب احمد شاہ کو اس کا علم ہوا تو اس نے داماد کو قتل کے جرم میں پھانسی دے دی۔ جب اس سے کہا گیا کہ آپ خون بہا دے سکتے تھے تو اس نے جواب دیا "اس طرح رعایا کے خون کو امراء اور شہزادے جائز سمجھ لیں گے اور اپنے خزانوں سے خون بہا دیتے رہیں گے اور خون کرتے رہیں گے۔ شریعت کا منشا یہ نہیں ہے"۔

احمد شاہ اگرچہ بہت اچھا بادشاہ تھا' لیکن گجرات کا سب سے مشہور بادشاہ محمود بیگڑہ (1458ء تا1511ء) ہوا ہے۔ اس نے 52 سال حکومت کی۔ وہ شریعت کا پابند تھا۔ حیادار اتنا تھا کہ نامحرم عورتوں کے سامنے پاؤں بھی ڈھک لیتا تھا۔ وعدے کا پابند تھا۔ اس کی شہرت یورپ تک ہوگئی تھی اور دہلی کے بادشاہ سکندر لودھی نے اس کو تحفے بھیجے۔ محمود بیگڑہ مسلم حکومتوں سے لڑنا اچھا نہیں سمجھتا تھا۔ جب مالوہ کے بادشاہ محمود خلجی کا انتقال ہوا تو امراء نے مالوہ پر قبضہ کرنے کا مشورہ دیا' لیکن محمود بیگڑہ نے یہ کہہ کر انکار کردیا: "اسلام میں یہ جائز نہیں ہے کہ مسلمان مسلمان سے لڑیں اور ایک ہمسایہ ملک دوسرے کی کمزوری سے فائدہ اٹھا کر اس پر چڑھ دوڑے"۔

گجرات پر 1573ء میں مغلوں نے قبضہ کرکے اسے مغلیہ سلطنت میں شامل کردیا۔

(7) مالوہ (1392ء تا1531ء)

ہندوستان میں دریائے نربدا کے شمال' راجپوتانہ کے جنوب اور گجرات کے مغرب میں جو علاقہ ہے' وہ مالوہ کے نام سے مشہور ہے۔ یہاں کی زمین بڑی زرخیز ہے اور بھوپال' اُجین اور اندور یہاں کے مشہور شہر ہیں۔ مالوہ 1310ء میں علاؤالدین خلجی کے عہد میں سلطنت دہلی میں شامل ہوا تھا۔ 90 سال بعد 1401ء میں یہاں کے صوبیدار نے آزاد حکومت قائم کرلی جو 1531ء تک قائم رہی۔ اس عرصے میں مالوہ نے بڑی ترقی کی اور اس کا دارالحکومت مانڈو اپنی شان وشوکت میں پاک و ہند کے

بہترین شہروں میں شمار ہونے لگا۔ مالوہ کے بادشاہوں میں محمود خلجی (1426ء تا 1464ء) بڑا نامور ہوا ہے۔ اس کے عہد میں مالوہ کی سلطنت اپنے عروج پر پہنچ گئی۔ محمود خلجی کے انتقال کے 62 برس بعد 1531ء میں مالوہ پر گجرات کا قبضہ ہو گیا۔

(8) جون پور (1394ء تا 1476ء)

فیروز شاہ تغلق کے زمانے میں جو شہر تعمیر کئے گئے ان میں جون پور نے سب سے زیادہ شہرت حاصل کی۔ اس شہر کی بنیاد 1359ء میں ڈالی گئی تھی۔ جون پور کی آزاد ریاست کا بانی ملک سرور (1394ء تا 1399ء) تھا جسے محمود تغلق نے اودھ سے بہار تک مشرقی صوبوں کا حاکم مقرر کیا تھا۔ جب سلطنتِ دہلی کمزور ہونے لگی تو دوسرے صوبیداروں کی طرح اس نے بھی دہلی سے آزادی کا اعلان کر دیا۔ جون پور کی حکومت کو "سلطنت شرقی" بھی کہتے ہیں۔

سلاطین جون پور میں سب سے مشہور ابراہیم شاہ شرقی (1402ء تا 1436ء) ہوا ہے۔ ابراہیم علوم و ادبیات کا بھی سرپرست تھا۔ سلطنت دہلی کے زوال کے بعد دہلی کے بہت سے علماء و ادباء نے جون پور کا رخ کیا اور ابراہیم شرقی نے ان کے وظائف مقرر کئے۔ ابراہیم شرقی نے جون پور کو کئی خوبصورت عمارتوں سے بھی آراستہ کیا۔ ان میں اٹالا مسجد بہت مشہور ہے اور اسلامی ہند کی خوبصورت عمارتوں میں شمار ہوتی ہے۔

حسین شاہ شرقی اس سلطنت کا آخری بادشاہ تھا۔ اس کے عہد میں 1476ء میں بہلول لودھی نے جون پور پر قبضہ کر کے سلاطین شرقی کی حکومت کا خاتمہ کر دیا۔

(9) لودھی سلطنت

سلطنتِ دہلی کے حال میں ہم نے لکھا تھا کہ 1412ء میں سلطان محمود تغلق کے انتقال کے بعد دہلی میں کئی سال تک ہنگامے رہے اور سیّدوں کا خاندان مضبوط حکومت قائم کرنے میں کامیاب نہ ہو سکا' لیکن 1451ء میں لاہور اور سرہند کے پٹھان صوبیدار بہلول لودھی (1451ء تا 1489ء) نے دہلی پر قبضہ کر کے ایک بار پھر مضبوط حکومت قائم کر دی۔ اس نے جون پور بھی فتح کر لیا' اور وہاں بھی ایک آزاد حکومت قائم کر دی۔

دہلی کی یہ لودھی سلطنت اگرچہ جون پور سے ملتان تک پھیلی ہوئی تھی' لیکن دہلی کی مرکزی حکومت کے مقابلے میں بہت چھوٹی تھی۔ اس کی حیثیت مذکورہ بالا سب مقامی حکومتوں کی طرح صرف ایک صوبائی کی سی تھی۔

لودھی خاندان میں سب سے زیادہ شہرت بہلول کے لڑکے سکندر لودھی (1489ء تا 1517ء) کو حاصل ہے۔ اس نے آگرہ شہر کی بنیاد ڈالی۔ ابتدا میں آگرہ کا نام سکندر آباد تھا۔ شہر آباد ہو جانے کے بعد سکندر لودھی نے دہلی کی بجائے آگرہ ہی کو دارالحکومت بنا لیا۔

سکندر لودھی کی طبیعت میں خیر اور نیکی کا جذبہ بہت تھا۔ ایک موقع پر وہ اپنے بھائی باریک شاہ لودھی سے جنگ کر رہا تھا کہ عین لڑائی کے وقت ایک قلندر نے اس کا ہاتھ پکڑ کر کہا کہ تیری فتح ہے۔ اس پر بادشاہ نے جھنجھلا کر ہاتھ چھڑا لیا اور کہا کہ "جب لڑائی میں دونوں طرف مسلمان ہوں تو ایک طرف حکم لگانا نہیں چاہئے' بلکہ یہ کہنا چاہئے کہ جس چیز میں اسلام کی خیر ہو وہ کام ہو"۔

ایک اور موقع پر سکندر لودھی نے ایک جگہ کے ہندوؤں کا قتل عام کرنا چاہا اور ان کے مندر توڑنے چاہے' لیکن اس وقت کے ایک صوفی بزرگ میاں عبداللہ نے ایسا کرنے سے بادشاہ کو منع کیا۔ اس پر سکندر نے ناراض ہو کر کہا: "تو کافروں کی مدد کرتا ہے۔ اوّل میں تجھ کو قتل کروں گا' پھر سارے ہندوؤں کو قتل کروں گا"۔ اس پر عبداللہ نے کہا: سب کی جان اللہ کے ہاتھ میں ہے۔ کوئی اللہ کے حکم کے بغیر مر نہیں سکتا۔ جب آپ نے مجھ سے مسئلہ پوچھا تو میں نے شرع کے مطابق جواب دیا۔ اگر شرعی احکام کا آپ کو پاس نہیں ہے تو پوچھنا بے کار ہے"۔ اس پر سکندر لودھی کا غصہ کم ہو گیا اور اس نے اپنا فیصلہ بدل دیا۔

سلطان سکندر لودھی کے عہد میں ہندوؤں نے پہلی مرتبہ فارسی پڑھنا شروع کی اور اس نے ان ہندوؤں کو سرکاری ملازمت میں رکھا۔ اس کے عہد میں سنسکرت کی کتابوں کا فارسی میں ترجمہ کیا گیا۔

سکندر کے بعد اس کا لڑکا ابراہیم لودھی (1517ء تا 1526ء) تخت پر بیٹھا۔ یہ سخت نااہل حکمران تھا۔ اس کو پانی پت کی پہلی لڑائی میں کابل کے مغل حکمران بابر نے شکست دے کر 1526ء میں دہلی پر قبضہ کر لیا اور ہندوستان میں سلطنتِ مغلیہ کی بنیاد ڈالی۔

14

ہندو سماج پر اسلام کے اثرات

لودھیوں کے عہدِ حکومت کا ایک قابلِ ذکر واقعہ شمالی ہند میں کئی ایسے بزرگوں کا ظہور ہے جنہوں نے اسلامی عقائد و نظریات کو ہندوؤں کے عقائد میں شامل کرنا چاہا اور ایسے فرقوں کا آغاز کیا جن میں دونوں مذاہب کے عقائد شامل تھے۔

اب مسلمانوں کو ہندوستان میں آئے تقریباً آٹھ سو سال ہو گئے تھے۔ اسلام کی دینیات' تہذیب' فلسفۂ حیات اور طرزِ معاشرت و تمدن کا مقابلہ ہندوؤں کے لئے ممکن نہ ہو سکا۔ ہندو سماج میں اتنی کشش اور گنجائش ضرور موجود تھی کہ بہت سے ناآشنائے تمدن وحشی قبائل مثلاً کشان' ہن' حتیٰ کہ جین من اور بدھ مت جیسے روشن خیال مذاہب کو اپنے اندر جذب کر لیا' کیونکہ یہ سب کسی نہ کسی عنوان سے ہندومت کے عقائد اور ان کی بت پرستی سے تعلق رکھتے تھے' لیکن وہ اسلام اور مسلمانوں کو اپنے اندر جذب نہ کر سکے۔ دوسری طرف مسلمانوں نے بنیادی طور پر ارشاد ربانی "لا اکراہ فی الدین" کے مدِنظر کبھی ہندوؤں کو بہ جبر مسلمان بنانے کی کوشش نہیں کی۔ رذیل سے رذیل ذات کے ہندوؤں کو برضا و رغبت قبول اسلام کے بعد اپنا ہم رتبہ اور بسا اوقات اپنا ہم خاندان بنا لینا ان کا شعار تھا۔ مسلمانوں کی مذہبی رواداری کا عالم تو یہ ہے کہ انہوں نے اپنی حکومت میں بھی ہندوؤں کو یہ حق دے دیا تھا کہ وہ انہیں ملیچھ (نجس) اور راکھشش (عفریت) کہتے رہیں اور بے شک عملی طور پر اچھوت سمجھتے رہیں' ورنہ جن لوگوں نے سومناتھ اور دیبل اور دوسرے مقامات کے بڑے بتوں کو پاش پاش کر دیا تھا' ان کے لئے ان بت پرستوں کی سرکوبی کیا مشکل تھی۔ فاضل مورخ ڈاکٹر تاراچند نے اپنی تصنیف "مختصر تاریخ اہل ہند" میں لکھا ہے کہ "تیمور کے ہندوستان پر حملہ کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ یہاں کے سلاطین نے مسلمان ہونے کے باوجود ہندوؤں کو مذہبی آزادی دے رکھی تھی"۔

مسلمانوں کی انصاف پسندی اور عدل گستری کی کیفیت یہ تھی کہ ایک معمولی قطعۂ زمین کے تنازعے میں قاضی القضاۃ (چیف جسٹس) نے ایک ہندو کو سلطان فیروز شاہ تغلق کے خلاف ڈگری دے دی تھی اور سلطان کو بہ نفس نفیس قاضی کی عدالت میں حاضر ہونا پڑا تھا۔

یہ ممکن نہیں ہو سکتا تھا کہ مسلمانوں کی زبردست رواداری' تہذیبی برتری' اخلاقی تفوق اور انسان دوستی کی عملی

مثالیں ہندوؤں پر اثر انداز نہ ہوتیں۔ چنانچہ ان آٹھ صدیوں کے دوران میں (بابر کی آمد سے پہلے پہلے) اسلام‘ اس کے فلسفۂ توحید اور اس کے طریق مساوات نے ہندوؤں کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔

اسلامی تبلیغ و دعوت کا فریضہ فاتحوں اور بادشاہوں کی رواداری سے زیادہ مسلمان علماء اور صوفیاء نے ادا کیا۔ صوفیائے کرام خوش مزاجی‘ سادگی‘ حلم اور بردباری کے پیکر تھے۔ انہوں نے اسلام کی تعلیمات کو اتنے شیریں‘ مدلل‘ اثرانگیز اور دل نشیں انداز میں پیش کیا کہ ہندو عوام و خواص متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے۔ اسلامی نظریۂ توحید نے برہمنیت کا طلسم توڑ دیا۔ مسلمانوں کے ساتھ شہروں اور بستیوں‘ گلی کوچوں اور منڈیوں اور بازاروں میں صدیوں کے میل جول کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہندوؤں کی فکری‘ مذہبی‘ عملی اور معاشرتی زندگی کا ہر پہلو اسلام (نظریۂ پاکستان) سے لازماً متاثر ہوا۔

محکوم ہندوؤں کے مقابلے میں حاکم مسلمان ہمیشہ اقلیت میں رہے اور یہ ایک ٹھوس اور ناقابل تردید حقیقت ہے کہ ہندوؤں نے اپنی پراچین سمتا (قدیم تہذیب) اور ہندو راج کی بحالی کے سلسلے میں کبھی کوئی دقیقہ فروگذاشت نہیں کیا‘ لیکن انہیں ہر مرتبہ شکست نصیب ہوئی اور آخر کار وہ آخری مذہب‘ برتر تہذیب اور بااصول قوم کے سامنے سرتسلیم خم کرنے پر مجبور ہوگئے۔ (اس حقیقت سے بھی انکار نہیں کیا جاسکتا کہ ہندو تہذیب و تمدن نے مسلمانوں پر بھی اثر ڈالا‘ جس کا ذکر آئندہ کسی باب میں کیا جائے گا) اسلام سے ہندوؤں کی اثر پذیری کو عامۃ المسلمین کے اخلاقی رویوں‘ مسلمان علماء و صوفیاء کی تعلیمات اور خاص اسلوب تبلیغ نے دو آتشہ کردیا۔ یوں بے شمار ہندوؤں نے اسلام قبول کیا‘ لیکن ان کے بعض رہنماؤں نے تمام ہندوؤں کو اسلام کی آغوش میں جانے سے بچانے کے لئے سوچا کہ خود ہندومت کے عقائد میں اصلاحیں کی جاسکتی ہیں۔ چنانچہ سب سے پہلی اور بڑی اصلاحی تحریک ’’بھگتی تحریک‘‘ ہے۔

بھگتی تحریک:

اس تحریک کے بانی بھگت کبیر تھے جو 1440ء میں بنارس میں ایک برہمن عورت کے بطن سے پیدا ہوئے۔ وہ اس عورت کی ناجائز اولاد تھے جو اپنے گناہ کو چھپانے کی غرض سے اپنے بچے کو ایک تالاب کے کنارے چھوڑ کر بھاگ گئی تھی۔ اس بچے کو اتفاق سے ایک مسلمان جولاہے نیرو نے دیکھا اور اسے اٹھا کر لے گیا اور اس کی بیوی نے بچے کی پرورش کی۔ ابھی کبیر کی عمر زیادہ نہ تھی کہ وہ راما نند کی تعلیمات سے متاثر ہوئے اور ان کے ارادت مندوں میں داخل ہوگئے۔ راما نند نے رام اور سیتا کی پوجا پر زور دیا اور ذات پات کی تفریق کی سخت مخالفت کی۔ ان کی تحریک بہت جلد پھیلی‘ کیونکہ وہ زیادہ تر نچلی ذات کے لوگوں کو اپنے حلقے میں شامل ہونے کی دعوت دیتے تھے‘ دوسرے وہ تبلیغ کا کام عوام کی زبان میں کرتے تھے۔

یقین سے نہیں کہا جاسکتا کہ کبیر‘ راما نند کے چیلے تھے‘ مگر اس میں شک نہیں کہ ان کی فکر اور تعلیمات پر راما نند کا گہرا اثر تھا۔ وہ خدا کو رام کہتے ہیں اور اس کی ذات کے ساتھ بعض صفات پر بھی اعتقاد رکھتے ہیں۔ وہ ذات پات کی تفریق کے سخت خلاف تھے اور برہمنوں نے جو رسومات قائم کر رکھی تھیں‘ ان کو پسند نہیں کرتے تھے۔ ان کا قول ہے: ’’ہر شخص یا بے وقوف ہے یا عقل مند‘ لیکن رام کو کوئی نہیں جانتا‘ حالانکہ وہ ہر ایک کے دل میں ہے۔ کبیر صرف توحید اور خدا کی محبت پر زور دیتے تھے‘ اس لئے مسلمان اور ہندو دونوں ان کا احترام کرتے تھے۔ صوفیہ بھی توحید اور عشق الٰہی پر زور دیتے تھے‘ مگر ان میں کبیر یا بھگتی تحریک کے دوسرے رہنماؤں میں بہت بڑا فرق یہ تھا کہ صوفیہ قرآن و سنت ہی کو اللہ تک پہنچنے کا واحد ذریعہ خیال کرتے تھے۔

’’تذکرہ اولیائے ہند‘‘ میں انہیں شیخ کبیر جولاہا لکھا ہے اور کہا ہے کہ یہ ’’حضرت تقی سہروردی کے خلیفہ تھے اور مشاہیر زمانہ سے ہوئے ہیں۔ اپنی ولایت کو طریقہ ملامتیہ میں چھپایا تھا اور تمام موحدان وقت سے ممتاز تھے۔ ان کی تقلید گورونانک نے کی۔ کبیر صاحب حضرت شیخ بھیکا چشتی کی خدمت میں رہ کر خرقۂ خلافت حاصل کیا اور ہندو و مسلمان دونوں آپ کے معتقد تھے۔ آپ کے سلسلے کے جو اہل ہنود ہیں‘ وہ کبیر پنتھی کہلاتے ہیں۔ ان کا اذکار و اشغال کا طریق بالکل اہل اسلام کے مطابق ہے‘ مگر الفاظ کا فرق ہے۔‘‘

کبیر نے 1518ء میں وفات پائی۔ کہا جاتا ہے کہ ان کی وفات پر ہندو اور مسلمانوں میں جھگڑا ہوا۔ دونوں کہتے تھے کہ وہ ان کے مذہب ہیں اور اسی طریق سے ان کی تجہیز و تکفین ہونی چاہیے۔ ان کی نعش پر چادر ڈال دی گئی۔ جب اس کو اٹھایا گیا تو بجائے مردہ جسم کے پھول تھے۔ آدھے پھول مسلمانوں نے ناگر میں دفن کر دیئے اور آدھے ہندوؤں نے بنارس لے جا کر جلا دیئے۔ بھگتی کی روحانی پنج شیلا (پانچ ارکان) یہ ہیں:

اول: خدا کی توحید پر کامل یقین رکھنا۔ اسے زمان و مکان کی قیود سے بالاتر سمجھنا اور یہ تسلیم کرنا کہ اسے خواہ کسی نام سے پکارا جائے‘ وہ ہر حالت میں خدا ہے۔

دوم: خدا کا عرفان صرف عشق الٰہی اور توفیق خداوندی سے حاصل ہوسکتا ہے‘ اس لئے یاترا کرنا‘ مالا پھیرنا اور دریاؤں میں اشنان کرنا سب لایعنی باتیں ہیں۔

سوم: گورو (پیر) کو برگزیدہ سمجھ کر اس کی خدمت کرنا اور اسے معرفت الٰہی کا وسیلہ سمجھنا

چہارم: ذات پات کی تفریق کو فضول اور لایعنی سمجھنا۔ بت پرستی کو لعنت تسلیم کرنا‘ برہمنیت کو جھوٹ اور لغو قرار دینا۔

پنجم: فقیر و امیر‘ زردار و نادار‘ آقا اور غلام‘ سب کو برابر اور مساوی سمجھنا۔

گورونانک

جو بعد میں سکھ مت کے بانی ہوئے‘ موضع تلونڈی (ننکانہ صاحب) میں 1469ء میں پیدا ہوئے۔ بھگت کبیر کی طرح انہوں نے بھی بت پرستی اور ذات پات کی تفریق کی سخت مذمت کی اور توحید پر بہت زور دیا۔ ان کے خیال میں نیک کام اور صاف ستھری زندگی خالی خولی اور بے مقصد بحث مباحثے سے بہتر ہے۔ ان کی تعلیم کا خلاصہ یہ ہے کہ مذہب صرف زبانی باتوں کا نہیں۔ جو شخص سب انسانوں کو برابر سمجھتا ہے‘ دراصل سچا مذہبی انسان ہے۔ مذہب مزارات یا مردہ گھاٹوں پر جانے اور ایک خاص طرز سے بیٹھ کر مراقبے کا نام نہیں‘ نہ مذہب دوسرے ممالک کا سفر کرنے اور تیرتھ گاہوں کے مقامات پر جاکر اشنان کرنے کو کہتے ہیں۔ دنیاداری کی گندگیوں میں رہ کر صفائی حاصل کرو۔ اسی طریقے سے مذہب کا صحیح راستہ ملے گا۔

سوامی چیتنیہ:

1485ء میں بنگال کے ایک برہمن خاندان میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہ برس کی عمر میں ان کی شادی ہوگئی۔ 25 سال کی عمر میں سنیاس لے کر بھگتی کا پرچار شروع کیا۔ وہ بھگت ولبھ اچاریہ کے خاص شاگردوں میں سے تھے۔ انہوں نے 1533ء میں وفات پائی۔

سوامی نے ہندومت کی مذہبی رسوم اور طریق عبادت کی مخالفت کی۔ ذات پات کی تفریق کی مذمت کی اور ہندوؤں کے عقیدہ کرم کو غلط کہا۔ انہوں نے عشق الٰہی پر بہت زور دیا۔ ان کی نظر میں کرشن جی کی شخصیت اتنی بلند تھی کہ خود محبت کا دیوتا ان سے محبت کرتا تھا۔ کرشن کی ’’دل لگی‘‘ کا سلسلہ سورج کے طلوع و غروب کی طرح ہمیشہ جاری رہے گا۔ سوامی کے نزدیک کرشن کی تین قوتیں ہیں:

(1) دوامی‘ جو در حقیقت عقل و حکمت ہے

(2) بیرونی‘ جو ظاہری شکل و صورت کو وجود میں لاتی ہے

(3) امتیازی‘ جو انفرادی روح بناتی ہے

اس کی خاص قوت وہ ہے جس سے محبت پیدا ہوتی ہے۔ جب یہ محبت کسی دل میں داخل ہوجاتی ہے تو وہ مہا بھاؤ (بہترین احساس) بن جاتی ہے اور جب اپنی انتہائی بلندی پر پہنچتی ہے تو وہ رادھا کا روپ اختیار کرلیتی ہے‘ جو

سب سے زیادہ محبت کئے جانے کی اہل ہے۔ مختصر یہ کہ سوامی چیتنیہ کی تعلیمات نے روح میں جذبات کی تہذیب پر بہت زور دیا۔ محبت ان کی تعلیمات کی روح رواں تھی۔

ولبھاچاریہ:

سوامی اچاریہ سرزمین دکن (تلنگانہ) سے تعلق رکھتے تھے۔ وشنومت کے پیروکار اور مبلغ تھے۔ آپ نے نفس کشی' ترک لذات' حتیٰ کہ شادی بیاہ کے بکھیڑوں سے بھی بے نیاز رہتے ہوئے بھگتی کی تلقین فرمائی۔ غالباً اسی وجہ سے آپ کی تعلیمات غیر موثر ثابت ہوئیں اور آپ کی وفات کے بعد آپ کے شاگردوں کی تحریف کا نشانہ بن گئیں۔ بھگتی کے دوسرے علم برداروں میں میرابائی' نام دیو اور نامک ناتھ' یادھوا چاریہ' باسو وغیرہ قابل ذکر ہیں' جنہوں نے توحید الٰہی کی تبلیغ کی اور خدا کی محبت کو مقصد حیات قرار دیا۔

غرضیکہ اسلام کی تعلیمات کے زیر اثر ہندوؤں میں یا یوں کہنا چاہئے کہ بعض ہندوؤں میں توحید پرستی کا میلان پیدا ہوا۔ ان اثرات نے ایک محدود پیمانے پر ذات پات کی تفریق اور ادنیٰ و اعلیٰ طبقات کے امتیازات کم کر دیئے' لیکن بھگتی تحریک چونکہ مکتی (نجات) کے محور پر گھومتی تھی' اس لئے حیات و کائنات کے دوسرے مظاہر و عوامل کی تشریح و تعبیر سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا' اور یہ ظاہر ہے کہ انسان دنیا سے بے تعلق ہو کر محض مکتی اور تلاش حق کے لئے زندہ نہیں رہ سکتا تھا' اس لئے بھگتی کی تحریک صرف بھگتوں تک محدود رہی اور عوام جن کو رام اور کرشن کی محبت میں تلاش حق سے زیادہ تلاش معاش و روزگار کی فکر تھی' اس سے بے نیاز رہے۔

بھگتی تحریک دراصل اسلامی مساوات کے مقابلے کے لئے وجود میں آئی تھی' تاکہ برہمنوں کے سماجی تشدد اور منافرت کے شکار ہونے والے ہندو طبقے اسلام کی آغوش میں جانے کی بجائے بھگتی سے منسلک ہو کر ہندو برادری میں برابری کی حیثیت حاصل کر لیں' لیکن اس مقصد کی تکمیل نہ ہو سکی' کیونکہ چند نیک دل ہندو سادھوؤں اور سوامیوں کی فکر اسلامی افکار کا مقابلہ نہ کر سکی۔ اسلامی مساوات کا عملی اظہار تو ''خاندان غلاماں'' کی بادشاہت کی صورت میں ظاہر ہو چکا تھا اور ہو رہا تھا' لیکن بھگتی تحریک نے لوگوں کو سوائے رادھا' شام اور ستیا رام کی مالا جپتے رہنے کے مشورے کے اور کچھ نہیں دیا۔ تاہم اتنا ضرور ہوا کہ عوامی تبلیغ کے نتیجے میں چند علاقائی بولیاں ہندی' پنجابی' مرہٹی' راجستھانی' بنگالی' کناری' تامل اور تیلگو وغیرہ کو فروغ نصیب ہوا۔ مسلمان صوفیا کی تبلیغی مساعی اور ہندوؤں اور مسلمانوں کے عوامی میل جول سے اردو زبان وجود میں آئی' جس کو جس سرعت سے عروج نصیب ہوا' لسانیات کی تاریخ میں اس کی نظیر نہیں ملتی۔

ہندوؤں کا تہذیبی شعور' حقیقت یہ ہے کہ صرف مسلمانوں کے اثرات کی برکت سے بیدار ہوا' ورنہ جہاں تک ناچنے' گانے اور بتوں کو پوجنے کا تعلق ہے' افریقہ کے مردم خور قبائل بھی ہمیشہ سے ان حرکات و افعال کا ارتکاب کرتے آ رہے ہیں۔ مسلمانوں کی تہذیب نے ہندو سماج میں انقلاب برپا کر دیا۔ دیوتاؤں کی زبان سنسکرت بھی اردو اور دوسری عوامی بولیوں کے عروج سے ناراض ہو کر پرلوک (عالم بالا) کو سدھار گئی۔ مسلمانوں نے بہت سی صنعتوں کو فروغ بخشا۔ کاغذ سازی کے کارخانے قائم کئے' جن کی وجہ سے عوام میں ترویج علوم کی صورت پیدا ہوئی۔ بادشاہوں نے علماء کی سرپرستی کی اور ایسے ادارے قائم کئے' جن میں تصنیف و تالیف کا کام بڑے پیمانے پر انجام پانے لگا۔ ہندو تاریخ نویسی اور انشا پردازی سے ناواقف تھے۔ ان کی موسیقی' مصوری اور دیگر فنون لطیفہ صرف راج درباروں' راج مندروں اور برہمنوں تک محدود تھے۔ مسلمانوں نے ہندوؤں کو اپنے علوم و فنون سے روشناس کرایا اور ان کے فنون پر اثر انداز ہو کر انقلابی اصلاحات کیں۔ ہندوؤں کا فن تعمیر بھی ان کی تنگ نظری اور تنگ دلی کا آئینہ دار تھا۔ عام پختہ مکانوں سے لے کر محلات تک کی تعمیر میں دھوپ' کشادگی اور روشنی سے زیادہ تاریکی اور عزلت کا خیال رکھا جاتا تھا۔ ہندو اندھیرے میں شانتی (سکون) محسوس کرنے کے عادی تھے۔ عام صفائی' پاکیزگی اور طہارت کا احساس بھی ہندو عوام میں مفقود تھا۔ ہندو فقراء' سادھو' سنت تیاگی اور بیراگی وغیرہ اپنے جسموں پر بھبوت اور مختلف غلاظتیں مل کر تزکیۂ نفس کرتے تھے۔ یہ لوگ ننگے دھڑنگے رہنے کے عادی تھے۔ مسلمانوں کی صحبت نے انہیں صفائی' ستھرائی' پاکیزگی' طہارت اور روشنی کا گرویدہ بنا دیا۔

سید حسن ریاض اپنی تصنیف ''پاکستان ناگزیر تھا'' میں بھگتی تحریک پر اظہار رائے کرتے ہوئے لکھتے ہیں: ''اور جب سلطنت دہلی میں ضعف آیا تو برہمنوں نے بھگتی کے نام سے اپنی وہی تبلیغ شروع کی' جس سے انہوں نے سیتھیوں اور ہنوں کو ہندو مذہب میں جذب کیا تھا' اور اس سے ضعیف الاعتقاد اور جاہل انسانوں کے خیالات اور عقائد میں اختلال پیدا ہوا اور دیر تک رہا۔''

تحریک پاکستان نمبر

آئندہ کی اس اشاعت خصوصی کے لئے آپ کے ذہن میں کوئی سوال ہوں' تو ہمیں مطلع فرمایئے۔ ہم استفادہ کریں گے۔

النصر لیب

مستند اور تجربہ کار ڈاکٹروں کی زیر نگرانی ادارہ

ایک ہی چھت کے نیچے تمام اقسام کے معیاری لیبارٹری ٹیسٹ' ایکسرے' ای سی جی اور الٹراساؤنڈ کی سہولیات

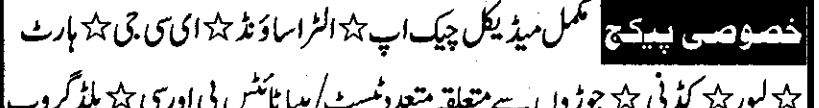

خصوصی پیکج مکمل میڈیکل چیک اپ ☆ الٹراساؤنڈ ☆ ای سی جی ☆ ہارٹ ☆ لیور ☆ کڈنی ☆ جوڑوں سے متعلقہ متعدد ٹیسٹ/ ہیپاٹائٹس بی اور سی ☆ بلڈ گروپ ☆ بلڈ شوگر ☆ مکمل بلڈ اور مکمل پیشاب ٹیسٹ صرف 1500 روپے میں کروائیں

ISO 9001:2000
QMS CERTIFIED CLINICAL LAB
BY MOODY INTERNATIONAL

تنظیم اسلامی کے رفقاء اور ندائے خلافت کے قارئین اپنا ڈسکاؤنٹ کارڈ لیبارٹری سے حاصل کریں۔

النصر لیب :950۔بی' مولانا شوکت علی روڈ' فیصل ٹاؤن (نزد راوی ریسٹورنٹ) لاہور
فون: 5162185-5163924 موبائل: 0300-8400944
E-mail:alnasar@brain.net.pk Website:www.alnasar.com.pk

15

ظہیر الدین بابر تا بہادر شاہ ظفر

سید حسن ریاض ہی کی تصنیف ''پاکستان ناگزیر تھا'' سے استفادہ کرتے ہوئے ایک طویل اقتباس:

''لودھیوں کے بعد ہندوستان کی شاہی اور شہنشاہی مغلوں کے ہاتھ میں آ گئی۔ یہ مسلمان تھے اور مخلص مسلمان' مگر بہت ہی نئے مسلمان۔ سیاست اور امور ملکی میں ابھی تک یہ چنگیزی ضوابط پر قائم تھے۔ بابر نے اسی بنیاد پر اپنی حکومت قائم کی اور اکبر نے اس کی تکمیل کر دی' یعنی حکومت کو مذہب سے کوئی تعلق نہیں اور حکومت کا انصرام سیاسی مصلحتوں کے مطابق ہو۔ پھر اکبر کی جہالت سے بھگتی کی تحریک کے اثرات اور آگے بڑھے اور مذہب و معاشرت دونوں میں ان سے اختلال پیدا ہو گیا۔

حضرت مجدد الف ثانی:

ان برے حالات کی اصلاح کے لئے حضرت مجدد الف ثانی نے سیاسی تدابیر اختیار کیں اور حضرت شیخ عبدالحق محدث دہلوی نے حدیث کے درس کے لئے مدرسہ قائم کیا۔ ان دونوں بزرگوں کی کوشش کا بڑا اثر ہوا۔ خود جہانگیر ان سے متاثر تھا اور اس نے اصلاح کی کوشش کی۔

(دنیا بھر میں تجدید و احیائے اسلام کی تاریخ' ''ندائے خلافت'' کے ہر شمارے میں 27 نومبر 2002ء سے قسط وار شائع ہو رہی ہے' جس کے تحت اب تک حضرت مجدد اور شاہ ولی اللہ کی تحریکات کا تذکرہ ہو چکا ہے اور سید احمد شہید کی تحریک جہاد کا ذکر جاری ہے)

شاہجہاں بہت ہی خوش عقیدہ مسلمان تھا اور پھر عالمگیر اول تو مغلوں میں ایک مجاہد اور مصلح پیدا ہوا' لیکن چونکہ ایک طویل عرصے تک نومسلموں کی دینی تربیت کی طرف توجہ نہیں کی گئی تھی اور حکومتوں کی غفلت اور لاپروائی سے ہندو مبلغوں کو اس کا موقع حاصل رہا کہ ان کے خیالات خراب کریں اور اس کے ساتھ ہی سیاسی الجھنیں بھی تھیں' اس لئے عالمگیر کی حکومت کے پچاس سال بجائے اسلامیت کی تعمیر و ترقی کے اکبری فتنوں کے استیصال کی کوشش میں ضائع ہوئے۔

وراثت کا اصول:

اکبر' جہانگیر' شاہجہاں اور عالمگیر کا زمانہ ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت کا انتہائی عروج تھا۔ برصغیر کے ہر گوشے میں مغلوں کا حکم جاری تھا' مگر ان کی تعمیر میں ایک ایسی خرابی مضمر تھی جس سے سلطنت تباہ ہو گئی۔ اس مغل خاندان میں تخت کی وراثت کے لئے اس کے سوا کوئی معین ضابطہ نہیں تھا کہ شہزادوں کے درمیان جنگ ہو اور جو سب پر غالب آئے' وہ بادشاہ ہو۔ چنانچہ ہوش سنبھالتے ہی ہر شہزادہ اس فکر میں لگ جاتا تھا کہ امرائے دربار' راجوں اور صوبیدار کے ساتھ سازشیں کرے۔ بابر کے بیٹوں سے لے کر عالمگیر کے بیٹوں تک سب کے درمیان تاج و تخت کے لئے لڑائیاں ہوئیں اور ان میں امرائے دربار' صوبوں کے گورنر اور ہندو راجہ متحارب شہزادوں کی طرف سے شریک ہوئے۔ اس طرح سلطنت میں تباہ کن سازشوں کا ایک جال بچھ گیا اور سرداروں کو اپنی طاقت بڑھانے کا موقع ملا۔

عالمگیر کے بعد:

عالمگیر کی زندگی ہی میں مرہٹوں نے بغاوتیں شروع کر دی تھیں اور مغل فوج کے سرداروں کی کاہلی اور عشرت پسندی کی وجہ سے وہ ان بغاوتوں پر قابو نہیں پا سکا تھا۔ 1707ء میں عالمگیر کا انتقال ہوا اور چند ہی سال کے اندر مرہٹوں نے دکن میں چوتھ وصول کرنے کا حق حاصل کر لیا۔ اس کے ساتھ ہی صوبوں کے گورنر خود مختار ہو گئے اور باہم لڑنے لگے۔ دکن کی لڑائیوں میں شہنشاہ عالمگیر کی مسلسل مصروفیت کا شمالی ہند میں یہ اثر ہوا کہ سکھوں جبکہ جاٹوں نے طاقت پیدا کر لی اور پنجاب میں سکھ جبکہ آگرہ' مالوہ اور ان کے جوار میں جاٹ لوٹ کھسوٹ کرنے لگے۔ جاٹوں کی سرکشی اتنی بڑھی کہ شمالی ہند سے جب مال گزاری کا روپیہ عالمگیر کے پاس دکن جاتا تو وہ راستے میں اسے لوٹ لیتے تھے۔ عالمگیر کی وفات کے بعد وہ دہلی پر حملے کرنے لگے۔ باشندگان دہلی کی زندگی خوف و ہراس میں گزرنے لگی۔ سکھوں نے آگے بڑھ کر دوآب کے شہر لوٹے۔ 1739ء میں نادر شاہ درانی نے حملہ کیا۔ دہلی میں قتل عام کیا اور اسے لوٹا۔ اس سے سلطنت مغلیہ کی بالکل ہی ہوا اکھڑ گئی۔ جاٹ' سکھ اور مرہٹے اور زیادہ شیر ہو گئے اور ان کی غارت گری کی انتہا نہ رہی۔

شاہ ولی اللہ:

سلاطین دہلی نے قرن اول کے عربوں کی طرح حکومت کے وسائل سے' سرکاری طور پر ہندوستان میں اسلام کی اشاعت نہیں کی اور نومسلموں کی دینی تربیت کا اہتمام نہیں کیا اور مغل بادشاہوں نے بجائے اسلامی کے' حکومت کو سیاسی اور ہندوستانی بنانے کی کوشش کی' اس وجہ سے حکومت و سلطنت کے تعلق کے ساتھ مسلمانوں میں اجتماعی تنظیم پیدا نہیں ہوئی اور وہ اسلامی اخلاق و کردار بھی پیدا نہیں ہوا جو اسلامی معاشرے کی تعمیر اور اتنی بڑی سلطنت کی حفاظت کے لئے ضروری تھا۔ وہ ہندوؤں میں خلط ملط ہو کر رہنے کی وجہ سے پستی کی طرف مائل تھے۔

شاہ ولی اللہ نے یہ سب دیکھا اور اپنی تصانیف میں اور خطوط میں ان کا ذکر کیا اور اصلاح احوال کے لئے کوشش کی۔ اُن کی اِن تحریروں کے مطالعے سے معلوم ہوتا ہے کہ انتظام حکومت میں سخت ابتری تھی' شاہی خزانہ خالی تھا' امراء اور درباری عیش کے دلدادہ تھے اور فرائض منصبی سے لاپروا۔ جاگیرداری نظام کی خرابیاں حکومت پر اثر انداز تھیں۔ سپاہی' شاعر اور صوفی مفت خوری کے عادی تھے۔ جاگیرداروں اور منصب داروں میں غدار بھی تھے۔ افواج میں تنظیم اور تربیت نہیں تھی۔ ان کی تنخواہیں وقت پر نہیں ملتی تھیں اور وہ سودی قرض لینے پر مجبور تھے۔ قاضیوں اور محتسبوں میں رشوت خوار تھے۔ مسجدوں کے امام جاہل تھے۔ رمضان کا احترام تک باقی نہیں رہا تھا۔ دستکار اور اہل حرفہ اپنے بیوی بچوں کے نان نفقے اور پرورش کی ذمہ داریاں پوری نہیں کرتے تھے۔

شاہ ولی اللہ نے پہلے نظام الملک سے اصلاح حالات کے لئے اپیلیں کیں' مگر وہ بادشاہ اور اس کے دربار سے مایوس ہو کر دکن میں اپنی حکومت مستحکم کرنے لگے۔ اس کے بعد شاہ صاحب نے نجیب الدولہ کو اس طرف توجہ کیا اور اس پر شاہ صاحب کے کہنے کا اثر ہوا۔ اس نے کوشش بھی کی' مگر جب اس کے مقابلے میں خود مسلمانوں نے جاٹوں کی مدد کی اور نجیب الدولہ کو شکست ہوئی تو وہ مایوس ہوا' مگر شاہ ولی اللہ نے اس کی ہمت بندھائی اور اس نے جدوجہد جاری رکھی۔ 1756ء میں ملہر راؤ ہولکر شمالی ہند میں ہندو پد بادشاہی قائم کرنے کے لیے آیا اور جاٹوں سے اس کا اتحاد ہو گیا اور دربار دہلی کے بعض امراء بھی اس سازش میں شریک ہو گئے۔ اب صورتحال نجیب الدولہ کے قابو سے باہر تھی اور اس کو مرہٹوں کی شرائط پر مرہٹوں سے صلح کرنی پڑی۔ اس کے بعد مرہٹے پنجاب کی طرف بڑھے۔ انہوں نے ادینہ بیگ کو پنجاب کا گورنر بنایا اور اس کے مرنے کے

بعد سوبا جی سیندھیا کو۔ اس طرح اٹک تک ہندوؤں کا اقتدار قائم ہوگیا۔

احمد شاہ ابدالی:

ان حالات سے پریشان ہو کر شاہ ولی اللہ نے احمد شاہ ابدالی کو خط لکھا اور اس میں ان تمام اسباب کا ذکر کیا جن کی وجہ سے برعظیم میں مسلمانوں کی طاقت کو زوال آیا تھا۔ انہوں نے یہ سب بتایا کہ مرہٹے اور جاٹ کیسے ابھرے اور ان کو یہ یقین تھا کہ ان کی طاقت ٹوٹ سکتی ہے اور وہ مغلوب ہو سکتے ہیں۔

احمد شاہ ابدالی شاہ صاحب کی دعوت پر ہندوستان آیا۔ پانی پت کے میدان میں مرہٹوں سے اس کی جنگ ہوئی۔ اس نے مرہٹوں کو ایسی سخت شکست دی کہ وہ پھر ہند و پد بادشاہی کا خواب دیکھنے کے قابل نہیں رہے۔ مگر یہ برا ہوا' اور معلوم نہیں کیوں ہوا کہ احمد شاہ ابدالی دہلی کا تخت شاہ عالم کے لئے چھوڑ کر واپس چلا گیا۔ چونکہ شاہ عالم کے بیٹے کو ولی عہد قرار دے کر نجیب الدولہ کو مدار المہام بنایا اور دہلی کا انتظام اس کے سپرد کیا۔ کاش یہ کیا گیا ہوتا کہ ایک معقول جیب خرچ کے ساتھ شاہ عالم کو آئینی بادشاہ کی حیثیت سے برقرار رکھ کر' تمام اختیارات حکومت مجلس وزراء کے سپرد کر دیئے جاتے' جس کے صدر حضرت شاہ ولی اللہ ہوتے اور وزیر جنگ نجیب الدولہ' تو ہندستان کے مسلمان تباہی سے بچ جاتے۔

جنگ پلاسی:

احمد شاہ ابدالی نے 1761ء میں مرہٹوں کو شکست دی' لیکن کلایو 1757ء ہی میں ہندوستان کے مستقبل کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے ہندو سیٹھوں کے ذریعے نواب بنگال کے سپہ سالار افواج میر جعفر کے ساتھ سازش کر کے جنگ پلاسی میں سراج الدولہ کو شکست دی' اس کو قتل کیا اور غداری کے انعام میں میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا دیا۔ میر جعفر کی نوابی انگریزوں کی نوابی تھی۔ بنگال کی حکومت کے تمام اختیارات عملاً انگریزوں کے ہاتھ میں آ گئے۔ شاہ عالم اپنے باپ کے وزیر اور قاتل عماد الملک کے خوف سے' جو مرہٹوں کے ساتھ ساز باز کئے ہوئے تھا' بہار اور بنگال میں سرگرداں تھا۔ احمد شاہ ابدالی کی فتح کے بعد وہی ہندوستان کا شہنشاہ تسلیم کیا گیا اور کلایو نے 1765ء میں وہیں اس سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے حق میں منصب دیوانی کا پروانہ حاصل کر لیا۔

مرہٹوں سے امداد کی بھیک:

شاہ عالم اب دہلی آنا چاہتا تھا اور الہ آباد میں اس بات کا منتظر تھا کہ انتظام ہو۔ انگریز وعدہ کرتے اور ٹالتے تھے۔ مجبوراً انہی مرہٹوں سے رجوع کرنا پڑا' جن سے جان چھڑانے کے لئے پانی پت کی جنگ لڑی گئی تھی۔ سیندھیا اپنی فوج کے ساتھ شاہ عالم کو دیوا جی کے کیمپ تک لایا اور دیوا جی کے ساتھ وہ دہلی میں داخل ہوا۔ اس خدمت کے معاوضے میں شاہ عالم نے پیشوا کو سلطنت مغلیہ کا میر بخشی (وکیل مطلق) مقرر کیا اور سیندھیا کو نائب وکیل مطلق۔ اب دہلی میں حکومت مرہٹوں کی تھی' مگر شاہ عالم کے نام سے۔

حکم کمپنی بہادر کا:

سیندھیا مرا۔ اس کا جانشین کم عمر تھا۔ سیندھیا کی فوج میں فرانسیسیوں کی ایک جمعیت تھی۔ اس کا سردار پیراں تھا اور علی گڑھ مستقر۔ ترکیب اور تدبیر سے فرانسیسی پیراں دہلی کے قلعے کا کمانڈنٹ بن گیا۔ انگریزوں کی نظر پورے ہندوستان کی سلطنت پر تھی اور وہ اس میں فرانسیسیوں کو اپنا خطرناک حریف سمجھتے تھے۔ ان کو یہ فکر لاحق ہوئی کہ فرانسیسیوں کا اگر اثر بڑھا تو ان کے لئے مشکل ہو گی۔ انہوں نے 1794ء میں علی گڑھ پر مرہٹوں سے جنگ کی اور ان کو شکست دی۔ دہلی مرہٹوں کی پناہ میں تھا' اس لئے دہلی پر خواہ مخواہ انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔ برطانوی کمانڈر انچیف جنرل لیک بادشاہ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ مغل شہنشاہ کا اب اس کے سوا کوئی کام نہیں رہ گیا تھا کہ جو فریق جیت کر آئے' اس کو خطابات اور خلعت عطا کر کے خود اپنا سرپرست تسلیم کر لے۔ اس نے جنرل لیک کو صمصام الدولہ' شجع الملک' خان دوراں بہادر' سپہ سالار فتح جنگ کے خطابات دیئے اور خلعت دیا۔ اس واقعے کے بعد وہ حالت قائم ہو گئی جس کا اس عام اعلان سے خوب اندازہ ہوتا ہے' جو اس زمانے میں مروج تھا: ''خلق خدا کی' ملک بادشاہ کا اور حکم کمپنی بہادر کا''

ٹیپو سلطان:

جنگ پلاسی کے بعد انگریزوں نے خود مختار صوبوں اور ریاستوں پر تسلط کے لئے سرگرمیاں شروع کیں۔ 1843ء میں انہوں نے سندھ پر قبضہ کیا۔ 1799ء میں میسور پر' 1817ء تک مرہٹوں کی آزاد حکومتیں ختم کر دیں۔ 1849ء میں سکھوں کو شکست دے کر پنجاب کا الحاق کیا اور 1856ء میں اودھ کا۔ اس کے بعد وہ پورے ہندوستان کے مالک تھے۔ ٹیپو سلطان کی شہادت اور اس کے ملک میسور پر انگریزوں کا قبضہ مسلم ہندوستان کے لئے ایک سانحہ عظیم تھا۔ اس دور میں صرف وہی ایک ایسا شخص تھا جس میں یہ قابلیت تھی کہ انگریزوں پر غلبہ حاصل کر کے مسلمانوں کو پھر عظمت و اقتدار کے مقام پر استحکام کے ساتھ قائم کر دیتا۔ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے اس کا ساتھ نہیں دیا۔

شاہ عبدالعزیز کا فتویٰ:

ملک میں اختلال اور حکومت میں غیر مسلموں کا غلبہ ہندوستانی مسلمانوں کو کیسا شاق تھا' اس کا صحیح اندازہ دشوار ہے۔ اس وقت سوائے اس حکومت کے جس پر انگریز قابض تھے' مسلمانوں کا کوئی سیاسی نظام نہیں تھا' جس کے ذریعے سے ان کے جذبات و خیالات کا اظہار ہوتا۔ اہل علم کے طبقے سے شاہ ولی اللہ منظر عام پر آئے تھے اور وہ اس وقت کے حالات سے متاثر تھے۔ اپنے تاثرات انہوں نے تحریر میں چھوڑے اور ایک ایسی عملی کوشش بھی کی کہ اگر آخر تک صحیح راہ پر آگے بڑھتی تو ہندوستان میں مسلم اقتدار کی حفاظت ممکن تھی۔ ان کے بعد ان کا مدرسہ' ان کے شاگرد اور ان کی لائق اولاد رہ گئی۔ ان کے پاس نہ فوج تھی' نہ خزانہ تھا' نہ اختیار تھا جو ایسٹ انڈیا کمپنی کے مقابلے میں جنگ کرتے۔ شاہ ولی اللہ کے فرزند اور جانشین شاہ عبدالعزیز نے فتویٰ دے دیا کہ ہندوستان دارالحرب ہے' جس کے معنی یہ تھے کہ یا مسلمان انگریزوں سے جنگ کریں یا ہجرت کر کے کہیں اور چلے جائیں۔

سید احمد شہید:

حضرت سید احمد شہید شاہ عبدالعزیز ہی کے شاگرد اور مرید تھے۔ ان کی رائے بھی یہی تھی' اور ہندوستان کے کتنے مسلمان ہوں گے جن کی رائے یہی ہو گی اور یہ دیکھ کر مسلمانوں کی حکومت پر انگریز مسلط ہیں' ان کی آنکھوں میں خون اتر رہا ہوگا' مگر ان میں اس کی استطاعت نہ تھی کہ جنگ کرتے۔ سید احمد شہید نے سنا کہ پنجاب میں اور پشاور کی وادی میں سکھ مسلمانوں پر مظالم کر رہے ہیں اور اسلام کی توہین کرتے ہیں۔ وہ امیر خان (والئی ٹونک) کی فوج میں عسکری تربیت حاصل کر چکے تھے۔ انہوں نے یہ رائے قائم کی کہ سکھوں کے مقابلے میں جنگ ہو سکتی ہے۔ غالباً ان کے ذہن میں یہ ہوگا کہ سندھ' بہاول پور اور بلوچستان کے آزاد حاکم اس نیک مقصد میں ان کے ساتھ تعاون کریں گے اور افغانستان اور صوبہ سرحد کے جنگجو اور بہادر لوگ ان کا ساتھ دیں گے۔ ان کی یہ توقع بے جا نہیں تھی۔ وہ 16 جنوری 1826ء کو جہاد کی نیت سے رائے بریلی سے نکلے۔ اس وقت ان کے ساتھ پانچ سو یا چھ سو مجاہد تھے۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کے انگریز حاکموں نے ان سے کوئی تعرض نہیں کیا' کیونکہ وہ اعلان کے ساتھ سکھوں کے خلاف جہاد کے لئے جا رہے تھے اور انگریزوں کو یہ پسند تھا کہ سید احمد شہید کے ہاتھ سے سکھوں کو ضرب لگے' تاکہ پنجاب پر قبضہ کرنا ان کے لئے آسان ہو جائے۔

سید احمد شہید نے بڑے طویل راستے سے سفر کیا اور وہ اس لئے کہ مسلمان ان کے مقاصد سے اچھی طرح آگاہ

ہو جائیں اور جن جن سرداروں سے ان کو مدد کی توقع تھی' ان سے بالمشافہ گفتگو کا موقع ملے۔ وہ رائے بریلی سے گوالیار گئے اور پھر ٹونک۔ امیر خان والی ٹونک ابھی زندہ تھے جن کی فوج میں ملازمت کے دوران سید احمد شہید نے سپہ گری کا تجربہ حاصل کیا تھا۔ امیر خان کو ان سے عقیدت تھی۔ اس موقع پر وہ سید صاحب سے بیعت بھی ہو گئے۔ یہاں سے سید صاحب سندھ' بلوچستان' قندھار' غزنی اور کابل ہوتے ہوئے' براہ درہ خیبر' پشاور پہنچے۔ سندھ' بہاولپور' بلوچستان اور قندھار کے فرماں رواؤں نے ان کا خیر مقدم کیا اور خاطر و مدارات کی' مگر جہاد میں ساتھ دینے کے لئے تیار نہ ہوئے۔ عوام نے ہر جگہ جوش کا اظہار کیا' روپیہ دیا اور مجاہدین میں شریک ہونے کے لئے ان میں سے آدمی بھی نکلے۔ افغان حکمرانوں اور سرداروں میں اور سرحد کے قبائل میں باہم بڑے مناقشات تھے۔ وہ ایک جھنڈے کے نیچے جمع ہونے کے لئے تیار نہیں ہوئے۔ جو فریق سید صاحب کے ساتھ ہوئے' ان کے مخالف سید صاحب اور تحریک جہاد کے بھی مخالف ہو گئے۔ ان سے اور مجاہدین سے واقعی لڑائیاں ہوئیں اور جو طاقت سکھوں کے مقابلے میں کام آتی' وہ مسلمانوں سے لڑنے میں ضائع ہوئی۔

اس کے علاوہ مجاہدین سے تدبیر کی غلطیاں بھی ہوئیں۔ انہوں نے جہاد' اصلاح عقائد اور اصلاح معاشرت کے کام ایک ساتھ شروع کر دیئے۔ عقائد اور اعمال کی خرابیاں افہام و تفہیم سے بتدریج رفع ہوتی ہیں۔ اس سے پٹھانوں میں ناراضگی پیدا ہوئی۔ جنگ سکھوں کے مقابلے میں تھی' جو طاقت میں انگریزوں کے برابر تو نہ تھے' مگر پھر بھی صاحب ملک و حکومت تھے۔ یورپین ان کی افواج کی تربیت کر رہے تھے' اس لئے وہ مرتب اور منظم تھیں۔ اس صورت میں مجاہدین کے لئے یہ بھی ضروری تھا کہ ان کا کوئی ملکی مرکز ہو' اس کے باشندے تابع فرمان اور ہم خیال ہوں' کافی روپیہ ہو' اس وقت کے معیار کے مطابق مجاہدین کی عسکری تربیت ہو۔ ان میں سے کوئی چیز مجاہدین کو حاصل نہ تھی' اس پر بھی وہ سکھوں سے لڑے اور ان کو انہوں نے شکستیں دیں۔ مجاہدین کو جو شکستیں ہوئیں' وہ اکثر اس وجہ سے کہ خود مسلمانوں نے ان سے غداری کی۔

پشاور کے سرداروں کی مسلسل مخالفت سے مجبور ہو کر' سید صاحب نے وہ علاقہ چھوڑ دیا اور کشمیر اور ہزارہ کو سکھوں سے آزاد کرانے کے لئے وہ راج داری میں منتقل ہوئے اور اس کے بعد بالاکوٹ کو انہوں نے اپنا مستقر بنایا۔ اس کے تین طرف اونچے پہاڑ ہیں' اس لئے ان سمتوں سے کسی حملے کا اندیشہ نہیں تھا۔ صرف دو راستے تھے جن کی حفاظت کرنی تھی۔ ایک راستے کی حفاظت کا انتظام اچھی طرح کیا گیا۔ دوسرے راستے میں جھاڑیاں اور درخت تھے' اس کی حفاظت کا انتظام پورا نہ تھا یا بالکل نہ تھا۔ مقامی باشندوں میں سے ان لوگوں نے جو سکھوں سے ملے ہوئے تھے' سکھوں کو اس کی خبر کر دی۔ سکھ جنرل شیر سنگھ نے بہت بڑی جمعیت سے حملہ کیا۔ مجاہدین بڑی بہادری سے لڑے۔ دست بدست جنگ کی نوبت آئی۔ تعداد کی زیادتی کی وجہ سے سکھ غالب آئے۔ 600 مجاہدین شہید ہوئے جن میں خود سید صاحب اور شاہ اسماعیل (شاہ ولی اللہ کے پوتے) بھی تھے۔ فتح اور غلبے کی توقع سے جو جہاد شروع کیا گیا تھا' بالاکوٹ کے اس حادثے کے ساتھ اس کا خاتمہ ہو گیا (1831) اور سکھوں نے اس پر جشن منایا۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ سید احمد شہید کا مطمح نظر یہی تھا کہ سکھوں کو شکست دے کر پنجاب پر قبضہ کریں اور پھر پنجاب کو مرکز بنا کر ہمسایہ مسلمان سرداروں اور حاکموں کے تعاون سے ہندوستان کو انگریزوں کے تسلط سے آزاد کرائیں۔ یہ نہیں ہو سکا' تاہم "تحریک جہاد" جاری رہی' یہاں تک کہ انگریزوں نے سکھوں سے پنجاب چھین لیا اور وہ مجاہدین کے اس لئے دشمن ہو گئے کہ وہ کسی وقت خطرناک بھی ثابت ہو سکتے تھے۔ لہٰذا انگریزوں نے مجاہدین کے استیصال کے لئے کوشش کی اور مجاہدین اور انگریزوں کے درمیان جنگیں بھی ہوئیں۔ ہندوستان میں مجاہدین کے جو معاون و مددگار تھے ان پر انگریزوں نے مظالم کئے۔

یہ تحریک بالکل عام مسلمانوں کے احساس اور ارادے سے پیدا ہوئی اور اس کی قیادت بھی ان ہی کے ہاتھ میں تھی جو عوام میں سے تھے۔ اس میں ناکامی اس وجہ سے ہوئی کہ مجاہدین کے پاس اتنا روپیہ کبھی نہیں ہوا جو ایک حکومت کے مقابلے میں اقدامی جنگ کے لئے درکار تھا' اور ان کے پاس اتنی فوج کبھی نہیں ہوئی جتنی سکھوں کے مقابلے کے لئے درکار تھی' اور ان کو کبھی ایسا محفوظ مستقر میسر نہیں آیا جہاں وہ اطمینان سے اپنی افواج کی تربیت کرتے' مگر یہ جہاد اس وقت کے ہندوستانی مسلمانوں کی بیداری اور آزادی کی خواہش کا بین ثبوت ہے۔ سید احمد شہید کی اپیل پر برصغیر کے ہر گوشے سے روپیہ گیا اور آدمی گئے اور اس دشواری کے باوجود کہ ہندوستان میں انگریزوں کی حکومت تھی اور پنجاب سکھوں کے قبضے میں تھا' اور جہاد میں شریک ہونے کے لئے جو مسلمان ہندوستان سے جاتے تھے' ان کو دو ہزار میل سفر کرنا پڑتا تھا' اور راستے میں ان کو ٹوکنے اور روکنے کے لئے بہت سے مخالف موجود تھے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی طرف سے واقعی یہ آزادی کی جنگ تھی۔

1857ء کی جنگ آزادی:

انگریزوں کے خلاف جنگ یا بغاوت کرنے کے لئے مسلمانوں کو صرف یہ ایک سبب کافی تھا کہ انگریزوں نے بدعہدی' سازش اور فریب سے ہندوستان پر قبضہ کیا اور ان کو حکومت' آزادی اور اختیار سے محروم کر دیا۔ اپنی گئی ہوئی آزادی اور خود مختاری واپس لینے کے لئے' اگر کوئی قوم ایسی قابض طاقت کے خلاف بغاوت کرے تو یہ قابل عذر و معذرت نہیں' بلکہ قابل فخر ہے۔ اس کے علاوہ مسلمانوں کو ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف یہ شکایات بھی تھیں کہ اس نے ان کو معاشی حیثیت سے تباہ کر دیا۔ تعلیم کی راہ میں ایسی رکاوٹیں پیدا کیں کہ اپنے مزاج اور پسند کے مطابق تعلیم حاصل کرنا ان کے لئے ناممکن ہو گیا اور مذہب کے معاملے میں اس نے مداخلتیں کیں اور یہ مسلمانوں کو سب سے زیادہ ناگوار تھا۔ اگر ذرائع اور وسائل مہیا ہوتے تو وہ انگریزوں سے جنگ ضرور کرتے' مگر وہ مہیا نہ تھے۔

ہندو اس وجہ سے ناراض تھے کہ ان کی ریاستوں پر قبضہ کرنے کے لئے ان ہندو والیان ملک کو جن کے اولاد نرینہ ہو' اس حق سے محروم کرنے کی پالیسی اختیار کی جو ان کو ازروئے ہندو مذہب حاصل تھا' کہ کسی کو متبنیٰ کر لیں اور ریاست کا وارث قرار دیں۔ 1848ء میں ڈلہوزی نے راجہ ستارا اور 1853ء میں راجہ ناگپور اور رانی جھانسی کے خلاف ایسٹ انڈیا کمپنی کے بورڈ آف ڈائریکٹرز کو یہ لکھا کہ ان کو متبنیٰ کرنے کی اجازت نہ دی جائے اور ان کی ریاستوں کا الحاق کیا جائے۔ اس پالیسی کے تحت' کمپنی ہندوؤں کی سات چھوٹی چھوٹی ریاستوں پر' اس سے پہلے قبضہ کر چکی تھی۔

فوج کو اپنی تنخواہوں اور شرائط ملازمت کے متعلق شکایات تھیں' جن میں سے ایک یہ بڑی اہم تھی کہ ان کو ہندوستان کے باہر خدمت کرنے پر مجبور کیا جا رہا تھا۔ ہندوؤں کو چھوت چھات اور کھانے پینے کی پابندیوں کی وجہ سے اس میں دشواریاں تھیں۔ ایک قانون پاس کیا گیا' جس میں ہندو بیواؤں کو دوسری شادی کرنے کا اختیار دے دیا گیا۔ باجی راؤ پیشوا' جو مرہٹوں میں بڑا باوقار فرماں رواں تھا' اس کو معزول کر کے انگریزی حکومت نے نظر بند کر دیا اور اس کے لئے ایک پنشن مقرر کر دی۔ اس کے مرنے کے بعد کمپنی نے اس کے متبنیٰ بیٹے نانا صاحب کو پنشن نہیں دی۔ وہ انتقامی جنگ کے لئے تیاریاں کر رہا تھا۔ دہلی کے شاہی خاندان کے متعلق انگریزوں کا منصوبہ یہ تھا کہ بہادر شاہ کے بعد اس کو قلعے سے نکال کر مہرولی منتقل کریں اور اس کے جانشین کو خطاب اور دربار و مراسم احترام شاہی سے محروم کر دیں۔ اس کا مسلمانوں کو بڑا صدمہ تھا۔

ذیل میں چند اقتباسات درج ہیں' جن سے ذرا تفصیل کے ساتھ یہ معلوم ہوگا کہ ہنگامہ 1857ء کے اسباب کیا تھے:

(1) ''بنگال میں 1757ء سے 1765ء تک انگریزوں کی کارروائیوں کی روداد بجا طور پر ہندوستان میں برطانوی تاریخ کا تاریک ترین صفحہ سمجھا گیا ہے۔ کمپنی کے کارندوں کو ایسے اختیارات حاصل تھے کہ وہ شہزادوں اور والیانِ ملک کو بنا اور بگاڑ سکتے تھے اور ان میں بہت سے اپنا یہ اختیار ذاتی نفع کے لئے استعمال کرتے تھے۔ نواب اور اس کی رعایا دونوں کو سوداگر اور ان کے کارندے اس لئے لوٹ رہے تھے کہ جلدی سے امیر ہو جائیں۔'' (آئی ای ڈبلیو ہاپسن۔ ہسٹری آف انڈیا)

(2) ایسٹ انڈیا کمپنی کی ابتدائی حکومت میں مذہبی گفتگو کم تھی' بعد میں بہت بڑھی۔ حکام پادریوں اور مشن کی مدد کرتے تھے۔ ان کے وعظ میں شرکت کے لئے سرکاری ملازمین پر تقاضا کرتے تھے اور مشنری کام کے لئے روپیہ مہیا کرتے تھے۔ تیرتھ گاہوں' منڈیوں اور اجتماعات میں پادری وعظ کہتے تھے اور دوسرے مذہب کے مقتداؤں کے لئے رنج دہ الفاظ استعمال کرتے تھے۔ مشنری سکول شہروں اور دیہات میں کثرت سے کھولے گئے اور انگریز حکام ترغیب دیتے تھے کہ لوگ اپنے بچوں کو ان میں بھیجیں۔ مذہبی کتابوں میں امتحان ہوتا تھا اور کم عمر بچوں سے اس قسم کے سوالات کئے جاتے تھے' تمہارا خدا کون ہے؟ تمہارا نجات دلانے والا کون ہے؟ اور بچے عیسائی مذہب کے موافق ان سوالات کا جواب دیتے تھے' اس پر ان کو انعام ملتا تھا۔'' (سرسید احمد خان' اسباب بغاوت ہند)

(3) ''سمجھ دار لوگ یہ سمجھتے تھے کہ ان مکتبوں میں چونکہ صرف اردو میں تعلیم ہوتی ہے' اس لئے بچے دین کو بھول جائیں گے اور اس کے بعد عیسائیت کی تعلیم قبول کرنا آسان ہو جائے گا..... مکتب عملاً قائم ہوئے اور تحکماً ان میں داخلہ کرایا جاتا تھا..... لڑکیوں کے مکتب قائم کرنے کا بڑا تقاضا تھا۔ وزیٹر اور انسپکٹر یہ سمجھتے تھے کہ جتنے لڑکیوں کے مدرسے زیادہ قائم کرائے جائیں گے' اتنی ہی ان کی نیک نامی ہو گی۔ اسی لئے وہ جائز اور ناجائز ذریعے اختیار کرتے تھے۔ ہندوستانی یہ سمجھتے تھے کہ اس کا مقصد یہ ہے کہ پردہ اٹھایا جائے۔'' (سرسید احمد خان' اسباب بغاوت ہند)

(4) ''شہروں میں بڑے کالج تھے۔ ابتدا میں لوگوں کو ان سے وحشت تھی' لیکن مسلمانوں کے طلب کرنے پر مولانا شاہ عبدالعزیز نے یہ فتویٰ دیا کہ انگریزی کالج میں جانا' پڑھنا اور انگریزی زبان سیکھنا از روئے مذہب درست ہے۔ اس پر سینکڑوں مسلمان کالجوں میں داخل ہوئے۔

اس وقت کالجوں کا حال ایسا نہ تھا' بلکہ ان میں تعلیم کا سررشتہ بہت اچھا تھا۔ ہر قسم کے علوم' فارسی' عربی' سنسکرت اور انگریزی پڑھائے جاتے تھے۔ فقہ' حدیث اور علم ادب پڑھانے کی اجازت تھی۔ فقہ میں امتحان ہوتا تھا۔ سندیں ملتی تھیں۔ کسی طرح کی مذہبی ترغیب نہ تھی۔ مدرس بہت ذی عزت اور معتبر اور مشہور اور ذی علم اور پرہیزگار مقرر ہوتے تھے' مگر آخر کو یہ بات نہ رہی (میکالے کی تجویز کے مطابق 1835ء کا قانون منظور ہونے کے بعد)۔ عربی کی قدر بہت کم ہوگئی۔ فقہ اور حدیث کی تعلیم یکسر جاتی رہی۔ فارسی بھی چنداں قابل لحاظ نہ رہی۔ تعلیم کی صورت اور کتابوں کے رواج نے مکمل تغیر پکڑا۔ انگریزی اور اردو کا رواج بہت زیادہ ہوا' جس کے سبب سے وہی شبہ کہ گورنمنٹ کو ہندوستان کے مذہبی علوم کا فنا کرنا منظور ہے' قائم ہوگیا۔ مدرس لوگ معتبر اور ذی علم نہ رہے۔ وہی مدرسے کے طالب علم' جنہوں نے ابھی تک لوگوں کی نظر میں اعتبار پیدا نہ کیا تھا' مدرس ہونے لگے۔

مدرسوں اور کالجوں کی تعلیم پر مذہب عیسوی کی ترویج کا شبہ ہوا۔ دوسری طرف حکومت کی طرف سے یہ اشتہار شائع ہوا کہ جو شخص مدرسے کا تعلیم یافتہ ہوگا اور فلاں فلاں علوم اور زبان انگریزی میں امتحان دے کر سند یافتہ ہوگا' وہ نوکری میں سب سے مقدم سمجھا جائے گا۔ اب نوکری انہی کے سرٹیفکیٹ پر منحصر ہوگئی جن کو ہندوستانی کالا پادری کہتے تھے اور یہ اعتقاد قائم ہوا کہ ہندوستان کو مفلس کرنا مقصود ہے تاکہ لاچار ہو کر عیسائی مذہب قبول کریں۔'' (سرسید احمد خان' اسباب بغاوت ہند)

(5) 1855ء میں دفعتاً پادری اے ایڈمنڈ نے ایک چٹھی جاری کی جو عموماً سرکاری نوکروں کے پاس آئی۔ اب تمام ہندوستان میں ایک عمل داری ہوگی۔ تار برقی سے سب جگہ خبر ایک ہوگئی۔ ریلوے کی سڑک سے سب جگہ کی آمد و رفت ایک ہوگئی۔ مذہب بھی ایک چاہئے۔ اس لئے مناسب ہے کہ تم لوگ بھی عیسائی ایک مذہب ہو جاؤ۔'' (سرسید احمد خان' اسباب بغاوت ہند)

(6) ''ہندوؤں کو اپنے مذہب میں مداخلت سے اس لئے زیادہ غم و غصہ نہیں ہوا کہ وہ اپنے مذہب سے واقف نہ تھے۔ صرف بعض رواجوں کے پابند ہیں' لیکن مسلمانوں کو بہت غصہ آیا اور بڑا رنج ہوا' اس لئے کہ وہ اپنے مذہب اور اس کے احکام اور ان کی خلاف ورزی کے نتائج سے واقف ہیں۔ بلاشبہ جتنی گورنمنٹ کی مداخلت مذہب میں خلاف قواعد ملک داری ہے' ویسا ہی کسی مذہب کی تعلیم کو روکنا علی الخصوص اس مذہب کی' جس کو وہ حق سمجھتے ہیں' برخلاف اور بے جا ہے۔'' (سرسید احمد خان' اسباب بغاوت ہند)

سلطنت مغلیہ: ایک نظر میں

1۔ ظہیرالدین بابر	(1526-1530ء)
2۔ نصیرالدین ہمایوں	(1530-1556ء)
3۔ جلال الدین اکبر	(1556-1605ء)
4۔ نورالدین جہانگیر	(1605-1627ء)
5۔ خرم شاہجہاں	(1627-1658ء)
6۔ اورنگ زیب عالمگیر	(1658-1707ء)
7۔ بہادر شاہ اول	(1707-1712ء)
8۔ جہاں دار شاہ	(1712-1713ء)
9۔ فرخ سیر	(1713-1719ء)
10۔ رفیع الدرجات	(1719ء)
11۔ رفیع الدولہ	(1719ء)
12۔ محمد شاہ (رنگیلا)	(1719-1748ء)
نادر شاہ درانی کا حملہ	(1739ء)
احمد شاہ ابدالی کے حملے	(1748-1767ء)
13۔ احمد شاہ	(1748-1754ء)
14۔ عالمگیر ثانی	(1754-1759ء)
15۔ شاہ عالم ثانی	(1759-1806ء)
16۔ اکبر ثانی	(1806-1837ء)
17۔ بہادر شاہ ثانی	(1837-1857ء)

(7) ایکٹ 21 مجریہ 1850ء۔ مذہب میں مداخلت ہندوؤں میں اس وقت تبلیغ ہی نہ تھی' اس لئے ان پر اس قانون کا کوئی اثر نہ تھا' لیکن غیر مذہب کا کوئی آدمی اگر مسلمان ہو جائے تو اس کو اپنے مذہب کی رو سے' جو اس نے اختیار کیا ہے' اپنے مورثوں کا متروکہ جو غیر مذہب میں تھے' لینا منع ہے۔ پس کوئی نو مسلم بھی اس ایکٹ سے فائدہ نہیں اٹھا سکتا تھا۔ البتہ جس نے عیسائی مذہب قبول کیا ہے' اس کے لئے ایکٹ فائدہ مند ہو سکتا تھا۔ اس سبب سے لوگ خیال کرتے تھے کہ علاوہ مداخلت مذہبی کے اس ایکٹ سے صاف ترغیب مذہبی ہے۔'' (سرسید احمد خان' اسباب بغاوت ہند)

(8) قانون 2 مجریہ 1819ء کے تحت صدہا سال سے جو معافیات چلی آ رہی تھیں' وہ ادنیٰ ادنیٰ حیلوں پر ضبط ہو گئیں۔ اس سے مصیبت اور تنگی معاش پیدا ہوئی۔ مسلمانوں کو اس سے زیادہ نقصان پہنچا۔ باغیوں نے اپنے اشتہارات میں دو ہی شکایات لکھیں۔ ضبطی معافیات اور مداخلت مذہبی۔'' (سرسید احمد خان' اسباب بغاوت ہند)

(9) ''سابقہ ہندوستانی حکومتوں میں بہ علت باقی یا بہ علت قرضہ جبراً اور تحکماً نیلام حقیت کا کبھی تصور نہ تھا' صرف بہ رضا و رغبت خانگی بیع اور رہن اور ہبہ کا دستور تھا۔ بعوض قرضہ نیلام حقیت کے رواج نے بہت فساد برپا کیا۔ مہاجنوں اور روپے والوں نے دم دے کر زمینداروں کو روپے دیئے اور قصداً ان کی زمین داری چھیننے کے لئے بہت فریب برپا کئے اور دیوانی میں ہر قسم کے جھوٹے سچے مقدمات لگائے اور قدیم زمینداروں کو تبدیل کیا اور خود مالک بن گئے۔ ان آفات نے تمام ملک کے زمینداروں کو ہلا ڈالا۔'' (اسباب بغاوت ہند)

(10) ''زمین کا مال گزاری میں مستغرق سمجھنا بہت قابل مباحثے کے ہے۔ درحقیقت دعویٰ سرکار کا پیداوار پر ہے نہ کہ زمین پر'' (اسباب بغاوت ہند)

(11) ''اچھی بری زمین میں فرق نہ کیا گیا اور سب سے بڑے نرخ پر مال گزاری وصول کی گئی۔ (اسباب بغاوت ہند)

(12) ''قانون 10 مجریہ 1829ء کی رو سے ہندوستان کی بڑھتی ہوئی مفلسی میں اسٹامپ کا رواج اور پھر اس کی قیمت میں اضافہ''

(13) نوکری پیشہ زیادہ تر مسلمان تھے۔ نوکریاں جانے سے ان میں افلاس پھیلا۔ سرکاری فوج تلنگوں سے مرکب تھی۔ اس میں اشراف نوکری کرنا اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ سواروں میں نوکری کرتے تھے مگر سوار حکومت انگریزی میں بہت کم ہوتے تھے۔ پہلے کے مقابلے میں کوئی نسبت نہ تھی۔ علاوہ سرکاری نوکری کے مسلمان سرداروں اور امیروں کی نوکری بھی کرتے تھے اور اس ملازمت میں کثیر تعداد کی کھپت تھی۔ انگریزی گورنمنٹ میں ملازمت کی یہ قسم ختم ہوگئی۔ افلاس کی وجہ سے لوگوں نے ایک آنہ اور ڈیڑھ آنہ روز پر اور بہت سوں نے سیر ڈیڑھ سیر اناج پر باغیوں کی نوکری کی۔''

انگریزوں نے فوج میں نئے کارتوس رائج کئے جن پر خوب موٹی چربی تھی۔ دانت سے کاٹ کر یہ بندوق میں لگائے جاتے تھے۔ شہرت ہوئی کہ یہ گائے کی چربی ہے۔ اس سے ہندو بیزار ہوئے' اور یہ شہرت ہوئی کہ سؤر کی چربی ہے' اس سے مسلمانوں کو نفرت ہوئی۔ 1857ء کا آغاز تھا کہ بارک پور میں' جو کلکتہ سے صرف 16 میل تھا' شورش ہوئی' مگر وہ انگریزوں نے سختی سے دبا دی۔ دوسرے مقامات پر حکم عدولی اور سرکشی کے واقعات ہوئے۔ انگریز افسروں نے سپاہیوں کو مطمئن کرنے کی کوشش نہیں کی۔ 10 مئی کو یکایک میرٹھ کی چھاؤنی میں سپاہیوں نے ہنگامہ شروع کیا۔ انہوں نے انگریز افسروں کو قتل کیا' ان کے بنگلوں میں آگ لگائی اور وہ دہلی کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے بہادر شاہ کو بادشاہ کی حیثیت سے اپنی سرپرستی پر مجبور کیا اور وہ پیرانہ عوام کی پکار پر محل سے نکل آیا' ورنہ جنگ اس کے اور مسلمانوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

دہلی' کانپور' لکھنؤ اور ان کے اطراف شورش و جنگ کے خاص مرکز تھے۔ ہندوستانیوں کی طرف سے یہ جنگ بلا تیاری' بلا تنظیم اور بلا ساز و سامان شروع ہوئی' ورنہ ہندوستان میں انگریزی فوج اتنی کم تھی اور ہندوستانی فوج اتنی زیادہ کہ اگر ہوش و تدبیر سے اہتمام کیا جاتا تو انگریزوں کو نکالنا دشوار نہ تھا۔ بعض علماء اور بعض مسلمان سردار اس جنگ میں شریک ہوئے' مگر اس طرح کہ نہ ان کو اپنی طاقت کا اندازہ تھا اور نہ دشمن کی۔ ایک ہنگامے کے طور پر یہ جنگ شروع ہوئی اور ہنگامے ہی کے طور پر فرو ہوگئی۔

مسلمان چونکہ ہندوستان کے سابق حکمران تھے اور صلیبی جنگوں کے زمانے سے یورپین ان کو اپنا دشمن سمجھتے تھے' اس لئے ان کے سات سو برس کے اثرات حکومت زائل کرنے کے لئے انگریزوں نے' غدر کی تمام ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کردی اور اس کے انتقام میں ان کو خوب تباہ کیا۔

16

مسلمان حکمرانوں کی ہندو نوازی

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے بھی آریوں کی طرح زرخیز زمین کی تلاش اور خوشگوار آب و ہوا کی جستجو میں برصغیر کا رُخ اختیار کیا۔ اِن کا مقصد اس ملک پر قبضہ کر کے اپنی سلطنت قائم کرنا اور یہاں کے لوگوں کو تلوار اور طاقت کے زور سے دائرۂ اسلام میں داخل کرنا تھا۔ بعض متعصب مورخوں نے اسلامی عہد کے ہندوستان کی جو تصویر کھینچی ہے' اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان یہاں اس طور سے حکومت کرتے تھے کہ غیر مسلموں کی زندگی اجیرن ہوگئی تھی۔ اُن کا کام مسلمانوں کی غلامی کے سوا اور کچھ نہ تھا' لیکن اِن خیالات کا اصل حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی تہہ میں ہندوؤں کا منظم پروپیگنڈا کارفرما ہے۔ تاریخ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں فاتح کی حیثیت سے شاید کبھی داخل نہ ہوتے' اگر یہاں کے بعض سرکش اور متعصب راجہ اُن سے چھیڑ چھاڑ نہ کرتے۔ چنانچہ تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ سندھ پر مسلمانوں کے حملے کی وجہ اُن مسلمان عورتوں اور بچوں کی قزاقوں کے ہاتھوں گرفتاری تھی جو سری لنکا سے عرب جا رہے تھے۔ جب سندھ کے راجہ داہر سے اُن عورتوں اور بچوں کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا اور قزاقوں کو سزا دینے کے لئے کہا گیا تو راجہ نے اس مطالبے کو درخور اعتنا نہ سمجھا اور کوئی قدم نہ اٹھایا۔ یہ مسلمان قیدی فتح سندھ کے بعد داہر ہی کی سلطنت سے برآمد کئے گئے۔

اسی طرح شمال مغرب کے درّوں سے آنے والا پہلا مسلمان فاتح امیر سبکتگین اس سرزمین پر فاتح کی حیثیت سے قدم نہ رکھتا' اگر اُس کا پڑوسی' پنجاب کا راجا جے پال سبکتگین کی حدودِ سلطنت پر یکے بعد دیگرے چھ حملے کر کے اُسے دعوتِ پیکار نہ دیتا۔ پس اس قسم کے انگیخت کرنے والے واقعات پاک و ہند میں اسلامی سلطنت کے قیام کا باعث بنے۔ مسلمانوں نے سندھ کی فتح (711ء) سے لے کر پلاسی کی جنگ (1757ء) تک اس ملک پر کم و بیش ایک ہزار سال حکومت کی۔ اس کتاب کا کوئی صفحہ گم ہوا ہے نہ اس میں کسی قسم کی تحریف و ترمیم کی گنجائش ہے۔ جیسی بھی ہے' ہندو مسلم' دوست دشمن سب کے سامنے عیاں ہے۔ مسلمان حکمران عرب' افغانستان' ایران اور ترکستان سے آئے اور برعظیم کے مختلف علاقوں میں اسلام کا پرچم لہرایا' مگر وہ واپس اپنے وطن کو نہیں گئے' بلکہ اسی ملک کو اپنا وطن بنا لیا' اور ایسا بنایا کہ اپنے وطن اصلی کو بالکل بھول گئے۔ انہوں نے اس ملک پر غیر ملکی باشندوں کی حیثیت سے حکومت نہیں کی بلکہ اس ملک کے باشندوں کی حیثیت سے یہاں کا نظامِ حکومت چلایا اور یہاں کے لوگوں کے اختلافِ مذہب و تمدن کے باوجود انہیں اپنا ماتحت اور محکوم نہیں بنایا بلکہ شریکِ کار بنایا۔ انہیں بڑے بڑے عہدے دیئے گئے۔ نہایت اہم جنگی مہمات اُن کے سپرد کی گئیں۔ انہیں خطابات' انعامات اور جاگیروں سے نوازا۔ ذیل میں اس اجمال کی تفصیل بیان کی جاتی ہے:

محمد بن قاسم کا غیر مسلموں سے سلوک:

محمد بن قاسم نے اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ نہایت منصفانہ سلوک کیا' لیکن اُس کا یہ سلوک صرف عدل و

(9) "سابقہ ہندوستانی حکومتوں میں یہ علت باقی یا یہ علت قرضہ جبراً اور حکماً نیلام حقیت کا کبھی تصور نہ تھا' صرف بہ رضا و رغبت خانگی بیع اور رہن اور ہبہ کا دستور تھا۔ بعوض قرضہ نیلام حقیت کے رواج نے بہت فساد برپا کیا۔ مہاجنوں اور روپے والوں نے دم دے کر زمینداروں کو روپے دیئے اور قصداً ان کی زمین داری چھیننے کے لئے بہت فریب برپا کئے اور دیوانی میں ہر قسم کے جھوٹے سچے مقدمات لگائے اور قدیم زمینداروں کو تبدیل کیا اور خود مالک بن گئے۔ ان آفات نے تمام ملک کے زمینداروں کو ہلا ڈالا۔" (اسباب بغاوت ہند)

(10) "زمین کا مال گزاری میں مستغرق سمجھنا بہت قابل مباحثہ کے ہے۔ درحقیقت دعویٰ سرکار کا پیداوار پر ہے نہ کہ زمین پر" (اسباب بغاوت ہند)

(11) "اچھی بری زمین میں فرق نہ کیا گیا اور سب سے بڑے نرخ پر مال گزاری وصول کی گئی۔ (اسباب بغاوت ہند)

(12) "قانون 10 مجریہ 1829ء کی رو سے ہندوستان کی بڑھتی ہوئی مفلسی میں اسٹامپ کا رواج اور پھر اس کی قیمت میں اضافہ"

(13) نوکری پیشہ زیادہ تر مسلمان تھے۔ نوکریاں جانے سے ان میں افلاس پھیلا۔ سرکاری فوج تلنگوں سے مرکب تھی۔ اس میں اشراف نوکری کرنا اپنی ہتک سمجھتے تھے۔ سواروں میں نوکری کرتے تھے مگر سوار حکومت انگریزی میں بہت کم ہوتے تھے۔ پہلے کے مقابلے میں کوئی نسبت نہ تھی۔ علاوہ سرکاری نوکری کے مسلمان سرداروں اور امیروں کی نوکری بھی کرتے تھے اور اس ملازمت میں کثیر تعداد کی کھپت تھی۔ انگریزی گورنمنٹ میں ملازمت کی یہ قسم ختم ہوگئی۔ افلاس کی وجہ سے لوگوں نے ایک آنہ اور ڈیڑھ آنہ روز پر اور بہت سوں نے سیر ڈیڑھ سیر اناج پر باغیوں کی نوکری کی۔"

انگریزوں نے فوج میں نئے کارتوس رائج کئے جن پر خوب موٹی چربی تھی۔ دانت سے کاٹ کر یہ بندوق میں لگائے جاتے تھے۔ شہرت ہوئی کہ یہ گائے کی چربی ہے۔ اس سے ہندو بیزار ہوئے' اور یہ شہرت ہوئی کہ سؤر کی چربی ہے' اس سے مسلمانوں کو نفرت ہوئی۔ 1857ء کا آغاز تھا کہ بارک پور میں' جو کلکتہ سے صرف 16 میل تھا' شورش ہوئی' مگر وہ انگریزوں نے سختی سے دبا دی۔ دوسرے مقامات پر حکم عدولی اور سرکشی کے واقعات ہوئے۔ انگریز افسروں نے سپاہیوں کو مطمئن کرنے کی کوشش نہیں کی۔ 10 مئی کو یکا یک میرٹھ کی چھاؤنی میں سپاہیوں نے ہنگامہ شروع کیا۔ انہوں نے انگریز افسروں کو قتل کیا' ان کے بنگلوں میں آگ لگائی اور وہ دہلی کی طرف چل پڑے۔ انہوں نے بہادر شاہ کو بادشاہ کی حیثیت سے اپنی سرپرستی پر مجبور کیا اور وہ پیرفانی عوام کی پکار پر محل سے نکل آیا' ورنہ جنگ اس کے اور مسلمانوں کے وہم و گمان میں بھی نہ تھی۔

دہلی' کانپور' لکھنؤ اور ان کے اطراف شورش و جنگ کے خاص مرکز تھے۔ ہندوستانیوں کی طرف سے یہ جنگ بلا تیاری' بلا تنظیم اور بلا ساز و سامان شروع ہوئی' ورنہ ہندوستان میں انگریزی فوج اتنی کم تھی اور ہندوستانی فوج اتنی زیادہ کہ اگر ہوش و تدبیر سے اہتمام کیا جاتا تو انگریزوں کو نکالنا دشوار نہ تھا۔ بعض علماء اور بعض مسلمان سردار اس جنگ میں شریک ہوئے مگر اس طرح کہ نہ ان کو اپنی طاقت کا اندازہ تھا اور نہ دشمن کی۔ ایک ہنگامے کے طور پر یہ جنگ شروع ہوئی اور ہنگامے ہی کے طور پر فرو ہوگئی۔

مسلمان چونکہ ہندوستان کے سابق حکمران تھے اور صلیبی جنگوں کے زمانے سے یورپین ان کو اپنا دشمن سمجھتے تھے' اس لئے ان کے سات سو برس کے اثرات حکومت زائل کرنے کے لئے انگریزوں نے غدر کی تمام ذمہ داری مسلمانوں پر عائد کر دی اور اس کے انتقام میں ان کو خوب تباہ کیا۔

16

مسلمان حکمرانوں کی ہندو نوازی

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں نے بھی آریوں کی طرح زرخیز زمین کی تلاش اور خوشگوار آب و ہوا کی جستجو میں برصغیر کا رخ اختیار کیا۔ ان کا مقصد اس ملک پر قبضہ کر کے اپنی سلطنت قائم کرنا اور یہاں کے لوگوں کو تلوار اور طاقت کے زور سے دائرۂ اسلام میں داخل کرنا تھا۔ بعض متعصب مورخوں نے اسلامی عہد کے ہندوستان کی جو تصویر کھینچی ہے' اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ مسلمان یہاں اس طور سے حکومت کرتے تھے کہ غیر مسلموں کی زندگی اجیرن ہوگئی تھی۔ اُن کا کام مسلمانوں کی غلامی کے سوا اور کچھ نہ تھا' لیکن ان خیالات کا اصل حقائق سے کوئی تعلق نہیں۔ ان کی تہہ میں ہندوؤں کا منظم پروپیگنڈا کارفرما ہے۔ تاریخ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ مسلمان اس ملک میں فاتح کی حیثیت سے شاید کبھی داخل نہ ہوتے' اگر یہاں کے بعض سرکش اور متعصب راجہ اُن سے چھیڑ چھاڑ نہ کرتے۔ چنانچہ تاریخ کا ادنیٰ طالب علم بھی جانتا ہے کہ سندھ پر مسلمانوں کے حملے کی وجہ اُن مسلمان عورتوں اور بچوں کی قزاقوں کے ہاتھوں گرفتاری تھی جو سری لنکا سے عرب جا رہے تھے۔ جب سندھ کے راجہ داہر سے اُن عورتوں اور بچوں کی واپسی کا مطالبہ کیا گیا اور قزاقوں کو سزا دینے کے لئے کہا گیا تو راجہ نے اس مطالبے کو درخوراعتنا نہ سمجھا اور کوئی قدم نہ اٹھایا۔ یہ مسلمان قیدی فتح سندھ کے بعد داہر ہی کی سلطنت سے برآمد کئے گئے۔

اسی طرح شمال مغرب کے دروں سے آنے والا پہلا مسلمان فاتح امیر سبکتگین اس سرزمین پر فاتح کی حیثیت سے قدم نہ رکھتا' اگر اُس کا پڑوسی پنجاب کا راجا جے پال سبکتگین کی حدود سلطنت پر یکے بعد دیگرے حملے کر کے اُسے دعوتِ پیکار نہ دیتا۔ پس اس قسم کے انگیخت کرنے والے واقعات پاک و ہند میں اسلامی سلطنت کے قیام کا باعث بنے۔ مسلمانوں نے سندھ کی فتح (711ء) سے لے کر پلاسی کی جنگ (1757ء) تک اس ملک پر کم و بیش ایک ہزار سال حکومت کی۔ اس کتاب کا کوئی صفحہ گم ہوا ہے نہ اس میں کسی قسم کی تحریف و ترمیم کی گنجائش ہے۔ جیسی بھی ہے' ہندو مُسلم' دوست دشمن سب کے سامنے عیاں ہے۔ مسلمان حکمران عرب' افغانستان' ایران اور ترکستان سے آئے اور برعظیم کے مختلف علاقوں میں اسلام کا پرچم لہرایا' مگر وہ واپس اپنے وطن کو نہیں گئے' بلکہ اسی ملک کو اپنا وطن بنا لیا' اور ایسا بنایا کہ اپنے وطن اصلی کو بالکل بھول گئے۔ انہوں نے اس ملک پر غیر ملکی باشندوں کی حیثیت سے حکومت نہیں کی بلکہ اس ملک کے باشندوں کی حیثیت سے یہاں کا نظام حکومت چلایا اور یہاں کے لوگوں کے اختلاف مذہب و تمدن کے باوجود انہیں اپنا ماتحت اور محکوم نہیں بنایا بلکہ شریکِ کار بنایا۔ انہیں بڑے بڑے عہدے دیئے گئے۔ نہایت اہم جنگی مہمات اُن کے سپرد کی گئیں۔ انہیں خطابات' انعامات اور جاگیروں سے نوازا۔ ذیل میں اس اجمال کی تفصیل بیان کی جاتی ہے:

محمد بن قاسم کا غیر مسلموں سے سلوک:

محمد بن قاسم نے اپنی غیر مسلم رعایا کے ساتھ نہایت منصفانہ سلوک کیا' لیکن اُس کا یہ سلوک صرف عدل و

انصاف کے تقاضے پورے کرنے تک محدود نہیں رہا' بلکہ اُس نے سندھ کے غیر مسلموں کو اُمورِ مملکت میں بھی شریک کیا۔ چنانچہ اُس نے راجہ داہر کے وزیر سی ساکر کو اپنی حکومت میں وزارت کا عہدہ دیا۔ ایک اور ہندو سردار نوبہ بن ہارن کو دبلیلہ کی قلعہ داری پر فائز کیا۔ راجہ داہر کے خاندان کے ایک قابل شخص کسکا کو وزیر مال مقرر کیا اور اُسے "مبارک شیر" کا خطاب دیا۔ برہمن آباد فتح کرنے کے بعد اس شہر کے مالی انتظامات کے لئے چار معزز ہندوؤں پر مشتمل ایک کمیٹی بنائی جسے دیوانی عدالت کے اختیارات تفویض کئے۔ چار برہمن سرداروں کو قلعے کی حفاظت پر مامور کیا اور ان میں سے ہر ایک کو ایک ایک لشکر مرتب کرنے کا حکم دیا جو غیر مسلموں پر مشتمل تھا۔ سندھ کے اس وقت کے مشہور شہر اروڑ کا حاکم ایک ہندو نوبہ بن داس کو مقرر کیا۔ علاقہ نیرون کی حکومت ایک سندھی غیر مسلم بھدر کن کو عطا کی۔ محمد بن قاسم اور اُس کے جانشینوں نے مندروں کی سرپرستی بھی کی اور اُن کے انتظامات کے لئے مناسب مالی امداد فراہم کی۔ برہمن آباد کے بڑے مندر کے اخراجات کا سرکاری طور پر انتظام کیا گیا۔ اس مندر سے وابستہ برہمنوں کے وظیفے بھی مقرر کئے گئے۔ مال گزاری کی رقم سے تین فی صد حصہ برہمنوں کے لئے مخصوص کیا گیا۔

سلاطین غزنی کا غیر مسلموں سے سلوک:

اس عہد میں اسلام کی دعوت و تبلیغ کا کام اِن سلاطین نے نہیں' بلکہ صوفیہ نے انجام دیا۔ یہ درست ہے کہ اِن سلاطین برعظیم کے دور دراز علاقوں تک پیش قدمی کی' لیکن پنجاب کے سوا ان سلاطین نے کسی علاقے میں بھی اپنی حکومت قائم نہیں کی۔ اپنے مختصر عہد حکومت میں سلاطین نے پنجاب کے غیر مسلم سرداروں کے ساتھ نہایت رواداری اور عالی ظرفی کا سلوک کیا۔ انہیں اپنا معتمد و مشیر بنایا اور فوجی خدمات پر مامور کیا۔ اس حقیقت کا اعتراف ہندو مورخین نے بھی کیا ہے۔ چنانچہ بمبئی یونیورسٹی کے فیلو اور مشہور مورخ مسٹری ویدیہ محمود غزنوی کے نامور فرزند سلطان مسعود کے عہد کا ایک واقعہ درج کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"جب احمد نیالتگین ہندوستان کا سپہ سالار مقرر ہوا تو اُس کو خلعت دی گئی۔ پھر زبانی حکم سنایا گیا اور ایک سند دی گئی۔

اس سے حلف اٹھوایا گیا اور پھر اُس نے ایک تحریری معاہدے پر دستخط کئے' جس میں یہ لکھا تھا کہ وہ وفادار بن کر اپنے فرائض انجام دیتا رہے گا اور جب یہ معاہدہ سلطان نے دیکھ لیا تو پھر اس کو بحفاظت تمام رکھ دیا گیا۔ احمد نے ہندوستان میں بنارس تک یلغار کی' جہاں تک محمود بھی نہیں پہنچ سکا تھا۔ اس کامیابی نے احمد کے دماغ میں فتور پیدا کر دیا اور اس نے ایک آزاد سلطنت قائم کرنے کا ارادہ کیا' لیکن قاضی نے اِس کی اطلاع مسعود غزنوی کو دی تو اُس نے ایک ہندو فوجی سردار کو اُس کی گرفتاری پر مامور کیا اور بالآخر احمد پسپا ہوا اور ہندو جاٹوں کے ہاتھوں مارا گیا۔"

اس واقعہ سے مورخ یہ نتیجہ نکالتا ہے کہ "ہندو جاٹ غزنی کے مسلم حکمرانوں میں ذمہ دار عہدوں پر فائز تھے۔"

ترکوں کے عہد میں ہندو نوازی:

سلاطین غزنی کے بعد سلطان شہاب الدین غوری کے جانشین "خاندانِ غلاماں" کے نام سے مشہور ہوئے۔ پھر خلجی اور تغلق خاندانوں کا دورِ حکومت آیا اور یہ سب ترک تھے۔ اِن مسلم حکومتوں میں بھی ہندو اُمراء' سرداروں اور عالموں کی بڑی قدر و منزلت کی گئی اور اُن کو ذمہ دار عہدوں پر فائز کیا گیا۔ سید صباح الدین عبدالرحمٰن نے اپنی تصنیف "ہندوستان کے عہدِ وسطیٰ کی ایک جھلک" میں ہندو مورخ ڈاکٹر تارا چند کا ایک بیان نقل کیا ہے' جو خاندان غلاماں کے عہد سے متعلق ہے۔ ڈاکٹر تارا چند لکھتے ہیں:

"جب مسلمانوں کی حکومت ہندوستان میں قائم ہوئی تو انہوں نے ہندوؤں کو مختلف عہدوں پر مقرر کرنا ضروری سمجھا۔ محمود غزنوی کی فوج میں بھی بکثرت ہندو سپاہی تھے جو اُس کی حمایت میں وسط ایشیا تک جا کر لڑے اور اُس کے ایک ہندو فوجی کمانڈر تلک نے اُس کے ایک مسلمان فوجی عہدے دار کی بغاوت کو فرو کی۔ اور جب قطب الدین ایبک نے ہندوستان میں اقامت اختیار کر کے حکومت کرنے کا فیصلہ کیا تو اس نے ملکی انتظام کو چلانے کے لئے ہندوؤں کو ہی مقرر کیا۔ ہندوؤں ہی نے اُن کے لئے عمارتیں بنائیں' ہندو سُناروں ہی نے اُن کے لئے سکّے ڈھالے' اور ہندو محاسبوں ہی نے اُن کے حساب کتاب درست کئے۔ پنڈتوں نے ہندو قوانین پر عمل درآمد کرانے میں اِن سلاطین کو مشورے دیئے اور برہمن نجومیوں کی رائے سے حکومت اور دربار کے مختلف کام انجام پاتے تھے۔"

غیاث الدین بلبن' علاء الدین خلجی' محمد تغلق اور فیروز تغلق نے بھی اپنے اپنے عہد میں ہندو امراء و علماء کی سرپرستی اور حوصلہ افزائی کی۔ چنانچہ ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی نے اپنی تصنیف: "سلاطینِ دہلی کا نظمِ حکومت" میں لکھا ہے: "بلبن ہندو سرداروں کو بڑا اعزاز بخشا کرتا تھا۔ ہندو سرداروں کا اقتدار علاء الدین خلجی کے عہد میں اتنا بڑھ گیا کہ اُسے کم کرنا پڑا۔ علاء الدین کے بعد ہندو سرداروں کی حیثیت اور بھی نمایاں ہوتی گئی۔ محمد بن تغلق کے عہد میں وہ اور بھی زیادہ طاقتور ہو گئے۔ وہ نہ صرف صوبوں کے گورنر اور محکمۂ مال کے اعلیٰ عہدے دار مقرر کئے جانے لگے' بلکہ اُن کے اثرات اتنے بڑھ گئے تھے کہ مسلم مورخین ان کا ذکر رشک و حسد سے کرنے لگے تھے۔ فیروز شاہ تغلق کے محبوب ہم جلیسوں میں ہندو سردار بھی شامل تھے اور اس کے بعد جب حکومت میں انتشار پھیلا تو ہندو راجاؤں نے سیاسی ریشہ دوانیوں میں بھی حصہ لیا اور پھر مشرق ہند میں اُن کی قوت اتنی بڑھ گئی تھی کہ یہ بات مشکوک نظر آنے لگی تھی کہ مسلمانوں کی حکومت پھر اس علاقے میں قائم ہو سکے گی یا نہیں"۔

ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی اپنی اس کتاب میں "فتاویٰ جہانداری" کے حوالے سے لکھتے ہیں: "محمد تغلق کے عہد میں خراجیوں اور ذمیوں (غیر مسلموں) نے بڑی حیثیت حاصل کی ہے۔ اُن کو بڑا اعزاز و امتیاز دیا جاتا ہے۔ اُن کو نقارے اور علم دیئے جاتے ہیں جن میں موتی جواہرات لٹکے ہوتے ہیں۔ کمخواب کا خلعت اور مرصع زین کسے ہوئے گھوڑے پیش کئے جاتے ہیں اور اُن کو صوبوں کا حاکم اعلیٰ اور دوسرے ممتاز عہدوں پر فائز کیا جاتا ہے۔ ہندو دارالحکومت میں بھی بڑے بڑے مقامات اور حویلیوں محلات کی طرح بناتے ہیں۔ وہ کمخواب کے لباس پہنتے ہیں۔ عربی گھوڑوں کی سواری کرتے ہیں جن پر سونے اور چاندی کا ساز ہوتا ہے اور اُن کی عظمت طرح طرح سے ظاہر ہوتی ہے اور وہ عیش و تنعم کی زندگی گزارتے ہیں۔ ان کے ہاں مسلمان بھی نوکر ہیں جو اُن کی سواری کے آگے دوڑتے ہوئے چلتے ہیں۔"

ایک ہندو مورخ پروفیسر کے ایم پانیکار تاریخ کے پروفیسر ہیں اور مصر میں بھارت کے سفیر رہ چکے ہیں۔ وہ ترک سلاطین کی ہندو نوازی پر انہیں خراجِ تحسین ادا کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

"اگر تحقیق اور حقیقت کی نظر سے دیکھا جائے تو یہ کہنا انتہائی غلط ہو گا کہ مسلمان حکمران ہندو تہذیب کو تحقیر کی نظر سے دیکھتے تھے۔ علاء الدین خلجی اور فیروز تغلق متعصب حکمران سمجھے جاتے ہیں' لیکن اِن دونوں نے بھی ہندو پیشواؤں کی بڑی عزت و توقیر کی۔ علاء الدین نے اچاریہ مہاسین کو ناٹک سے اپنے دربار میں مدعو کیا۔ اُس سے مذہبی مناظرے کئے اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ فرقہ ریکھر جین کے پیشوا پورنا چند' جو دہلی میں رہتے تھے' اور سوئمبر یوگی رام چندی کی پذیرائی سلطان علاء الدین خلجی کے یہاں زیادہ تھی۔ غیاث الدین تغلق کے عمال میں دو جین تھے جن کا اثر سلطنت پر بہت تھا۔ فیروز تغلق رتن سیکھر شاعر کا بڑا احترام کرتا تھا۔"

مغل بادشاہوں کی ہندو نوازی

مغل بادشاہوں نے برعظیم پر کم و بیش تین سو سال

حکومت کی۔ تاریخ اس امر کی شاہد ہے کہ مغل بادشاہ مذہب کے معاملے میں سب سے زیادہ روادار تھے' بلکہ یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اورنگ زیب عالمگیر کے سوا کسی مغل بادشاہ نے اشاعتِ اسلام کی طرف توجہ نہیں کی تھی۔ یہ لوگ مسلمان ضرور تھے مگر اُن کو مذہب سے وہ لگاؤ نہ تھا جو تُرک اور افغان سلاطین کو تھا۔ مغلوں کی ساری توجہ ملک کی وسعت اور رعایا کی فلاح و بہبود پر مرکوز رہی۔ اگرچہ وہ مسلمان ہونے کی وجہ سے بت پرستی کے خلاف تھے' لیکن انہوں نے اِس مخالفت کو امورِ سلطنت میں دخیل نہ ہونے دیا۔ ڈاکٹر برنیئر جو مغلوں کے عہدِ حکومت میں ہندوستان میں مقیم تھے' اپنے سفرنامے میں لکھتے ہیں: ''مغل سلاطین کا مذہب باوجودیکہ بت پرستوں کے مذہب سے بالکل مختلف و متضاد ہے' لیکن متعدد ہندو راجا اُن کے درباروں سے وابستہ ہیں اور اکثر اوقات اُن کے ساتھ رہتے ہیں۔ مغل سلاطین ہندو امراء سے بالکل ایسا ہی سلوک کرتے ہیں جیسا مسلمان امراء سے کرتے ہیں۔ وہ ہندو امراء کو مسلمان سرداروں کی طرح فوجی عہدوں پر مامور کرتے ہیں اور انہیں سردار مقرر کرتے ہیں۔''

اکبر بادشاہ کی مذہبی رواداری تو لامذہبیت کی حد تک پہنچ چکی تھی۔ اُس نے ہندو راج کماریوں سے اپنی اور اپنے بیٹے جہانگیر کی شادیاں کیں۔ انہیں اپنے دربار کے نورتنوں میں شامل کیا۔ فوجی مہمات اُن کے سپرد کیں۔ انہیں اعلیٰ سول عہدوں پر بھی فائز کیا' حتیٰ کہ اُن کی بعض مذہبی رسوم بھی اختیار کرلیں۔ اُن کی خاطر ''دینِ الٰہی'' ایجاد کیا۔ مشہور ہندو مورخ سجان رائے بٹالوی اپنی تالیف ''خلاصۃ التواریخ'' میں لکھتا ہے کہ اکبر نے راجپوتانہ کے سب سے بڑے راجا بھارامل کچھواہہ کو اُس کی بیٹی کے لئے اپنی شادی کا پیغام دیا۔ راجہ نے ابتدا میں مذہبی اختلاف کی بناء پر کچھ تامل کیا مگر بالآخر اس نے اکبر کا پیغام قبول کرلیا اور اپنی بیٹی اُس کے عقد میں دے دی۔ پھر اُس نے اپنے بیٹے جہانگیر کا رشتہ راجہ بھگوان داس کی بیٹی کے لئے پیش کیا۔ راجہ بھگوان داس نے بھی رشتہ قبول کرلیا۔ جہانگیر کی دوسری شادی جودھ پور کے راجہ موٹا راجا کی بیٹی سے ہوئی۔ شاہجہاں اسی ہندو ملکہ کے بطن سے پیدا ہوا۔

عالمگیر کا سلوک ہندوؤں سے:

اورنگ زیب عالمگیر بر عظیم کا ''بدنام ترین'' حکمران ہے جسے اکثر ہندو اور انگریز مورخین نے ہندوؤں کا دشمن اور سخت ترین متعصب قرار دیا ہے۔ ہندوؤں پر اُس کے ظلم کی ایسی ایسی کہانیاں گھڑی گئی ہیں کہ پڑھ کر ہندوؤں کے دل میں اُس کے خلاف نفرت کا آتش فشاں ابلنے لگتا ہے۔ مگر ان من گھڑت کہانیوں کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ عالمگیر بھی اپنے اسلاف کی طرح لائق اور اہل ہندوؤں کی قدر و منزلت کرتا تھا اور انہیں بڑے بڑے عہدے اور اعزازات عطا کرتا تھا' بلکہ تاریخ سے تو یہ ثابت ہوتا ہے کہ اگر کبھی اُسے ہندوؤں کی سرپرستی کرنے سے روکا گیا تو اس نے اس مشورے کو سختی سے رد کر دیا۔ چنانچہ پروفیسر آرنلڈ نے اپنی شہرۂ آفاق کتاب ''دی پریچنگ آف اسلام'' میں اس کا ایک واقعہ درج کیا ہے۔

'عالمگیر کو کسی شخص نے عرضی دی کہ دو پارسی ملازموں کو جو تنخواہیں تقسیم کرنے پر تعینات تھے' اس سبب سے برخاست کر دیا جائے کہ وہ آتش پرست ہیں اور اُن کی جگہ کسی تجربہ کار مسلمان کو مقرر کیا جائے' کیونکہ قرآن شریف میں آیا ہے: ﴿یاایھا الذین امنوا لا تتخذوا عدوی وعدوکم اولیاء﴾ ''اے ایمان والو! میرے اور اپنے دشمنوں کو دوست مت جانو''۔ عالمگیر نے اس عرضی پر حکم لکھا کہ مذہب کو دنیا کے کاروبار میں دخل نہیں ہے' اور نہ اِن معاملات میں تعصب کو جگہ مل سکتی ہے۔ اس قول کی تائید میں قرآن مجید کی یہ آیت نقل کی ﴿لکم دینکم ولی دین﴾ ''تم کو تمہارا دین اور ہم کو ہمارا دین۔ عالمگیر نے اپنے حکم میں لکھا کہ عرضی نویس نے جو آیت نقل کی ہے' اگر سلطنت کا یہی دستور العمل ہوتا تو ہم کو چاہئے تھا کہ اس ملک کے سب راجاؤں اور اُن کی رعایا کو غارت کر دیتے' مگر یہ کس طرح ہو سکتا تھا۔ سرکاری نوکریاں لوگوں کو اُن کی ذاتی لیاقت و قابلیت کے مطابق ملیں گی اور کسی اور لحاظ سے نہیں مل سکتیں''۔

یہ اورنگ زیب عالمگیر کا وہ دستور العمل تھا' جس پر وہ تمام عمر قائم رہا۔ اس کے دربار میں نہایت اہم مناصب پر ہندو فائز تھے' جن پر وہ حد درجہ اعتماد کرتا تھا۔ نہایت اہم مہمات اُن کے سپرد کرتا تھا۔ قلعوں کی حفاظت پر انہیں مامور کرتا تھا۔ مالیات کے شعبے اُن کے سپرد کرتا تھا اور اُن کی دل داری اور دل جوئی میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہ کرتا تھا۔ مولانا شبلی نعمانی نے اپنی کتاب ''اورنگ زیب عالمگیر پر ایک نظر'' میں عالمگیری عہد کے ہندو امراء جو پنج ہزاری' شش ہزاری' اور دو ہزاری مناصب پر فائز تھے۔ اُن کی ایک فہرست دی ہے' جس میں ایسے اعلیٰ عہدے داروں کی تعداد 36 ہے۔

اورنگ زیب نے مرہٹوں' راجپوتوں اور اپنے مسلمان حریفوں سے جتنی جنگیں لڑیں' اُن سب میں مسلمان جرنیلوں کے ساتھ ساتھ ہندو جرنیل بھی اُس کی طرف سے شریک ہوئے۔ اگر اورنگ زیب ہندوؤں کا دشمن ہوتا تو وہ شیواجی' جیسے سرکش اور باغی دہشت گرد کی سرکوبی پر ہندو جرنیل مہاراجہ جے سنگھ کو کبھی مامور نہ کرتا اور اُس کی امداد کے لئے ریاست بوندی کے مہاراجہ بھاؤ سنگھ کو کبھی متعین نہ کرتا۔

اس باب میں دکھانا یہ مقصود ہے کہ مسلمانوں نے

علامہ اقبال نے فرمایا

''میں اس بات پر زور دیئے بغیر نہیں رہ سکتا کہ ہندوستان کی تاریخ میں موجودہ صورتِ حال مسلمانوں میں مکمل نظم و ضبط اور وحدتِ فکر و عمل کا تقاضا کرتی ہے' جو آپ کے انفرادی اور اجتماعی مفاد میں ہے..... طبقاتی مفادات اور ذاتی خواہشات سے بلند ہو کر اپنے نصب العین کو مدنظر رکھتے ہوئے انفرادی اور اجتماعی ''عمل'' کا تعین کریں۔ مادیت کی بجائے روحانیت کو اپنائیں۔ مادیت میں تفریق و تفاوت ہے۔ روحانیت میں روشنی' زندگی اور وحدت ہے۔ میں نے اسلام کی تاریخ سے ایک سبق یہ سیکھا ہے کہ جب بھی مسلمانوں کو دشوار حالات کا سامنا ہوا' اسلام نے مسلمانوں کو بچایا' مسلمانوں نے اسلام کو نہیں بچایا۔ اگر آج آپ اسلام کو منزلِ مقصود بنالیں اور اسلام کے حیات آفریں نظریے سے ہدایت حاصل کریں تو آپ اپنی منتشر قوتوں کو یکجا اور اپنی کھوئی ہوئی ہم آہنگی کو بحال کر کے اپنے آپ کو مکمل تباہی سے محفوظ رکھ سکیں گے۔ قرآن حکیم کی ایک آیت کے مطابق پوری انسانیت کی تخلیق' اور تخلیقِ نو ایک فرد کی تخلیق اور تخلیقِ نو کی مانند ہے۔ اس لئے آپ (مسلمان) جو انسانیت کے اس عظیم نظریے کے اوّلین اور عملی شارح ہیں' ایک فردِ واحد کی طرح زندہ اور فعال کیوں نہیں ہو سکتے؟ میں اُلجھانے کی غرض سے یہ بات نہیں کہہ رہا کہ ہندوستان میں حقیقی صورتِ حال وہ نہیں جو بظاہر دکھائی دے رہی ہے۔ اس کی حقیقت آپ پر اُس وقت روشن ہوگی جب آپ اجتماعی خودی حاصل کرلیں گے۔

(آل انڈیا مسلم کے سالانہ اجلاس کا خطبہ صدارت۔ الٰہ آباد' 30 دسمبر' 1930ء)

اپنے عہدِ حکومت میں ہندوؤں کے ساتھ نہ صرف رواداری کا سلوک کیا بلکہ برابری کا سلوک کیا اور اُن کی دل داری اور دل جوئی کی پوری کوشش کی۔ انہوں نے ہندوؤں کو جو عہدے دیئے وہ معمولی نہ تھے بلکہ ان عہدوں میں وزراء مختلف صوبوں کے گورنر، محکمہ مال کے اعلیٰ افسر، فوج کے جرنیل، وقائع نویسوں کے نگران، پولیس کے اعلیٰ حکام، سلاطین کے سیکرٹری شامل تھے۔ مگر اس ہندو نوازی کا مسلمانوں کو نہایت سخت خمیازہ بھگتنا پڑا، اور جب موقع ملا، ہندو راجاؤں، امراء، برہمنوں اور ہندو عوام تک نے مسلمانوں سے انتقام لینے اُن کو تباہ کرنے اور اُن کے اقتدار کو برباد کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ سب سے زیادہ افسوسناک بات یہ ہے کہ جن ہندو امراء کو مسلمان سلاطین نے ترقی کے اعلیٰ مدارج پر متمکن کیا، انہی امراء نے آستین کا سانپ بن کر اُن کی پشت میں خنجر پیوست کرنے کی کوشش کی۔ آئندہ باب میں ہندوؤں کی مسلم دشمنی کے رویے سے متعلق چند مثالیں پیش کی جائیں گی۔

17

ہندوؤں کی مُسلم دشمنی

ہندوؤں کے مفکرِ اعظم اور سیاسی رہنما چانکیہ نے ہندوؤں کے لئے جو رہنما اصولِ سیاست وضع کئے تھے، ان میں ایک اصول یہ بھی تھا کہ بادشاہ کو چاہئے کہ وہ اپنے ہمسایہ بادشاہ پر حملہ کرنے میں دیر نہ کرے اور صلح ہو جانے کی صورت میں جب دیکھے کہ اس نے دوبارہ طاقت حاصل کر لی ہے تو فوراً صلح کا معاہدہ توڑ کر اپنے حریف پر حملہ کر دے۔

چانکیہ کے اصول کے مطابق ہندوؤں کے فلسفۂ سیاست میں دفاع یا مدافعت کا کوئی تصور نہیں ہے۔ آغاز ہی میں حملہ آوری اور جارحیت کی تلقین ہے۔ اگر اپنی کمزوری کی وجہ سے صلح پر مجبور ہونا پڑے تو دوبارہ طاقت حاصل کرنے کے لئے پوری تیاری کرے، اور جب پوری طاقت حاصل ہو جائے تو معاہدۂ صلح کی پروا کئے بغیر اپنے حریف پر چڑھائی کر دے۔ ہندوؤں نے اپنے ان دو رہنما اصولوں کا اطلاق ہندی مسلمانوں پر بھی کیا اور کیونکر کیا اس کی چند جھلکیاں ہدیۂ قارئین ہیں:۔

غزنی پر برہمنوں کا حملہ:

جب پنجاب کے برہمن راجہ نے جے پال نے دیکھا کہ پنجاب کی ہمسایہ ریاست غزنی کی سلطنت ابھر رہی ہے اور اس کا حاکم سبکتگین، شمالی دشمنوں سے اپنی سلطنت کو بچانے کی جدوجہد کر رہا ہے تو جے پال نے امیر کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھاتے ہوئے سلطنت غزنی پر بلاوجہ حملہ کر دیا۔ چانکیہ نے یہی سبق دیا تھا کہ اپنی ہمسایہ سلطنت کو طاقتور نہ ہونے دو اور جب موقع دیکھو اس پر حملہ کر دو۔ چنانچہ اس نے اسی اصول کے مدنظر ایک ٹڈی دل لشکر کے ہمراہ غزنی پر چڑھائی کر دی۔ دونوں فوجوں کا مقابلہ ایک چشمے کے قریب ہوا۔ یہ چشمہ علاقہ غزنی میں واقع تھا۔

جے پال کی مسلم دشمنی:

اس جنگ میں جے پال کو شکست ہوئی اور اس نے ایک لاکھ درم اور پچاس ہاتھی تاوان جنگ کے طور پر نذر کرنے کا وعدہ کر کے صلح کر لی۔ اس نے ضمانت کے طور پر اپنے ایک معزز درباری دولت نامی کو سبکتگین کے حوالے کر دیا اور امیر کی فوج کے کچھ افراد کو یہ وعدہ کر کے اپنے ساتھ لے آیا کہ موعودہ رقم اور ہاتھی ان لوگوں کے سپرد کر دے گا، مگر بھٹنڈا پہنچ کر اپنے وعدے سے منحرف ہو گیا اور سبکتگین کے فوج کے ان افراد کو قید کر کے اسے پیغام بھیجا کہ جب تک اس کے درباری دولت کو واپس نہیں کیا جائے گا، یہ مسلمان ہماری قید میں رہیں گے۔ امیر کو جے پال کی اس عہد شکنی پر غصہ آنا قدرتی امر تھا، پھر بھی اس نے ضبط و تحمل سے کام لیا اور اپنے چند افراد کو حقیقت حال معلوم کرنے کے لئے بھٹنڈا روانہ کیا۔ جے پال نے ایک اور حرکت کی، یہ کہ جن افراد کو غزنی سے اپنے ساتھ لایا تھا، انہیں قتل کرا دیا۔ پھر اس نے ہندوستان کے دوسرے راجاؤں مثلاً گجرات اور کالنجر وغیرہ کے لشکروں کے اجتماع سے ایک متحدہ فوج بنائی اور دریائے سندھ عبور کر کے سلطنت غزنی پر حملہ کر دیا۔ یہ خبر سن کر سبکتگین بھی اپنا لشکر لے کر روانہ ہوا۔ اس وقت تک جے پال لمغان تک پہنچ چکا تھا جو جلال آباد کے قریب واقع تھا۔ یہیں جنگ ہوئی۔ اگرچہ جے پال کے ساتھ تین لاکھ کا ٹڈی دل لشکر اور جنگی ہاتھیوں کی ایک بڑی تعداد تھی، مگر اس نے شکست کھائی۔ سبکتگین نے دریائے سندھ تک اس کا پیچھا کیا، لیکن کچھ عرصے بعد ہی سبکتگین کا انتقال ہو گیا اور اس کا اقبال مند بیٹا محمود غزنوی تخت نشین ہوا۔

جے پال کی خودکشی:

متعصب مورخین یہ فقرہ لکھنا کبھی فراموش نہیں کرتے کہ محمود غزنوی نے ہندوستان پر سترہ حملے کئے اور لوٹ مار کر کے واپس غزنی چلا گیا، لیکن جب یہ لکھنے کی نوبت آتی ہے کہ چھیڑ چھاڑ ہندوؤں نے کی تھی، تو زبان قلم کو چپ لگ جاتی ہے۔ لیکن 999ء میں پھر جے پال ہی نے حملہ کیا۔ پشاور کے قریب دونوں فوجوں کا مقابلہ ہوا۔ جے پال کو شکست ہوئی۔ جے پال نے محمود سے اپنی غلطی کی معافی مانگی اور وعدہ کیا وہ آئندہ کبھی حملہ آوری کی جرأت نہ کرے گا، مزید یہ کہ اب پنجاب سلطنت غزنی کا ایک صوبہ ہوگا اور جے پال اس صوبے پر محمود کے نائب اور باج گزار کی حیثیت سے حکومت کرے گا۔ اس نے سالانہ خراج ادا کرنے کا بھی وعدہ کیا۔ محمود نے اسے پنجاب جانے کی اجازت دے دی۔ جے پال جب واپس آیا تو اس کی پیشانی پر مسلمانوں سے تین بار شکست کھانے کا داغ موجود تھا۔ ہندوؤں کا عقیدہ تھا کہ جو راجہ دو بار کسی غیر مذہب والے بادشاہ سے شکست کھائے تو وہ حکومت کرنے کے قابل نہیں رہتا۔ اس پاپ کا کفارہ ادا کرنے کا ایک ہی طریقہ تھا کہ ایسا ہارا ہوا راجہ خود کو آگ میں ڈال کر زندگی کا خاتمہ کر لے۔ چنانچہ جے پال نے اپنے بیٹے انند پال کو اپنا جانشین مقرر کیا اور خود آگ میں جل کر اپنی زندگی کا خاتمہ کر لیا۔

"ہندومت خطرے میں ہے":

انند پال اب محمود غزنوی کا باج گزار تھا۔ کچھ عرصے تک تو وہ خراج کی رقم باقاعدگی سے غزنی بھیجتا رہا، لیکن موقع کی تاک میں رہا اور جب ذرا طاقت پکڑ لی تو پھر غزنی پر حملہ ہو گیا۔ راستے میں اس کے ٹڈی دل لشکر نے محمود کے مقابلے میں شکست کھائی۔ انند پال شکست کھا کر کشمیر کی طرف بھاگا اور پہاڑوں میں روپوش ہو گیا۔ محمود واپس غزنی آ گیا۔

اس جنگ میں انند پال کی شکست سے سارے شمالی ہند میں صف ماتم بچھ گئی۔ اس سے قبل راجہ جے پال کی خودکشی کا واقعہ کیا کم اشتعال انگیز تھا۔ اُسی وقت سے برہمنوں، ہندو راجاؤں اور مذہبی رجحانات کے حامل سیاسی رہنماؤں نے غزنی اور پنجاب کی ہندو مسلم جنگ کو مذہبی مسئلے کی حیثیت دے دی تھی۔ اب انند پال کی شکست نے ہندوؤں میں اک آگ سی لگا دی اور

پنڈتوں نے ایک ملک گیر مہم چلائی جس کا نعرہ تھا ''ہندو مذہب خطرے میں ہے۔'' انند پال نے ہندوستان کے تمام راجاؤں کو خطوط لکھ کر اور قاصد بھیج کر اپنی امداد کی تحریک کی۔ اس مہم کا خاطر خواہ اثر ہوا اور گجرات' متھرا' قنوج' کالنجر' اجمیر' گوالیار' دہلی' تھانیسر' ڈیرہ دُون' مالوہ' میرٹھ' سونی پت' بندیل کھنڈ کے راجاؤں نے اپنے لشکروں اور زر کثیر سے انند پال کی مدد کی۔ برہمنوں نے اس جنگ کو ''مقدس جنگ'' کا نام دیا اور ہندو دھرم کی حفاظت کے لئے ایسی مؤثر تحریک کی کہ ایک مغربی مورخ جے سی ایلن کے بیان کے مطابق ہندو عورتوں نے اپنے سونے کے زیورات اتار کر جنگی سورماؤں کے حوالے کر دیئے۔ ایک اور مغربی مورخ ڈاکٹر ہنٹر کا بیان ہے کہ اس مقدس جنگ کے لئے ہندو عورتوں نے سوت کات کات کر روپیہ جمع کیا اور اپنے زیور اتار کر اپنے ہم مذہبوں کی امداد کی۔ اس لحاظ سے یہ کہنا غلط نہ ہوگا کہ اس جنگ کی وہی حیثیت تھی جو صلاح الدین ایوبی کے عہد میں صلیبی جنگوں کو حاصل تھی' مگر ہندوؤں کی اس متحدہ فوج کو بھی محمود غزنوی نے شکست دے دی۔ پشاور کے قریب دونوں فوجوں میں مقابلہ ہوا۔ انند پال بمشکل جان بچا کر بھاگا۔ اس نے پھر معافی کی درخواست کی۔ محمود نے اسے پھر معاف کر دیا۔ ہندوستان کے دوسرے راجاؤں نے بھی معافی کی درخواست کی۔ محمود نے انہیں بھی معاف کر دیا۔ راجاؤں نے اطاعت کا وعدہ کیا۔ خراج کی پیشکش کی۔ سلطان محمود غزنوی نے عالی ظرفی کا مظاہرہ کرتے ہوئے دس ہزار ہندو فوجی اپنی فوج میں شامل کر لئے تاکہ ہندوؤں کو یقین ہو جائے کہ محمود ان کا مذہبی دشمن نہیں ہے اور ان پر اعتماد کرتا ہے۔

رام راج کا منصوبہ:

ہندوستان کے ترک سلاطین میں علاؤ الدین خلجی بڑا اولعزم بادشاہ گزرا ہے۔ اس کے ایک سردار ملک شادی خان نے گجرات (کاٹھیاواڑ) کے ایک ہندو بچے کی پرورش کی اور اس کا نام حسن رکھا۔ سلطان مبارک شاہ خلجی نے اس ہندو نژاد کو طرح طرح سے نوازا۔ اسے ''خسرو خان'' کا خطاب دیا۔ وزارت کے عہدے پر فائز کیا۔ ملک کافور کی وسیع جاگیر اور دیگر قیمتی املاک اس کے نام منتقل کر دی۔ دکن کی ریاستوں کی نگرانی اور خراج کی وصولی کا انتظام اس کے سپرد کیا۔ یہ شخص نام کا حسن تھا۔ دل سے کٹر ہندو اور مسلمانوں کا جانی دشمن تھا۔ اس کے بھائی اور نام کے مسلمان حسام الدین نے ایک منصوبے کے تحت سلطان مبارک شاہ کو امور سلطنت سے غافل کرنے کے لئے اسے لہو ولعب میں مبتلا کیا اور ایسے لوگوں کو اس کے دربار میں شامل کرا دیا جو اسے عیش وعشرت کی طرف مائل کر سکیں۔

خسرو خان کی مُسلم کشی کا آغاز جنوبی ہند سے ہوتا ہے۔ اس علاقے کی بندرگاہوں اور ساحلی علاقوں پر مسلمان تاجر آباد تھے۔ یہ بڑے مال دار لوگ تھے۔ اس ہندو نژاد نے سب سے پہلے ان پر ہاتھ صاف کیا۔ ان کے اموال پر جبراً قبضہ کر لیا اور پھر ان میں سے بعض کو قتل کرا دیا۔ اس کے بعد اس نے ہندوستان پر رام راج کا منصوبہ پایۂ تکمیل کو پہنچانے کے لئے ہندوؤں کی ایک زبردست فوج تیار کی۔ یہ لوگ خسرو خان کے وطن گجرات کے خانہ بدوش تھے۔ اس نے دکن کے بعض ہندو راجاؤں کو اپنے ساتھ ملایا اور ان سے بھی فوجی امداد لی۔ یہ فوج رفتہ رفتہ دہلی پہنچ گئی اور پھر خسرو خان بھی دربار میں آ گیا۔ آخر کار ایک روز جب سلطان مبارک شاہ خسرو خان کے ساتھ بزم عیش وعشرت میں مصروف تھا' خسرو خان کے ایک ہندو سردار جاہر دیو نے بادشاہ کا سر تن سے جدا کر دیا اور پہلے سے طے شدہ منصوبے کے مطابق ہندو سپاہی شاہی محل میں داخل ہوئے۔ سلطان کا سر کاٹ کر محل کے نیچے پھینک دیا گیا۔ ہندو سپاہیوں نے شاہی مستورات کی توہین میں کوئی کمی نہ چھوڑی۔ سلطان کے بیٹوں کو قتل کر دیا گیا۔ شاہی خاندان کا جو نوجوان ہاتھ آیا' اسے موت کے گھاٹ اتار دیا گیا' حتیٰ کہ سلطان کی بیگم کو بھی قتل کر دیا گیا۔ سلطان علاء الدین خلجی کی بیٹی خسرو خان نے اپنے بھائی کو ''بخش'' دی اور سلطان کی ایک بیگم کو اپنے تصرف میں لے آیا۔ شاہی خاندان کی باقی عورتیں ہندو سپاہیوں اور افسروں کو دے دی گئیں۔

اس کے بعد ہندو نژاد خسرو خان ''سلطان ناصر الدین'' کا لقب اختیار کر کے تخت سلطنت پر متمکن ہو گیا۔ اس نے تمام بڑے بڑے مسلمان سرداروں کو قتل کرا دیا اور ان کی عورتیں اور کم سن بچے گجرات کے ہندوؤں کے حوالے کر دیئے۔ ایک ہندو سردار کو وزیر سلطنت مقرر کیا۔ اس طرح دہلی جو سلاطین خلجی کا پایۂ تخت تھا' پوری طرح ہندوؤں کے قبضے میں آ گیا اور چالیس ہزار ہندو فوجوں کے سامنے مسلمان بے بس ہو گئے۔ ان لوگوں کی جرأتیں اتنی بڑھ گئیں کہ انہوں نے مساجد پر قبضہ کر لیا اور اذانیں بند ہو گئیں۔ مسجدوں کی محرابوں میں دیوتاؤں کے بُت رکھے گئے۔ انتہا تو یہ ہے کہ خسرو خان کے دربار میں ہندو امراء قرآن مجید کے نسخوں کو اوپر تلے رکھ کر چبوترے سے بناتے اور پھر ان پر بیٹھ جاتے اور خسرو خان یہ منظر دیکھ کر قہقہے لگاتا۔

یہ کوئی سیاسی بغاوت نہ تھی' رام راج قائم کرنے کا مذہبی منصوبہ تھا۔ اس کا مقصد برصغیر سے اسلام کو بے دخل کرنا تھا۔ اگر اس موقع پر سلطان مبارک شاہ شہید کا ایک وفادار سردار ملک فخر الدین جُونا خان میدان میں نہ آتا تو شاید آج ہندوستان کی تاریخ کا انداز کچھ اور ہی ہوتا۔ جُونا خان ایک روز موقع پا کر دہلی سے نکلا اور اپنے باپ غازی ملک (حاکم دیپال پور) کے پاس پہنچا اور سارا ماجرا سنایا۔ غازی ملک ایک لشکر لے کر دیپال پور سے روانہ ہوا اور دہلی پہنچ کر خسرو خان سے نبرد آزما ہوا۔ آخر میدان غازی ملک کے ہاتھ رہا۔ خسرو خان بھاگا' گرفتار ہوا اور غازی ملک کے ہاتھوں قتل ہو کر اپنے انجام کو پہنچ گیا۔ یہ رام راج کے لئے پہلا منظم انقلاب تھا جو مذہب کے نام پر برپا کیا گیا تھا اور جس میں مسلمان حکمران' ان کی اہل خاندان اور مسلمان امراء نہایت سفاکی سے قتل کئے گئے۔ ان کی خواتین کی آبروریزی کی گئی اور ان کے مذہب کے ساتھ ایسا شرمناک مذاق کیا گیا جس کے تصور سے بھی لرزہ طاری ہو جاتا ہے۔

بابری مسجد کا سانحہ:

جنوبی ہند' دکن' بیجانگر' عہد شاہجہانی میں راجہ جسونت سنگھ کی مُسلم دشمنی' فرخ سیر کے عہد میں ہندوؤں نے مسلمانوں کو جس طرح محکوم بنانے کی کوششیں کیں' غرضیکہ تواریخ میں بے شمار ایسے واقعات کا اندراج ملتا ہے یہاں آخر میں صرف بابری مسجد کے سانحے کا ذکر کر کے یہ باب ختم کرتے ہیں۔

یہ واقعہ اودھ سے تعلق رکھتا ہے۔ زمانہ واجد علی شاہ کا ہے۔ مغلیہ سلطنت کا دور زوال ہے۔ اودھ میں فیض آباد کے قریب ہندوؤں کا ایک متبرک مقام اجودھیا ہے' جس کے متعلق کہا جاتا ہے کہ اس مقام پر رام چندر جی کی ولادت ہوئی تھی۔ جب بابر نے ہندوستان پر اسلامی سلطنت کا علم لہرایا تو اس نے اجودھیا میں ایک مسجد تعمیر کروائی۔ یہ نہایت عالیشان مسجد تھی اور مسجد جامع کہلاتی تھی۔ یہی بابری مسجد ہے۔ مغلیہ سلطنت کا زوال ہوتا دیکھ کر متعصب ہندوؤں کے حوصلے بڑھ گئے اور انہوں نے اس مسجد کو منہدم کر دیا۔ صرف اس کے ایک دو مینار اور دیوار کا تھوڑا سا حصہ باقی رہ گیا۔ ایک مسجد اجودھیا کی قلعے میں بھی تعمیر کی گئی تھی' مگر یہ قلعہ پھمن نامی ایک مہنت کو بخش دیا گیا' اس لئے مسلمان اس مسجد سے بھی محروم ہو گئے۔ ایک اور مسجد اورنگ زیب عالمگیر نے اجودھیا میں تعمیر کرائی۔ اس مسجد کو برہان الملک کے عہد میں ہندوؤں نے منہدم کر دیا اور اس کی جگہ مندر تعمیر کر لیا۔ جب برہان الملک کے پاس شکایت کی گئی تو اس نے فوج بھیج کر مفسدوں کو سزا دی اور مندر گرا کر یہ مسجد دوبارہ تعمیر

کروائی' مگر کچھ عرصے کے بعد نواب شجاع الدولہ کے زمانے میں بیراگی فرقے کے ہندوؤں نے اس پر قبضہ کر لیا اور محراب و منبر کو توڑ ڈالا اور قرآن مجید کے نسخوں کو نذرِ آتش کر دیا۔ مہنتوں نے اس قدر طاقت حاصل کر لی کہ اجودھیا میں کئی سال تک اذان اور گئوکشی بند رہی۔ بابری مسجد کو بُت خانے میں تبدیل کر لیا گیا' اور قریب ہی رام گھاٹ کی مسجد کے صحن میں علاقے کا کوڑا کرکٹ ڈالا جانے لگا۔ صرف یہی نہیں' مسجدوں اور مقبروں کی اینٹیں اور پتھر اکھیڑ کر ان سے مندر تعمیر کئے جانے لگے۔

یہ صورت حال ایسی نہ تھی کہ مسلمان خاموشی سے برداشت کرتے رہتے۔ چنانچہ واجد علی شاہ کے عہد میں شاہ غلام حسین' مولوی محمد صالح' حسن علی خان بانکے' احسان علی خان رسالدار' رستم علی خان اور بہادر علی خان' جو اس عہد کے جوشیلے مسلمان تھے' مساجد کی بے حرمتی کے خلاف محمدی پرچم لے کر میدان میں نکل آئے۔ جولائی 1855ء میں دو تین سو مسلمان کئی سال کے بعد نماز ادا کرنے کے لئے بابری مسجد میں داخل ہوئے' مگر ہندوؤں اور بیراگیوں نے مزاحمت کی اور مسلمان نماز ادا نہ کر سکے' دوسرے روز بیراگیوں نے پھر حملہ کیا اور عین اس وقت کہ مسلمان ہتھیار اٹھا کر کھانا کھانے میں مصروف تھے' ہزاروں بیراگیوں نے مسجد پر حملہ کر دیا اور مسجد میں گھس کر مسلمانوں کو ذبح کر ڈالا۔ ان کے جسم کے ٹکڑے کر دیئے اور صحن مسجد مسلمان کے خون سے رنگین ہو گیا۔ اکثر مسلمانوں کے گلے میں قرآن شریف حمائل تھے۔ بیراگیوں نے انہیں پرزے پرزے کر کے پاؤں سے روندا اور نذرِ آتش کیا۔

مذکورہ بالا چند واقعات سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہندوؤں کے دلوں میں مسلمانوں کے خلاف کس قدر بغض تھا اور ہے۔ آزاد بھارت کی نصف صدی کی تاریخ بھی مسلم کش فسادات و واقعات سے بھری پڑی ہے۔ موجودہ وزیراعظم اٹل بہاری واجپائی اور نائب وزیراعظم کے ایل ایڈوانی نے بابری مسجد کو جس طرح لاکھوں ہندوؤں کی قیادت کرتے ہوئے بابری مسجد کو شہید کرایا' قارئین کے علم میں ہے۔ یہ طے کرانے کے لئے کہ اس مقام پر مسجد کے نیچے کیا رام چندر کی ولادت گاہ مندر کی صورت میں موجود تھی' محکمہ آثارِ قدیمہ کی نگرانی میں کھدائی کرائی گئی' لیکن اس کے آثار تک نہیں ملے۔ پچھلے سال گجرات صوبے میں وزیراعلیٰ مودی کی نگرانی میں جس طرح ہزاروں مسلمانوں کو شہید اور بے گھر بنایا گیا' وہ کوئی فرقہ وارانہ سیاسی واقعہ نہیں' مذہبی جوش سے مسلم کشی کی قدیم دلدوز تاریخ کا نیا باب ہے۔

18

مسلمانوں پر ہندو تہذیب کے اثرات

ظاہر ہے کہ جب دو تہذیبیں آپس میں ملتی ہیں اور ایک ایک ہزار سال تک بلکہ زیادہ مدت تک عوامی میل جول رکھتی ہیں تو ایک دوسرے کے رسوم و رواج' عقائد و افکار' زبان اور لباس تک سے دو طرفہ اثر پذیری ایک قدرتی امر اور عمرانی تقاضا ہے۔ مسلمانانِ ہند نے بھی ہندو تہذیب و تمدن سے بہت سے اثرات قبول کئے ہیں۔ متحدہ ہندوستان یا یوں کہئے کہ نظریۂ پاکستان اور دو قومی نظریے کے مخالف مفکرین و مورخین کے نزدیک یہ گنگا جمنی اثرات متحدہ قومیت کی قوی اور پُرزور دلیل ہیں۔ ان قوم پرست دانشوروں کا کہنا تھا کہ مشترکہ تہذیب کی موجودگی میں مذہب کی بنیاد پر کسی نئی ریاست کی تشکیل عقلِ سلیم کے خلاف ہے۔ جبکہ نظریۂ پاکستان اور دو قومی نظریے کے حامیوں نے ہندو تہذیب کے اسلام پر اثرات کو بدعات اور اسلام کو پراگندہ کرنے کے مترادف قرار دیا اور اسلام کی اصلی روح کو ہندو تہذیب و ثقافت کے اثرات سے نکالنے کے لئے نئی آزاد ریاست کے قیام کو ضروری خیال کیا' جس میں ہندوانہ پیچیدہ رسوم و رواج کا قلع قمع کر کے سادہ اسلام کو صالح مسلمانوں کا عام شعار بنایا جا سکے۔

اس باب میں مسلمانوں پر ہندو تہذیب و ثقافت کے ایسے ہی اثرات کا بیان ہوگا' جنہوں نے روحِ اسلام کو داغدار کر رکھا ہے۔ یہ اثرات دو قسم کے ہیں۔ اوّل وہ جو ہندو مذہب کے بنیادی رکن یعنی ذات پات کی تفریق کے زیر اثر مسلمانانِ ہند کی عام زندگی میں داخل ہو کر پیوستہ ہو گئے ہیں۔ حالانکہ اسلام میں رنگ' نسل اور ذات پات کی تفریق کی سخت ممانعت ہے۔ دوم وہ اثرات جو ہندوؤں کے کچے پکے مذہبی عقائد اور روزمرہ کی عام تمدنی و معاشرتی رسوم و رواج سے مسلمانوں پر پڑے۔

مسلمانوں میں ذات پات کی تفریق:

پورے براعظم میں کہیں زیادہ' کہیں کم' مسلمان موجود ہیں جو دو نسلی گروہوں میں منقسم ہیں۔ اوّل وہ مسلمان جو ابتداء میں آنے والے مہاجرین کی اصلی یا مصنوعی اولاد ہیں مثلاً سید' شیخ' مغل اور پٹھان۔ دوم دیسی مسلمان جن کے آباؤ اجداد نے اسلام قبول کیا تھا۔ دیسی مسلمان عموماً اپنے پیشوں کے نام سے یاد کئے جاتے ہیں۔ وہ تین نمایاں ذیلی گروہوں میں بٹے ہوئے ہیں:۔

(1) ہندو سماج کے اونچی ذات کے لوگ جو مشرف بہ اسلام ہوئے جیسے راجپوت

(2) وہ پیشہ ور لوگ جن کا پیشہ صاف ستھرے کاموں سے تعلق رکھتا ہے مثلاً جولاہے' درزی' قصائی' حجام' کنجڑے میراثی' دھنیا' تیلی' دھوبی وغیرہ

(3) نجس کام کرنے والی ذاتیں مثلاً بھنگی' چمار اور خاکروب وغیرہ

یہ تقسیم پھر ہندوؤں کی ذاتوں کی طرح تقسیم در تقسیم ہو کر سینکڑوں کی تعداد پر مشتمل ہو گئی ہے۔ ہندو ذات پات کے نظام میں ادنیٰ درجے کی ذاتوں کے افراد میں انفرادی یا اجتماعی طور پر اپنی ذات کی سماجی سطح کو اونچا کرنے کی کوشش کرتا ہے تو وہ اپنا سلسلۂ نسب برہمن یا کھتری کی ذات سے منسلک کرتا ہے۔ مثلاً اہیر' کھتریوں کی قمری نسل (چندر ونشی) کے یادوؤں کی اولاد ہونے کے مدعی ہیں۔

بالکل اسی طرح کا تقابلی دعویٰ ہندی مسلمانوں میں بھی پایا جاتا ہے۔ اپنا سماجی مرتبہ بڑھانے کے لئے مسلمانوں میں بھی چھوٹی ذات کے لوگ اپنا سلسلۂ نسب کسی اونچی ذات کے مورثِ اعلیٰ سے جوڑتے ہیں۔ ایسی مثالیں شمالی ہند (موجودہ پاکستان) میں کثرت سے ملتی ہیں' جیسے راجپوت ذات کے وہ لوگ' جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا' اپنے نام کے ساتھ ''خان'' بڑھا کر افغانوں یا پٹھانوں کے مساوی ہونے کے دعوے دار ہیں۔ قصاب اپنے نام کے آخر میں ''قریشی'' کا لفظ اضافہ کر کے قریش ہونے کا دعویٰ کرتے ہیں۔ جس کی نسبت رسول مقبول ﷺ کے قریشی ہاشمی کی طرف منسوب ہے۔ اسی طرح جلاہوں نے اپنے نام کے آگے لفظ ''انصاری'' کا اضافہ کر کے مدینہ کے انصار سے اپنا سلسلۂ نسب جوڑتے ہیں۔ لیکن ایسے دعووں اور تبدیلیوں کا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ نقلی اشراف اصل اشراف کے دائرے میں فوری طور پر قبول کر لئے جاتے ہیں' اس کے لئے بڑے مدت درکار ہوتی ہے۔ اس درجے میں قبولیت حاصل کرنے میں دو تین پشتیں گزر جاتی ہیں۔

بعض دفعہ ایسا بھی ہوتا ہے کہ نچلی ذاتوں کے لوگ

اپنا سماجی مرتبہ بڑھانے کے لئے اپنے خاندان کی دیرینہ رسوم پر عمل کرنا ترک کر دیتے ہیں اور ڈھیرے ڈھیرے اونچی ذاتوں کے رسوم اختیار کر لیتے ہیں۔ مثلاً اگر ان کی عورتیں پردہ نہیں کرتی تھیں تو وہ پردہ کرانا شروع کرا دیتے ہیں۔

جس طرح ہندو مذہب میں برہموں کے لئے خاص احترام پایا جاتا ہے' ایسا ہی خاص احترام مسلمان اشراف یعنی چار مہاجر طبقات (سیّد' مغل' شیخ اور پٹھان) کے لئے پایا جاتا ہے۔ شمالی ہند میں وعظ و تلقین اور امامت کے فرائض سیّدوں اور شیخوں کی اجارہ ہو کر رہ گئے ہیں۔ ایک پیر طریقت یا تو سیّد ہوتا ہے یا شیخ' چاہے اس کی ذات کوئی دوسری بھی ہو' لیکن وہ اپنا سلسلۂ نسب کسی سیّد صُوفی یا بزرگ شیخ سے جوڑ لیتا ہے اور اس صوفی کا نام بطور لقب اختیار کر لیتا ہے' مثلاً چشتی' قادری' نظامی۔

ہندی مسلمانوں کے ذات پات کے نظام میں اشرف کو بعینہٖ وہی مرتبہ اور فوقیت حاصل ہے جو ہندو ذات پات کے نظام میں علی الترتیب برہموں اور کھتریوں کو۔ لہٰذا سیّد اور شیخ دونوں مذہبی معلّم اور پیشوا کی صورت میں بعینہٖ برہموں کے مساوی ہیں' جبکہ مغل اور پٹھان جو اپنی بہادری اور جوانمردی کے لئے مشہور ہیں' کھتریوں کے ہم مرتبہ ہیں۔ ان چاروں اشراف کے بعد بقیہ تمام ذاتوں کو ثانوی درجہ حاصل ہے۔

مُسلم راجپوت ہندوؤں کی اونچی ذاتوں کے وہ لوگ ہیں جنہوں نے اسلام قبول کیا تھا۔ مشرف بہ اسلام ہونے کے باوجود مسلم راجپوت اب بھی اپنی موروثی ہندوانہ رسوم کی پیروی کرتے ہیں مثلاً وہ بھی گوت کے باہر شادی کرنے کے اصولوں کے پابند ہیں اور عموماً چچا یا ماموں کے خاندان میں شادی نہیں کرتے' جبکہ اشراف میں قریب ترین رشتہ داروں میں شادی کرنا مستحسن سمجھا جاتا ہے۔

اشراف اور مُسلم راجپوتوں کے طبقوں کے علاوہ بہت سی ایسی ذاتیں ہیں جن کے پیشے "پاک پیشوں" میں شمار ہوتے ہیں۔ شمالی ہند کی زیادہ تر آبادی ایسے ہی پیشہ وروں پر مشتمل ہیں۔ یہ لوگ ان ہندوؤں کی اولاد ہیں جو پاک پیشے کرتے تھے اور ان لوگوں نے قبیلے کی صورت میں اسلام قبول کیا تھا۔ بہت سی ایسی بھی پیشہ ور ذاتیں بھی پائی جاتی ہیں جن میں مسلمانوں کے علاوہ ہنوز ہندو بھی شامل ہیں' مثلاً بڑھئی' درزی' دھوبی' کمہار' لوہار' حجام' سنار اور تیلی۔

ہندی مسلمانوں کے ذات پات کا نظام اپنی ساخت اور تنظیم میں کئی لحاظ سے ہندو ذات پات کے نظام سے ماخوذ ہے۔ اپنی سماجی برتری کو مسلط کرنے اور مرّوجہ ذات پات کے نظام میں اپنی فوقیت کو برقرار رکھنے کے لئے طبقۂ اشراف نے اونچی ہندو ذاتوں سے بہت سی رسوم اخذ کر لی ہیں۔ دیسی مسلمان یعنی نومُسلم نے اب تک اپنی آبائی' ہندووانہ رسوم کو اپنائے رکھا۔ ان دونوں وجوہ کی بنا پر اشراف (مہاجر مسلمان) اور دیسی مسلمان (نومسلم) جب آپس میں خلط ملط ہوئے تو مسلم سماج میں ان کے درمیان تقسیم و تفریق قدرتی طور پر پیدا ہو گئی' اس تقسیم میں اشراف نے اعلیٰ طبقے میں اور باقیوں نے ادنیٰ طبقے میں جگہ پائی۔

ہندی مسلمانوں کا ذات پات کا نظام قرآن و سنّت پر مبنی نہیں ہے' بلکہ ہندو ذات پات کے نظام سے ماخوذ ہے' اس لئے مسلمانوں کا نظام ہندوؤں کے نظام کے مقابلے میں نسبتاً کم سخت ہے۔ کتنا بھی کم سخت ہو' اسلام اصلی اور سچی تعلیمات کی کسوٹی پر پرکھا جائے تو یہ اسلام سے دور اور ہندو مذہب کے قریب ہے۔

<u>ہندوؤں کی معاشرتی رسوم:</u>

مہد سے لے کر لحد تک معاشرتی رسوم انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتیں۔ مسلمانانِ ہند خواہ مہاجر ہوں یا نومسلم' ہندوؤں کی تہذیبی رسوم کے اسیر ہیں۔ چونکہ مہاجر مسلمان تعداد میں کم' اور نومسلم زیادہ ہیں اس لئے ہندو معاشرت کے اثرات نومسلموں میں زیادہ ہیں۔ ذیل میں جن رسوم کا ذکر کیا جا رہا ہے' قیام پاکستان سے قبل یہ پورے ہندوستان میں رائج تھیں۔ لیکن حصولِ آزادی کے بعد چونکہ پاکستان کے علاقوں سے ہندو بھارت منتقل ہو گئے اس لئے رفتہ رفتہ ان رسوم کی رواج میں کمی آ رہی ہے۔ تاہم یہاں اِن کے ذکر سے ہمارا مقصود یہ دکھانا ہے کہ مسلمانانِ ہند کس قدر ہندومت کے عقائد و تہذیب کے زیرِ اثر رہے ہیں اور ان کی سوچ ہندومت سے نکل کر اب تک اسلام کے سائے میں نہیں آ سکی ہے۔

بچے کی ولادت کی رسمیں

حمل قرار پانے کے وقت سے حاملہ عورتوں کا خاص خیال رکھا جاتا تھا اور تردّد' پریشانی اور اضطراب کو ان کے نزدیک تک پھٹکنے نہیں دیا جاتا تھا اور اس وقت سے بچے کی ولادت کے ایک سال بعد تک طرح طرح کی رسمیں اور تقریبات عمل میں آتی تھیں اور ان موقعوں پر رشتہ داروں اور احباب کو شریک کیا جات ہے (بعض رسوم اب بھی کئے جاتے ہیں)

ستوانسا: جب حمل کا ساتواں مہینہ شروع ہوتا تھا تو ستوانساء کی رسمیں عمل میں آتی تھیں اس موقع پر میکے والے سدھوڑے لے کر آتے تھے۔ سدھوڑ ہندی لفظ بمعنی سات ہیں کیونکہ اس میں سات طرح کی ترکاریاں' میوے اور پکوان ہوتے تھے۔ یہ رسم ہندووانہ ہے۔ ہندوؤں میں آج بھی رائج ہے۔ پنجاب میں اس رسم کو ساتواں کہتے ہیں۔

نوماسا: جب نواں مہینہ شروع ہوتا ہے تو دلہن کے میکے سے اس کا جوڑا' کنگن ہنسی' عطر' پھول' چاند کی نہرنی' نیل کی نقرئی پیالی' لال اوڑھنی اور سات رنگ کے میوے' نندوں کے نیگ اور پنجیری کے روپے بھیجے جاتے تھے۔ پنجیری میں خربوزے کے بیج' شکر اور گھی کے ساتھ بھون کر میدے یا سوجی میں ملائے جاتے تھے۔ سسرال والے پنجیری بناتے اور سب رشتہ داروں میں تقسیم کرتے تھے۔

بچے کے پیدا ہونے کے بعد بہت سی چھوٹی چھوٹی رسمیں ادا کی جاتی تھیں۔ پہلے بچے کو نہلاتے تھے۔ پھر سر کو چاروں طرف سے دبا کر گول کر دیتے۔ سر پر رومال جکڑ کر باندھتے۔ گلے میں کرتہ اور سر پر ٹوپی پہناتے۔ پھر نومولود کے کانوں میں اذان دلوائی جاتی۔ پھر شہد چٹایا جاتا۔ پھر گھٹی پلائی جاتی۔ اوّل دن شہد' دوسرے دن گھٹی اور تیسرے دن دودھ پلایا جاتا۔

پتی اور چھٹی: بچے کی ولادت کے تیسرے دن پتی کی رسم ہوتی۔ چوتھے دن ددھیال اور ننھیال دونوں طرف کے لوگ جمع ہوتے۔ چھٹے دن چھٹی ہوتی۔ ہر طبقے کے لوگوں میں حیثیت کے مطابق خوشیاں منائی جاتیں اور ضیافت کا اہتمام ہوتا۔

چھوچھک: اس موقع پر میکے سے چھوچھک آتی تھی۔ سونے یا چاندی کی ہنسلی' کڑے' بچے کے گھنگرو' چاندی کے چٹے بٹے' چڑیاں' جھنجھنے' سونے کی دال' چاندی کے بنے ہوئے چاول' کرتے' ٹوپیاں' پوتڑے' دوہرے' سوزنیاں اور حیثیت کے مطابق اس سے زیادہ کچھ۔ اس موقع پر جو گیت گائے جاتے' وہ گیت وہ تھے جو دیوکی جی نے کرشن کی ولادت پر گائے تھے۔ ان گیتوں کے لفظوں اور خیالوں سے صاف ہندووانی رسموں اور عقیدتوں کا ثبوت ملتا ہے۔ ایک گیت ملاحظہ ہو:

البیلے نے مجھے درد دیا' سانولیاں نے مجھے درد دیا
البیلے نے مجھے درد دیا
جاؤ کھولڑکے کے باوا سے' اونچی نوبت دھراؤ رے
البیلے نے مجھے درد دیا' پالیلیا نے مجھے درد دیا

راقم السطور نے قیامِ پاکستان سے قبل چھوچھک کی رسم کا اپنی ننھیال میں مشاہدہ کر رکھا ہے جو کہ دہلی میں تھی۔ غالباً پنجاب میں یہ رسم نہیں ہے۔

زچہ کو تارے دکھانا: چھٹی کی رات کو دالان کے آگے چوکی بچھائی جاتی تھی اور بچے اور زچہ کا بناؤ سنگھار کرتے۔ سموسے دار کارچوبی کی پٹی دونوں کے سر پر باندھتے اور دونوں کو باہر لاتے۔ زچہ بچے کو گود میں اور قرآن مجید سر پر رکھ کر آسمان کی طرف دیکھتی اور چوکی پر کھڑے ہو کر سات تارے گنتی تھی۔ یہ رسم مغلیہ شاہی خاندان اور عام مغلوں میں منائی جاتی تھی۔

سروان کرنے کی رسم: زچہ کو تارے دکھانے کی رسم کے بعد ''سروان کرنے کی رسم'' ادا کی جاتی تھی۔ تمام عورتوں کا یہ عقیدہ تھا کہ اس بچے کو' جس کے ابھی دانت نہ نکلے ہوں اگر کوئی اپنے سر سے اونچا اٹھالے تو اس کو سفید دست آنے لگتے ہیں اور اگر پہلے ہی ایک خاص عمل کر لیا جائے تو وہ بچہ اس بلا سے محفوظ رہتا ہے۔ اس عمل کو اس طرح سے کیا جاتا تھا کہ پلنگ کی ادوان نکال ڈالتے تھے اور پھر دو عورتوں کو' جن میں سے ایک ماں اور ایک بیٹی کا ہونا لازمی تھا' یہ ٹوٹکا کرتی ہیں۔

بچے کا نام رکھنا: عموماً یہ رسم ولادت کے ساتویں دن ادا کی جاتی تھی۔ زائچے میں قمر کس برج اور منزل میں ہے' پہلے یہ دیکھا جاتا۔ پر جو حرف اس سے منسوب ہوتا' نام بھی اسی حرف سے شروع کرتے۔ چار حرف سے زیادہ کا نام برا سمجھا جاتا تھا۔ دوسرا طریقہ یہ ہے کہ گھر کا کوئی بزرگ وضو کر کے قرآن مجید کھولتا ہے اور آنکھیں بند کر کے جس لفظ پر انگلی رکھتا ہے' اس کے پہلے حرف کے مطابق بچے کا نام تجویز ہوتا۔

مونڈن: جب بچہ ایک سال یا تین سال کا ہو جاتا تھا تو اس کے سر کے بال منڈوائے جاتے تھے۔ بچے کے بالوں کے وزن کے برابر چاندی یا سونا غربا اور مساکین میں تقسیم کیا جاتا تھا۔ صاحب حیثیت عقیدے کی رسم بھی مونڈن والے دن ادا کرتے تھے۔

چلّا: چلّے کے معنی چالیس روز کے ہیں۔ زچہ دسویں دن نہاتی تھی تو اسے دسواں' بیسویں دن نہاتی تو بیسواں اور تیسویں دن نہاتی تو اسے چھوٹا چلّا اور چالیسویں روز نہاتی تو اسے بڑا چلّہ کہتے تھے۔ چلّے کے دن زچہ اور بچہ دونوں نہا دھو کر چکی کی میعاد سے فراغت پاتے تھے اور اسی روز زچہ اپنے میکے پاؤں پھیرنے جاتی تھی۔

مرنڈوں کی رسم: چونکہ مرنڈے مٹھیاں بند کر کے بناتے ہیں اور بچہ بھی ان دنوں مٹھیاں بند کرنا شروع کر دیتا ہے' لہٰذا اس نسبت سے اس رسم کا نام ہی مرنڈا رکھ دیا گیا۔ جب بچہ پانچ یا چھ مہینے کا ہو جاتا ہے اور ہاتھوں کی مٹھیاں بند کرنے لگتا تھا تو نانی کے ہاں سے گندم کے یا مُرمُروں کے مرنڈے یا حیثیت کے مطابق موتی چور کے لڈو آتے اور رشتہ داروں میں بانٹے جاتے۔

دانت نکلنے کی رسم: جب بچے کے دانت نکلنے شروع ہوتے تو پھولپھیاں کھوپرا چبا کر اس کے منہ میں پھونکتی تھیں اور اس کا انہیں نیگ دیا جاتا تھا۔ عورتوں کا خیال تھا کہ کھوپرا چبا کر بچے کے منہ میں ڈالنے سے دانت آسانی نکل آتے ہیں۔

سالگرہ: ہر سال تاریخ ولادت کا خیال رکھ کر رشتہ داروں اور احباب کو ضیافت دی جاتی تھی اور ایک ڈوری میں ایک گرہ کا اضافہ کر دیا جاتا۔ یہ ڈوری مستقل ماں اپنے پاس رکھتی ہے۔ مسلمانوں کی عمر شماری کا یہی طریقہ تھا کہ ڈوری میں ایک نئی گانٹھ لگا دی جاتی۔ آج کل عمر کے مطابق جلتی موم بتیوں کو پھونک مار کر بجھایا جاتا ہے۔ یہ رسم مسلمانوں میں عیسائیوں سے آئی ہے۔

دودھ بڑھانا: مختلف حالات کے پیش نظر بچے کے دودھ بڑھانے کا وقت متعین تھا۔ ضرورت اور وقت کے تقاضے کے مطابق بچے کا دودھ بڑھایا جاتا ہے۔

رسم ختنہ: یہ ایک شرعی رسم ہے' لیکن اس رسم کے ساتھ ہندی مسلمانوں نے دوسری رسمیں بھی اپنا لی تھیں۔ مثلاً جس بچے کی رسم ادا ہونی ہوتی تو اسے پہلے شادی میں مائیوں کی طرح زرد کپڑے پہناتے' گھوڑے پر چڑھاتے اور اسے فرضی دولہا بناتے تھے۔ تراشی ہوئی کھال ایک کپڑے کی دھجی میں بچے کے بائیں پاؤں میں باندھ دیتے تھے تاکہ کسی کا پر چھاواں نہ پڑے۔ جب بچے کا زخم اچھا ہو جاتا تو پاؤں میں سے کھال کھول کر پھینک دیتے تھے اور اس کے بعد گھوڑے چڑھانے کی رسم ادا ہوتی تھی۔

گھوڑی چڑھانا: اس دن پھر رشتے دار اور کنبے کے لوگ جمع ہوتے' بچے کو نہلاتے' نیا جوڑا زیب تن کراتے اور اسے دولہا بناتے تھے۔ لڑکے کو گھوڑے پر چڑھا کر باجے گاجے کے ساتھ کسی بزرگ کے مزار پر لے جاتے۔ دہلی والے جامع مسجد کے اندر آثار شریف میں بچے کو لے کر سلام کراتے اور ملیدہ چڑھاتے تھے۔ دوسرے علاقوں میں کسی بزرگ کے مزار یا مسجد میں لے جا کر یہ رسم ادا کی جاتی تھی۔ پھر رات کو مہمانوں کی ضیافت ہوتی اور رقص و سرور کی محفل بھی ہوتی تھی (راقم السطور کو گھوڑی پر چڑھا کر پہلے مسجد میں' پھر پیر جالی شہید کے مزار پر لے جایا گیا تھا جو ہمارے قصبے کے باہر ڈیڑھ دو میل کے فاصلے پر تھا۔ آدھی رات تک رقص و سرود کی محفل ہوئی۔ آدھی رات سے فجر کی اذان تک قوالی ہوئی۔ رقاصہ اور قوال دونوں دہلی سے بلائے گئے تھے)

ناک کان چھدوانے کی رسم: لڑکیوں کے کان اور ناک چھدوائی جاتی تھی تاکہ وہ زیورات کا استعمال کر سکیں۔ اس موقع کی رسم کے مطابق کھوپرا اور مصری رشتہ داروں میں تقسیم کی جاتی تھی کن بندھے یعنی کان چھیدنے والے کو' جو عام طور پر ہندو ہوتے تھے' اس کا نیگ دیا جاتا تھا۔

رسم بسم اللہ: ہندوؤں کے ہاں یہ رسم تھی کہ جب لڑکے کی عمر چار سال کی پوری ہو جاتی اور پانچواں سال شروع ہوتا تو ساے پاٹھ شالا (مکتب) بھیجا جاتا تھا۔ مسلمانوں میں بھی یہ رسم اب تک پائی جاتی ہے کہ جب بچہ چار سال چار ماہ اور چار دن کا ہو جاتا ہے تو اسے نہلا دھلا کر نئے کپڑے پہنائے جاتے ہیں اور مسجد کے مدرسے میں داخل کرایا جاتا ہے۔

مونچھوں کا کونڈہ: جب لڑکے کی عمر سترہ یا اٹھارہ برس کی ہو جاتی اور اس کی مسیں بھیگنے لگتی تھیں تو مونچھوں کا کونڈہ کیا جاتا تھا' یعنی پیغمبر صاحب کی نیاز بطور شکرانہ دلوائی جاتی تھی' کیونکہ لڑکا سلامتی سے سن بلوغت کو پہنچ گیا تھا۔ یہ نیاز سوئیوں پر ہوتی تھی۔

رتجگا: شب بیداری' جس میں رات بھر بیدار رہ کر عبادت کی جاتی ہے۔ ہندوستان کی مسلمان عورتوں نے خوشی کی تقریبات کے موقعوں پر رات بھر جاگنے اور نیاز دلوانے کا نام رتجگا رکھ لیا ہے۔ لکھنؤ میں اس کو ''خدائی رات'' بھی ہے۔ رتجگا پانچ تقریبات یعنی چھٹی' دودھ چھٹائی' سالگرہ' بسم اللہ خوانی اور بیاہ کے موقعوں پر بالخصوص عمل میں آتا تھا۔ اس موقع پر ساری رات گلگلے تلے جاتے تھے۔ نیاز دلوائی جاتی تھی۔ بی بی فاطمہ کی نیاز بھی اس کے ساتھ خشکے یا زردے پر دلوائی جاتی تھی۔ بی بی کی نیاز میں سات قسم کی ترکاریاں اور سات ہی قسم کے میوے رکھے جاتے تھے۔ نیاز کا کھانا کورے برتنوں میں نکالا جاتا تھا۔ بی بی کی نیاز کے لئے سوا پانچ سیر چاول پکائے جاتے تھے۔ اس پر ڈھائی سیر کھانڈ اور ڈھائی سیر دہی ڈالا جاتا تھا۔ مسی' تیل' سُرمہ' مہندی' کلاوہ' صندل اور پانچ آنے چراغ کے بھی رکھے جاتے تھے۔ نیاز کا کھانا صرف باعصمت عورتیں کھاتی تھیں۔

شادی بیاہ کی رسمیں

ہندی نژاد مسلمان اور ان کی عورتیں نہ صرف برعظیم کی پرانی ہندووانہ رسموں کے گرویدہ تھے بلکہ ان رسموں میں اپنی طرف سے اضافہ کرنے کی خواہش بھی ان میں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔ اس وجہ سے مسلمان ہونے کے بعد وہ ہندوستانی رسم و رواج اور عادات و اطوار کو اس

سختی سے اپنائے رہے کہ انہیں اس بات کا خیال تک بھی نہ رہا کہ اسلام اور اسلامی تمدّن و معاشرت سے ان رسوم کا دور کا بھی تعلق نہیں۔

شادی کے معاملے میں لڑکی اور لڑکے کو کسی قسم کی آزادی حاصل نہ تھی اور دونوں عقد سے پہلے ایک دوسرے کو دیکھ بھی نہیں سکتے تھے۔ شادی عام طور پر پیشہ ور عورتوں کے توسط سے ہوتی تھی' مگر اکثر گھرانوں میں بزرگ اور تجربہ کار عورتیں اپنی لڑکوں اور لڑکیوں کے لئے خود مناسب رشتہ تلاش کرتی تھیں۔ طرفین ایک دوسرے کے حسب نسب' چال چلن اور آمدنی وغیرہ کے بارے میں پوری معلومات حاصل کرتے تھے اور اس کے بعد رشتے پر غور کیا جاتا تھا۔ بعض مرتبہ ایسا بھی ہوتا تھا کہ اگر نجیب الطرفین بَر نہیں ملتا تھا (خصوصاً یہ عادت سیّدوں میں تھی اور اب بھی ہے) تو تیس تیس' چالیس چالیس سال کی عمر تک لڑکی کو بٹھائے رکھتے تھے' لکہ بعض تو اس امید میں بوڑھی ہو کر بن بیاہی مر جاتی تھیں۔ حالانکہ اسلام کا دین اور تمدّن مساوات کا حامی ہے اور اس میں حسب نسب کو کوئی اہمیت نہیں دی گئی' لیکن ہندی مسلمانوں میں حسب نسب اور ذات پات کا خصوصی جذبہ اس لئے کارفرما تھا اور ہے کہ ہندی الاصل ہونے کی بناء پر ذات پات کے پابند ایک سخت ساج سے نکل کر مسلمان ہوئے تھے۔ مسلمان ہونے کے بعد بھی اپنے دیرینہ ہندو ساجی سانچے سے باہر نہ نکل سکے اور اسلام کا رنگ ان کے شعور اور لاشعور پر پوری طرح نہ چڑھ سکا' اس لئے مسلمانانِ ہند کی معاشرت میں ذات پات کی تفریق گھلی ہوئی ہے جس کو اس لئے بھی نہیں مٹایا جا سکا کہ خود اسلام میں فرقہ پرستی او مسلک نوازی کی لعنت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ شادی بیاہ سے متعلق چند رسوم کا احوال حاضر خدمت ہے:۔

منگنی کی رسم: رشتہ طے ہو جانے کے بعد منگنی کی رسم ہوتی تھی' ہوتی ہے۔ اس رسم کو منگیوا' منگنی اور روپنا بھی کہتے تھے اور شہروں میں نسبت سے موسوم کرتے تھے۔ اس رسم کے مطابق دولہا کے ہاں سے چند مرد اور عورتیں دلہن کے گھر مٹھائی کے خوان اور چڑھاوا لے کر جاتی تھیں۔ اسی دن یا اس کے بعد دلہن کی طرف سے چند آدمی مٹھائی اور مصری کے کوزے' پان کے بیڑے' انگوٹھی اور چھلا' پھولوں کی بدھی اور طرہ وغیرہ لے کر دولہا کے گھر آتے اور نشان چڑھا کر چلے جاتے۔ منگنی کی رسم میں انگوٹھی بڑی اہمیت رکھتی تھی۔ منگنی کے بعد شادی تک ہر تہوار کے موقع پر لینے دینے کی رسمیں عمل میں آنے لگتی تھیں' مثلاً شب برات کو دولہا کے یہاں سے دولہن کے لئے آتش بازی' مہندی' چوڑیاں' مٹھائی کے خوان جاتے تھے۔ اسی طرح دولہا کے لئے بھی آتش بازی اور مٹھائی وغیرہ آتی۔ دوسرے تیوہاروں کے خوان جاتے تھے۔ اسی طرح دولہا کے لئے بھی آتش بازی اور مٹھائی وغیرہ آتی۔ دوسرے تہواروں مثلاً رمضان' عید' بقرعید' محرم وغیرہ کے موقعوں پر چیزوں کا تبادلہ ہوتا تھا (اور ہوتا ہے)

لگن دھرنا: جب طرفین شادی کی تیاریاں مکمل کر لیتے تو پھر شادی کی تاریخ مقرر کی جاتی جسے لگن دھرنا کہتے تھے۔ دولہا کی ماں' بہنیں اور قریبی رشتہ دار عورتیں مٹھائی کے خوان ساتھ لے کر دلہن کے گھر جاتیں اور تاریخ ٹھہرا کر واپس چلی آتیں۔ اگر خدانخواستہ شادی کے دن یا بعد میں کوئی حادثہ پیش آ جاتا تو یہی وہم ہوتا تھا کہ یہ سب کچھ ساعتِ بد اور منحوس گھڑی کی تاریخ رکھنے کی وجہ سے ہوا تھا۔

مائیوں بٹھانا: شادی کی تاریخ مقرر ہونے کے بعد چند روز پہلے دلہن کو زرد کپڑے پہنا کر مائیوں بٹھاتے تھے اور لڑکے کو صرف ایک دو روز پہلے۔ اس موقع پر رشتے کی عورتیں جمع ہوتی تھیں اور دلہن کے کپڑے زرد رنگ میں رنگے جاتے تھے اور اسے نہلا دھلا کر اور سر کی چوٹی گوندھ کر مائیوں بٹھایا جاتا تھا۔ اسی دن سے نوجوان لڑکیاں اور عورتیں سہاگ گھوڑیاں گانا شروع کر دیتی تھیں۔ یہ رسم زیادہ تر پنجاب میں ہوتی تھی۔

اُبٹنا کھیلنا: دولہا دلہن کو مائیوں بٹھانے کے بعد اندر عورتوں اور باہر مردوں میں اُبٹنا کھیلا جاتا تھا۔ اس موقع پر بالکل ہولی کی رنگ پاشی کا سماں ہوتا تھا۔ دلہن کے رشتے دار دلہن کے ہاں اور دولہا والے دولہا کے ہاں اُبٹنا کھیلتے تھے۔ اس کے برخلاف دہلی کے قلعۂ معلّی میں دولہا والے دلہن کے ہاں اور دلہن والے دولہا کے ہاں اُبٹنا کھیلنے جایا کرتے تھے۔

ساچق: رسم مہندی کا نام ساچق ہے جو حنابندی سے ایک روز پہلے منائی جاتی تھی۔ حنابندی کا طریقہ یہ تھا کہ دلہن کے گھر سے دولہا کے لئے مہندی اسی صورت میں لاتے تھے کہ آرائش کے تختے جو ساچق کے روز دولہا کے گھر سے جاتے تھے' دلہن والوں کے ہاں چھوڑ دیئے جاتے۔ مہندی پہنچنے کے بعد دولہا کو زنان خانے میں بلاتے تھے تاکہ رشتے کی سالیاں اس کے ہاتھوں میں مہندی لگائیں۔ دولہا کے لئے ضروری تھا کہ کچھ روپے بطور نیگ دے۔ مہندی کے ساتھ دولہا کے لئے وہ جوڑا بھی بھیجا جاتا تھا جو وہ شادی کے دن پہن کر دلہن بیاہنے جاتا تھا۔ اس جوڑے میں عموماً عہد مغلیہ کے درباری وضع کا خلعت' شیروانی' شملہ' چیرہ' سرپیچ اور مرصع کلغی ہوتی تھی۔ موتیوں کا ہار اور سہرا بھی ہوتا تھا۔ قیام پاکستان کے بعد رسم حنابندی' رسم نکاح سے بھی زیادہ دھوم دھام سے اور زرِ کثیر کے اصراف سے منائی جاتی ہے۔

دولہا کی تیاری اور برات کی روانگی سے قبل بہت سی رسمیں ادا ہوتی تھیں:۔

بندھوار: دولہا دلہن کے گھروں کے دروازں پر آم کے پتوں کی مالائیں بنا کر شگون کے لئے آویزاں کرتے تھے۔

منڈوا: لڑکے کو دولہا بنانے اور عروسی لباس پہنانے سے قبل منڈوے کے نیچے بٹھا کر نہلایا جاتا تھا اور یہ فرض نائی انجام دیتا تھا جو میراثی کہلاتا تھا۔ نہانے سے قبل جو لباس دولہا کے جسم پر ہوتا تھا' وہ نائی کو دے دیا جاتا تھا۔

تیل چڑھانا: غسل سے پہلے نائن نوشہ کے جسم پر تیل ملتی تھی۔ اس کے بعد گرم پانی سے نوشہ کو نہلایا یا دھلایا جاتا تھا۔

کنگن باندھنا: دولہا اور دلہن کی بائیں کلائی میں کنگن باندھا جاتا تھا۔ اس کو شادی کا ڈورا بھی کہا جاتا تھا۔

سہرا: دستور کے مطابق دولہا کا شادی کا جوڑا دلہن کے گھر سے آتا تھا اور اب بھی آتا ہے' اور یہی جوڑا پہن کر وہ شادی کے لئے جاتا تھا۔ اس زمانے میں جوڑے کا رنگ زرد ہوتا تھا۔ سہرا باندھنے کے بعد نوشہ کے گلے میں پھولوں کے ہار اور گجرے ڈالے جاتے تھے۔ سر پر کلاہ یا پگڑی اور کندھوں پر شال ہوتی تھی۔

دھنگانا: جب دولہا دلہن کے گھر کے دروازے پر پہنچتا تھا تو اس موقع پر دلہن کے بھائی یا دوسری قریبی رشتہ دار یا نوکر چاکر دولہا کو بہ جبر آگے بڑھنے سے روکتے تھے اور اپنا نیگ طلب کرتے تھے۔ اس موقع پر دولہا حسب حیثیت کچھ نقدی یا تحفہ دیا کرتا تھا۔ اس رسم کو دھنگانا کہتے تھے اور جو رقم دی جاتی تھی' اس کو نیگ کہتے تھے۔ یہ رسم ہندوؤں میں زمانہ قدیم سے چلی آ رہی ہے جو ہندی مسلمانوں اور پاکستانیوں میں بھی راسخ ہو چکی ہے۔

نکاح کے بعد دولہا کو زنان خانے میں بلایا جاتا تھا اور وہاں بہت سی زنانہ رسمیں عمل میں آتی تھیں:۔

آرسی مصحف: اس رسم کے مطابق دولہا دلہن کو سر جوڑ کر آمنے سامنے بٹھا دیا جاتا تھا۔ بیچ میں تکیے پر قرآن شریف رکھ کر دولہا سے سورۂ اخلاص نکال کر پڑھنے اور دلہن کے منہ پر پھونکنے کو کہا جاتا تھا۔ قرآن شریف پر آئینہ رکھ کر دولہا اور دلہن دونوں کے اوپر ڈال دیا جاتا تھا' مقصد یہ تھا کہ دولہا اپنی دلہن کا رُوئے مبارک دیکھ لے۔

رخصتی: رخصتی کے وقت طرح طرح کے ٹونے اور ٹوٹکے عمل میں آتے تھے تاکہ اللہ دولہا اور دلہن کو نظر بد سے محفوظ رکھے۔ اس موقع پر بالعموم دلہن کا بھائی اسے اپنی گود میں اٹھا کر پالکی یا ڈولی پر سوار کراتا تھا' مگر کسی کسی جگہ دولہا خود ہی دلہن کو سوار کراتا تھا۔ دولہا کے گھر والے

دلہن کی ڈولی یا پالکی کے اوپر سکے نچھاور کرتے چلتے تھے۔ آج کل موٹر کار نے پالکی کی جگہ لے لی ہے اور سکوں کی بارش ایک ہی دفعہ ہوتی ہے۔

جہیز: جہیز دلہن والوں کی حیثیت پر موقوف تھا۔ لیکن بعض فرقوں کے مسلمان جہیز نہیں دیتے تھے اور دلہن کے گھر سا چق بھی نہیں بھیجتے تھے اور نکاح میں یا شب عروسی کو یا حنابندی کے موقع پر شربت پلانے کے بعد براتیوں سے نیوتہ یا نیگ بھی نہیں لیتے تھے' کیونکہ یہ لوگ فرط غیرت سے ان کاموں کو برا خیال کرتے تھے۔ شادی کے بعد لاکھ دو لاکھ' جو کچھ بھی ان کو میسر ہوتا تھا' نقد اور جنس کی صورت میں داماد کو پہنچا دیتے تھے' لیکن داماد کے ساتھ جہیز نہیں بھیجتے تھے' تاکہ دکانداروں' راہ گیروں اور دوسرے تماشائیں گھروں کی چھتوں سے جہیز کا سامان نہ دیکھیں۔ وہ جہیز کی نمائش کو پسند نہیں کرتے تھے۔ آج کل جہیز کی نمائش رسم شادی کا ضروری جز بن چکا ہے۔ ظاہر پرست معاشرے میں ایسا ہی ہوتا ہے۔

واپسی برات: جب برات واپس دولہا کے گھر پہنچتی تھی تو خوشی کے شادیانے بجتے تھے اور ڈومنیاں پہلے ہی پہنچ کر بنڑے گانا شروع کر دیتی تھیں۔ یہ گانے شادی بیاہ کے خاص گیت ہوتے ہیں۔ شور وغل میں دلہن کو پالکی (موٹر کار) سے اتارا جاتا۔ بعض خاندانوں میں خود دولہا ہی اسے گود میں لے کر اتارتا تھا اور بعض خاندانوں میں دولہا کی ماں بہنیں اتارتی تھیں۔ اندر گھر میں لے جا کر اسے مسند پر بٹھا دیا جاتا تھا اور دولہا اس کے دامن پر نماز شکرانہ ادا کرتا تھا۔ دلہن کے پاؤں دھلا کر پانی مکان کے چاروں کونوں میں ڈال دیا جاتا تھا۔

رونمائی: یہ رسم اب بھی ہوتی ہے۔ اس موقع پر عورتیں اور رشتے کے مرد روپیہ یا زیور یا کوئی اور تحفہ دے کر دلہن کا منہ دیکھتے ہیں۔

ولیمہ: ولیمے کی حیثیت شرعی ہے' لیکن اس موقع پر کھانا کھلانے کے جو طریقے رائج ہو گئے تھے' وہ سب کی سب ہندووانہ تھے۔ قیام پاکستان کے بعد تو ولیمے پر اس قدر بے جا اصراف ہونے لگا کہ حکومت کو اس پر کچھ حدود عائد کرنا پڑے۔

چوتھی: شادی کی رسموں میں چوتھی کی رسم آخری سمجھی جاتی تھی۔ جب شادی کے چار دن گزر جاتے تو دلہن کے گھر والے بیٹی کو واپس لینے آتے تھے۔ اس موقع پر مہمانوں کی خاطر تواضع ہوتی تھی اور دونوں خاندانوں کے افراد ہولی کھیلتے تھے اور پھل ترکاریوں سے ایک دوسرے کو مارتے تھے۔ شادی کے بعد ابتدائی زمانے میں دلہن بہت دنوں تک مسلسل سسرال میں نہیں رہتی تھی' بلکہ کبھی سسرال میں اور کبھی میکے میں۔ اکثر عزت دار لوگ' ہندوؤں کی تقلید میں مسلمان بھی جب اس شہر یا قصبے یا گاؤں میں وارد ہوتے' جس میں ان کی بیٹی بیاہی ہوتی تو وہاں کسی کے گھر پانی تک نہیں پیتے تھے۔ بیٹی کے ہاں آنا جانا اور کھانا پینا معیوب خیال کیا جاتا تھا۔

موت کی رسمیں

جب کسی شخص کی روح کے پرواز کرنے کا وقت آتا تو اس کو چارپائی سے اتار کر زمین پر لٹا دیا جاتا۔ وفات کے بعد بری طرح سے سوگ منایا جاتا تھا۔ شاہ اسماعیل شہید نے اس وقت کی رسوم مرگ کے بارے میں لکھا ہے کہ جب کوئی مر جاتا تو لوگ خصوصاً اس کے رشتہ دار چلا چلا کر روتے پیٹتے تھے۔ عورتیں اپنا سر پیٹتی اور آہ و بکا کرتی تھیں۔ پھر جو عورت پرسے کو آتی' وہ بھی اس کے ساتھ رونے پیٹنے میں شریک ہو جاتی۔ پھر کسی کے ہاں تین دن تک' کسی کے ہاں سات دن تک' کسی کے ہاں چالیس دن تک اور کسی کے ہاں چھ' چھ ماہ تک یہی معمول رہتا تھا کہ عورتیں حلقہ بنا کر کھڑی ہو جاتیں اور ایک عورت اس مرحوم کے اوصاف حمیدہ بیان کرتی جاتی کہ وہ ایسا تھا اور ایسا تھا تو وہ سب عورتیں اپنے زانوؤں اور اپنے منہ پر طمانچے مارتیں اور ہائے ہائے کرتیں۔ بعض گھروں میں تو یہاں تک ہوتا تھا کہ ہر صبح و شام عورتیں اکٹھا بیٹھ کر چلا چلا کر روتیں۔

جس عورت کا شوہر مر جاتا تھا' پھر وہ بقیہ زندگی رنگین' سرخ' کپڑے اور نتھ وغیرہ زیور جو سہاگ کی نشانی ہوتے تھے' نہیں پہنتی تھی اور خوشبو کا استعمال بھی نہیں کرتی تھی اور گھر میں بوریا یا چٹائی یا دری وغیرہ بچھا کر عورتیں اُس پر رہا کرتی تھیں۔ بعض کے ہاں چالیس دن اور بعض کے ہاں چھ ماہ تک یہ فرش بچھا رہتا۔ ان سوگ کے دنوں میں کسی کا نکاح یا عقیقہ وغیرہ نہیں ہوتا تھا۔ عورت اور مرد دونوں مدتوں سوگ کی حالت میں رہتے تھے۔ کوئی سرخ اور شوخ کپڑا نہیں پہنتا تھا۔ سرمہ نہ لگاتا' پان نہ کھاتا' خوشبو نہ لگاتا۔ عورتیں چوڑیاں نہ پہنتیں' کپڑے نہ بدلتیں۔ گھر یا رشتہ داروں میں کسی کے ہاں شادی نہ ہوتی۔ گھر میں کڑھائی نہ چڑھتی۔ پکوان نہ پکتے۔ بہت دنوں تک گوشت نہ پکتا۔ کوئی چارپائی پر نہ سوتا۔ پہلی برسی تک گھر میں سرکے کا اچار نہ پڑتا۔ بریاں اور سویاں نہ بنائی جاتیں۔

مندرجہ بالا رسموں کے علاوہ تیجا' دسواں' چالیسواں' چھ ماہی' برسی کی رسمیں ہوتی تھیں۔ عید اور شب برات کے دنوں میں مرنے والے کے غم کو تازہ کرنے کے لئے فاتحہ دلوائی جاتی ہے۔ آج کل تیجے کو سوم یا رسم قل بھی کہا جاتا ہے۔ اس موقع پر قرآن خوانی ہوتی ہے۔ چالیسویں کو چہلم کہا جانے لگا ہے۔ اس موقع پر تمام رشتہ داروں اور احباب کو مدعو کیا جاتا ہے اور دیگیں پکوائی جاتی ہیں۔ اگلی پچھلی باتیں بھی ہوتی رہتی ہیں اور قرآن خوانی بھی' جس کا قرآن فہمی سے کوئی تعلق نہیں ہوتا۔

قیام پاکستان کے بعد ایک طرف جہاں ہندوؤں (اور عیسائیوں کے بھی) اثرات کے تحت فضول' غیر اخلاقی' غیر اسلامی رسوم میں اضافہ ہو گیا ہے (مثلاً مہندی)' وہاں بعض حلقوں اور جماعتوں نے ان اثرات و رسوم کے خلاف اصلاحی کوششیں بھی کی ہیں۔ کراچی کی میمن برادری' انجمن سوداگران پنجابی اور تنظیم اسلامی کی اصلاحی کوششیں قابل ذکر ہیں۔ تنظیم اسلامی کے مؤسس ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اس ضمن میں باقاعدہ ایک سخت اصلاحی تحریک شروع کر رکھی ہے۔ ایک کتابچہ بھی شائع کیا ہے جس کا نام خاصا لمبا ہے یعنی ''شادی بیاہ کی تقریبات کے ضمن میں اتباع نبویؐ پر مبنی ایک اصلاحی تحریک مع خطبۂ نکاح کا ہماری معاشرتی زندگی سے تعلق''۔ اس کتاب کا خلاصہ ڈاکٹر صاحب نے ''حرف آخر'' کے عنوان سے کیا ہے جو یہاں نقل کیا جا رہا ہے:

''چند سال قبل سے مجھے احباب و رفقاء کے شدید تقاضے پر متعدد احباب کے یہاں شادی کے موقع پر نکاح پڑھانے کا اتفاق ہوا۔ میرا شروع ہی سے یہ معمول رہا ہے کہ خطبۂ نکاح کی غرض و غایت اور حکمت میں تقریر ضرور کیا کرتا تھا' جس میں اُن آیات و احادیث کی تشریح بھی ہوتی جو نکاح کے خطبۂ مسنونہ میں پڑھی جاتی ہیں۔ ساتھ ہی مروجہ (ہندووانہ) رسومات پر بھی تنقید ہوتی اور اصلاح کے لئے کچھ مشوروں اور نصیحتوں کا سلسلہ بھی جاری رہتا۔ نومبر 1973ء میں اپنے چھوٹے بھائی ابصار احمد سلمہ کی شادی کے موقع پر میں نے طے کیا کہ جن اصلاحات کی طرف میں لوگوں کو متوجہ کراتا ہوں' اُن پر خود عمل کر کے دکھاؤں' ورنہ ان باتوں کا کہنا چھوڑ دینا چاہئے۔ بقول علامہ اقبال:

یا سراپا نالہ بن' یا نوا پیدا نہ کر

چنانچہ پنجاب میں شاید یہ پہلی شادی تھی جو سنت نبویؐ کے مطابق انجام پائی۔ نکاح مسجد میں منعقد ہوا اور اُن تمام رسومات سے اجتناب اختیار کیا جو غیر اسلامی ہی نہیں' بلکہ خالص ہندووانہ ہیں۔

میں نے 1973ء کے اواخر ہی میں ماہنامہ ''میثاق'' میں لکھا تھا کہ کراچی میں بعض تجارت پیشہ برادریوں میں نکاح کی مجالس کے مساجد میں انعقاد کا معمول کافی عرصے

سے جاری ہے۔ تعجب کی بات ہے کہ کراچی سے جس بُرائی کا آغاز ہوتا ہے' اُسے لاہور یا پنجاب کے دور دراز گوشوں تک پہنچنے میں کوئی دیر نہیں لگتی' لیکن ایک اچھا کام جو کراچی میں عرصے سے ہو رہا ہے' اُس کے بارے میں یہاں تا حال سوچا بھی نہیں گیا۔ چنانچہ میں نے اپنے بھائی کا نکاح مسجد میں منعقد کر کے اور تمام غیر اسلامی رسومات سے اجتناب کر کے اصلاحی کام کا آغاز کر دیا ہے۔ نیز میں نے اس کے ساتھ "میثاق" میں اپنے اِن فیصلوں کا بھی اعلان کر دیا کہ میں آئندہ سے:۔

(ا) کسی بارات میں شرکت نہیں کروں گا' کیونکہ میرے محدود مطالعے کی حد تک بارات کا رائج الوقت طریقہ خالص ہندووانہ تصورات پر مبنی ہے۔

(ب) میں نکاح کے موقع پر کسی دعوتِ طعام میں شامل نہیں ہوں گا' کیونکہ خیر القرون سے اِس کا کوئی ثبوت نہیں ملتا۔ شادی کے ضمن میں لڑکے والوں کی طرف سے دعوتِ ولیمہ مسنونہ ہے' جس کا ثبوت ہی نہیں' بلکہ نبی کریمؐ کا تاکیدی حکم ملتا ہے۔

(ج) نکاح کی کسی ایسی تقریب میں شرکت نہیں کروں گا جو مسجد میں منعقد نہ ہو۔

الحمدللہ' میں اپنے اِن فیصلوں پر کاربند ہوں۔ میں آپ حضرات کو مخلصانہ مشورہ دوں گا کہ صرف نکاح کے مسجد میں انعقاد پر اکتفا نہ کیجئے' بلکہ معاشرے سے شادی بیاہ کی اُن تمام رسومات کو ختم کرنے کی کوشش کیجئے جن کا اسلام سے سرے سے کوئی تعلق نہیں ہے اور جن کا طومار اور بوجھ ہم نے خود اپنے کاندھوں پر اٹھا رکھا ہے۔ شادی بیاہ کی اِن تمام مروجہ رسوم کی اصل ہندووانہ رسم و رواج ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے تو قرآن حکیم اور اُسوۂ رسولؐ کے ذریعے ہمارے کاندھوں سے بوجھ اتارے ہیں' جیسا کہ سورۂ اعراف کی آیت 157 میں اللہ تعالیٰ نے نبی اکرمؐ کے اوصاف بیان کرتے ہوئے فرمایا: اور (ہمارا یہ نبیؐ) لوگوں سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے اور وہ بندشیں کھولتا ہے جن میں وہ جکڑے ہوئے تھے"۔ پس نبی اکرمؐ کا احسان عظیم یہ ہے کہ آپ نے دین کو آسان سے آسان بنایا ہے۔ آپؐ نے ہدایت دی یسروا ولا تعسروا "آسانیاں پیدا کرو' مشکلات پیدا نہ کرو"۔ لیکن ہم ہیں کہ مشکل پسند بن گئے ہیں۔ ہم نے شادی بیاہ کی تقریب میں لاتعداد اضافی رسوم کو اختیار کر رکھا ہے۔ جس سے شادی ایک بے انتہا گراں مسئلہ بن گیا ہے۔ وجہ اس کی یہ ہے کہ توارث اور برادریوں کے میل جول سے جو ہندووانہ رسوم ہمارے ہاں جاری ہیں' اُن کو چھوڑنے کے ہم تیار نہیں۔ ہندوستان میں جن برادریوں اور خاندانوں نے اسلام قبول کیا' وہ اپنے ساتھ ہی اپنی رسوم بھی لائے اور اُن کو چھوڑنے کی بجائے اُن کے نام بدل دیئے اور اُن کو جاری رکھا اور اب تک جاری رکھے ہوئے ہیں۔ سننے میں آیا ہے اور میں نہیں کہہ سکتا کہ اِس بات میں کہاں تک حقیقت ہے کہ قیامِ پاکستان سے قبل میو قوم میں میوات کے بعض علاقوں میں نکاح کے موقع پر مولوی صاحب آ کر نکاح بھی پڑھاتے اور پھر پنڈت جی آ کر پھیرے بھی ڈلواتے تھے تاکہ پکا کام ہو جائے۔ آخر نسلاً بعد نسل جو چیز دلوں میں بیٹھی ہوئی تھی تو اس وجہ سے اُن کا اطمینان نہیں ہوتا تھا کہ صرف دو بول کہنے سے بندھن بندھ گیا۔ اسی لئے وہ دولہا دولہن کے کپڑوں میں گرہ لگا کر اگنی کے سات پھیرے بھی لگواتے تھے اور اس طرح اُن کو اطمینان ہوتا تھا کہ اب معاملہ مضبوط ہو گیا ہے۔

لیکن جائزہ لیجئے کہ بعینہٖ یہی حال ہمارا ہے۔ نکاح حضورؐ کے طریقے پر ہو' لیکن بارات کا طومار ہے' جہیز کا انبار ہے۔ رسومات ایک سے ایک بڑھ چڑھ کر۔ جو لوگ صاحبِ ثروت ہیں' وہ اپنی دولت و ثروت اور امارت کے اظہار کے لئے پُرانی رسموں ہی پر اکتفا نہیں کرتے' بلکہ نئی نئی رسوم اور بدعات ایجاد کرتے رہتے ہیں۔ اس معاملے میں اُن کا ذہن بڑا زرخیز ثابت ہوتا ہے' حالانکہ اِن تمام رسومات کی نبی اکرمؐ کی سنت اور صحابہ کرامؓ کے تعامل میں کوئی بنیاد نہیں۔ کراچی کی بعض برادریوں نے چند اصلاحی اقدامات کئے ہیں' مجھے یہ عرض کرنے پر معاف کیا جائے کہ ان اصلاحی اقدامات کا اصل محرک دین کی تعلیمات پر عمل کرنے کے جذبے سے زیادہ معاشرتی مجبوریاں تھیں' جن کی بنیاد پر فیصلے کئے گئے کہ نکاح مسجد میں ہو اور بارات کا تصور ختم کر دیا جائے' لڑکی والوں کے ہاں دعوت نہ ہو وغیرہا۔ لیکن مجھے معلوم ہوا ہے کہ چور دروازے کھلے ہوئے ہیں۔ بیٹی والا مہندی کی دعوت اور استقبالیہ وغیرہ کے نام سے اب تک پرانی رسوم کو زندہ کئے ہوئے ہے۔ رسم پرستی کا جو بُت دل کے سنگھاسن پر براجمان ہے' وہ اپنی اطاعت ضرور کرائے گا اور اس کا کسی طرح ظہور ضرور ہوگا۔ پھر دوسری رسوم بھی جوں کی توں باقی ہیں' بلکہ اِن میں کچھ اضافہ ہی ہوتا رہتا ہے' حالانکہ ہمارے دین نے صرف ولیمہ کی دعوت کی تاکید کی ہے۔ نبی کریمؐ نے فرمایا' ولیمہ ضرور کیا کرو اور جس کو ولیمے میں بلایا جائے' وہ اس میں ضرور جائے۔ اس کی حکمت پر آپ جب غور کریں گے تو خود اس نتیجے پر پہنچیں گے کہ شادی لڑکے والوں کے لئے اصلاً خوشی کا موقع ہوتا ہے۔ ایک نئے خاندان کی تاسیس ہو رہی ہوتی ہے۔ لڑکی والوں کے لئے بلاشبہ اِس لحاظ سے تو خوشی کا مقام ہے کہ وہ بیٹی کے فرض سے سبکدوش ہو رہے ہیں' لیکن نگاہِ حقیقت سے دیکھئے تو بیٹی والوں کے لئے تو یہ بڑی آزمائش کا وقت ہوتا ہے۔ بچی کو پالا پوسا' اُس کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کیا اور پھر جوان ہونے پر دوسرے خاندان کے حوالے کر دیا۔ ہزار دیکھ بھال لیا ہو' معلومات کر لی ہوں' اطمینان کر لیا ہو' لیکن یہ اندیشے پھر بھی لاحق رہتے ہیں اور یہ دھڑکا لگا رہتا ہے کہ نہ معلوم آگے کیا ہوگا۔ مزاج ملیں گے یا نہیں' موافقت ہو گی یا نہیں' پتا نہیں سُسرال والوں کا سلوک کیسا ہوگا۔ یہی وجہ اکثر بچی کی الوداعی کے وقت ماں کی ہچکیاں لگی ہوتی ہیں' بہنیں پچھاڑے کھا رہی ہوتی ہیں اور باپ اور بھائیوں کی آنکھیں آنسوؤں سے نم ہوتی ہیں۔

وقت کی اہم ضرورت ہے کہ رسومات کا جو بُت دلوں میں چھپا بیٹھا ہے' اُس کو پوری طرح مسمار کیا جائے۔ اس لئے میں آپ حضرات سے عرض کروں گا کہ اس بات پر غور کریں کہ ہمارے سامنے شادی بیاہ کے لئے اصل معیار کیا ہے؟ مسلمان ہونے کی حیثیت سے ہمارے لئے اصل معیار صرف یہ ہے کہ کیا چیز نبی اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے: ما انا علیہ واصحابی اس کا مفہوم یہ بھی ہے کہ جو چیز نبی اکرمؐ اور صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے' وہ سر آنکھوں پر اور جو چیز ثابت نہیں' اُس کو پاؤں تلے روندنے کے بجائے' اگر ہم نے بسر و چشم قبول کیا تو اچھی طرح جان لیجئے کہ دین کے ساتھ ہمارا تعلق مخلصانہ نہیں اور ہمیں اس تعلق کو درست کرنے کی فکر کرنی چاہئے۔

شعبہ سمع و بصر کی پیشکش

محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب

کی ایک نہایت اہم تقریر

"قائد اعظم اور علامہ اقبال کا نظریہ پاکستان"

جس میں وضاحت کی گئی ہے کہ

- نظریہ پاکستان اصل میں کیا ہے۔
- قائداعظم کا نظریہ پاکستان کیا ہے۔
- علامہ اقبال کا نظریہ پاکستان کیا ہے۔
- برعظیم پاک و ہند میں نظریہ پاکستان کا ارتقاء کیونکر ہوا؟

اب VCD میں دستیاب ہے

قیمت =/80 روپے

ملنے کا پتہ: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن

36 کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔ فون 03-5869501

www.tanzeem.org e-mail: info@tanzeem.org

19

ہندوستان میں احیائے اسلام کی تحریکیں

گزشتہ باب میں بیان ہو چکا ہے کہ برطانوی سامراج یعنی تیسری قوم انگریز کی آمد سے قبل برعظیم میں دو بڑی قومیں ہندو اور مسلمان آباد تھیں' لیکن کوئی دوقومی نظریہ موجود نہ تھا۔ نفاذِ شریعت کے ضمن میں جتنی بھی انفرادی یا اجتماعی کوششیں ہوئیں' وہ مسلمان بادشاہوں اور مسلمان علماء کا باہمی معاملہ تھا' جس میں کسی دوسری قوم سے کوئی تعرض تھا نہ کسی قوم کو مسلمانوں کے باہمی معاملات میں دخل اندازی کی اجازت تھی نہ جرأت۔ لیکن اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد جب سلطنت مغلیہ زوال آمادہ ہوئی' تو اگرچہ وہ سلطنت ''ملوکیت'' کی نمائندہ تھی' اسلام کی ترجمان نہ تھی' پھر بھی اسلام کا نام اور بھرم قائم تھا۔ اب مسلمانانِ ہند کو مذہبی' معاشرتی' اقتصادی طور پر ضعف شروع ہوا۔ ڈیڑھ صدی پر محیط اس دورِ زوال میں جہاں چند دردمند مسلمان بزرگوں نے تجدید و احیائے اسلام کا علم بلند رکھا' وہاں آنے والی تیسری طاقت ''برطانوی سامراج'' کے خلاف بھی شدید مزاحمت کی۔

[''ندائے خلافت'' میں پوری دنیائے اسلام میں گزشتہ ڈھائی تین سو سال میں رونما ہونے والی احیائے اسلام کی تحریکوں کی تاریخ قسط وار شائع ہو رہی ہے۔ یہ تاریخ بھی راقم السطور (سید قاسم محمود) رقم کر رہا ہے۔ ''تاریخ'' کا آغاز ہندوستان میں چلنے والی تحریکوں سے ہوا ہے۔ ''تاریخ'' میں ان تحریکوں کا تذکرہ قدرے تفصیل سے ہو رہا ہے۔ یہاں اُن کی خلاصہ پیش ہے۔]

حضرت شاہ ولی اللہ کی تحریک

حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ بارھویں صدی کے مجدد اور علم و فضل کے بحرِ ناپیدا کنار تھے۔ وہ اللہ تعالیٰ کے ان خاص بندوں میں سے تھے جنہیں وہ خالص دینی اغراض کے لئے مامور فرماتا ہے۔ چنانچہ انہوں نے نہایت تحدی سے دعویٰ کیا کہ میں اس صدی کا مجدد ہوں اور خداوند تعالیٰ نے مجھے اس منصب پر فائز کیا ہے۔ ایک اور مقام پر اپنی تصنیف ''فیوض الحرمین'' میں اپنی ایک رویا بیان کرتے ہیں کہ ''میں قائم الزماں ہوں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کا منشا کسی ایسے نظام کو قائم کرنا ہوتا ہے جس کا مقصد خیر و فلاح ہو تو وہ اس مقصد کے حصول کے لئے مجھے ذریعہ بناتا ہے''۔

ظاہر ہے کہ جس شخص کا یہ دعویٰ ہو' وہ مسلمانوں کی بربادی کا خاموش تماشائی نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک طرف انہوں نے مسلمانوں کی اخلاقی کمزوریاں دُور کرنے اور انہیں حقیقی مسلمان بنانے کے لئے ''فتح الرحمان'' کے نام سے قرآن حکیم کا فارسی زبان میں ترجمہ کیا اور حواشی لکھے تاکہ وہ لوگ جو عربی نہیں جانتے قرآن حکیم کی پاکیزہ تعلیم سے فیضان حاصل کر سکیں۔ اس کے بعد آپ نے قرآن حکیم کا درس دینا شروع کیا تاکہ اس ذریعے سے بھی مسلمانوں کو معلوم ہو جائے کہ ان کی پستی اور انحطاط کا اصل سبب قرآن حکیم کی تعلیم سے غفلت ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے بیعت لینے کا بھی سلسلہ شروع کیا' اس طرح آپ نے پاکیزہ خیال اور پاکیزہ کردار مسلمانوں کی ایک جماعت تیار کی تاکہ وہ آپ کے مقاصد کے لئے کام کر سکے۔ اس سلسلے میں آپ نے متعدد دینی موضوعات پر جو مفید لٹریچر تخلیق کیا' اسے بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

آپ برصغیر کے علمائے ربانی میں وہ ممتاز اور اہل بصیرت بزرگ تھے جنہوں نے مسلمانوں کو اسلام کے اقتصادی نظام کی طرف متوجہ کیا اور بادشاہ' امراء' عوام اور صوفیا چاروں طبقوں کو مخاطب کر کے بتایا کہ مسلم معاشرے کی ابتری کی بڑی وجہ اقتصادی ناہمواری بھی ہے۔ آپ نے صوفیا کو سرزنش کی کہ حجروں میں بیٹھ کر پیری مریدی کرنا اور مریدوں سے نذرانے وصول کرنا ترک کر دو اور فعال زندگی گزارو۔ بادشاہ کو اس کے فرائض یاد دلانے میں آپ نے کسی تامل یا جھجک سے کام نہیں لیا بلکہ نہایت صاف گوئی اور جرأت سے یہ فرض ادا کیا۔

دوسری طرف آپ نے نظام الملک' نجیب الدولہ' حافظ رحمت خان اور تاج محمد بلوچ جیسے مدبر اور صاحبِ اقتدار مسلمان حکمرانوں کو ایک مرکز پر جمع کر کے برصغیر میں غیر مسلم طاقتوں کے استیصال کا ایک جامع منصوبہ بنایا۔ آپ نے افغانستان کے مدبر اور بہادر حکمران احمد شاہ ابدالی سے بھی رابطہ قائم کر کے اسے برصغیر کے مسلمانوں کی امداد پر آمادہ کیا۔ چنانچہ آپ نے اسے لکھا کہ:

احمد شاہ ابدالی کو دعوت

''اس زمانے میں ایسا بادشاہ جو صاحبِ اقتدار و شوکت ہو اور لشکرِ مخالفین کو شکست دے سکتا ہو' دور اندیش اور جنگ آزما ہو' سوائے آں جناب کے اور کوئی موجود نہیں ہے۔ یقینی طور پر جنابِ عالی کا فرض عین ہے ہندوستان کا قصد کرنا اور مرہٹوں کا تسلط توڑنا اور ضعفائے مسلمین کو غیر مسلموں کے پنجے سے آزاد کرنا۔ اگر غلبۂ کفر معاذ اللہ اسی انداز پر رہا تو مسلمان اسلام کو فراموش کر دیں گے اور تھوڑا زمانہ گزرے گا کہ یہ قوم ایسی قوم بن جائے گی کہ اسلام اور غیر اسلام میں تمیز نہ ہو سکے گی۔ یہ بھی ایک بلائے عظیم ہے۔ اس بلائے عظیم کے دفع کرنے کی قدرت بہ فضل خداوندی جناب کے علاوہ کسی کو میسر نہیں ہے۔ ہم بندگانِ حضرت رسولِ خدا ﷺ کو شفیع گردانتے ہیں اور خدائے عزوجل کے نام پر التماس کرتے ہیں کہ ہمت مبارک کو اس جانب متوجہ فرما کر مخالفین سے مقابلہ کریں تاکہ خداوند تعالیٰ کے یہاں بہت بڑا ثواب آپ کے نامۂ اعمال میں لکھا جائے''۔

سردار نجیب الدولہ

احمد شاہ ابدالی کے بعد حضرت شاہ صاحبؒ نے اس عہد کے نامور افغان سردار نواب نجیب الدولہ کو مخاطب کیا اور انہیں برصغیر کے مسلمانوں کو غیر مسلموں کے تسلط سے نجات دلانے کی پُر زور تحریک کی۔ چنانچہ آپ نواب موصوف کے نام ایک خط میں لکھتے ہیں:

''خدائے تعالیٰ آں منبع الحسنات' امیر المجاہدین' رئیس الغزات کو فتوحاتِ تازہ اور برکات بے اندازہ سے مشرف و ممتاز کرے۔ فقیر ولی اللہ عفی عنہ کی طرف سے التماس ہے کہ اکثر اوقات مجیب الدعوات کی درگاہ میں دعا کی جاتی ہے کہ وہ مخالفینِ اسلام کے فرقوں کو شکست خوردہ کرے اور فضلِ باری سے امید ہے کہ یہ بات عنقریب وجود میں آ جائے گی۔ ہندوستان میں تین فرقے شدت و صلابت کی صفت سے موصوف ہیں۔ جب تک ان تینوں کا استیصال نہ ہو گا نہ کوئی بادشاہ چین سے بیٹھے گا نہ امراء چین سے بیٹھیں گے اور نہ رعیت خاطر جمعی سے زندگی بسر کر سکے گی۔ دینی و دنیاوی مصلحت اسی میں ہے کہ مرہٹوں سے جنگ جیتنے کے فوراً بعد قلعہ جات جٹ (جاٹ) کی جانب متوجہ ہو جائیں اور اس مہم کو بھی برکاتِ غیبیہ کی مدد سے آسانی کے ساتھ سر کر لیں اور اس کے بعد نوبت سکھ ہے۔ اس جماعت کو بھی شکست دینی چاہئے اور رحمتِ الٰہی کا منتظر رہنا چاہئے۔

آصف جاہ کو دعوت

اس عہد کی تیسری بڑی شخصیت نظام الملک آصف جاہ کی تھی جس نے کمال تدبر اور شجاعت سے ہر محاذ پر مرہٹوں کو شکست دی اور جو چاہتا تھا کہ برصغیر میں ایک مضبوط اسلامی حکومت قائم ہو جائے مگر افسوس کہ بادشاہِ وقت کی نادانی اور امراء کی خودغرضی نے آصف جاہ کو اس کے بلند مقاصد میں کامیاب نہ ہونے دیا۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے برصغیر کے اس سب سے زیادہ صاحبِ قوت وشوکت اور اسلام دوست حاکم سے بھی رابطہ قائم کیا اور اسے نصرت اسلام و مسلمین کے لئے وقتاً فوقتاً تحریک کی۔ چنانچہ اس کے نام ایک خط میں فرماتے ہیں:

''بعد حمد وصلوٰۃ کے واضح ہو کہ اس فقیر کے دل پر یہ امر واضح ہو گیا ہے کہ عالم ملکوت میں یہ بات مقرر شدہ ہے کہ مخالفین اسلام ذلیل وخوار ہوں گے۔ بعد ازاں باغی لوگ رسوا اور خانہ خراب ہوں گے۔ اگر جناب عالی ان بدمعاشوں کے مقابلے میں کمر ہمت باندھ کر آ جائیں تو یہ تمام کارنامے جناب کی طرف منسوب ہوں گے اور دنیا آپ کی تابعدار ہو جائے گی اور ملّتِ مرحومہ کے رواج اور مسلم حکومت کی استقامت کا باعث جناب عالی کو قرار دیا جائے گا۔

حضرت شاہ صاحب کی ان کوششوں کا خاطر خواہ نتیجہ نکلا اور نظام الملک آصف جاہ، نواب نجیب الدولہ، حافظ رحمت خاں اور تاج محمد خاں بلوچ نے شاہ صاحب کی تحریک پر اپنے اپنے علاقوں میں مرہٹوں، جاٹوں اور سکھوں کا نہایت پامردی سے مقابلہ کیا، انہیں پے در پے شکستیں دیں اور ان کا منصوبہ جس کا مقصد ہندوستان پر ''رام راج'' قائم کرنا تھا خاک میں ملا دیا۔ اس میں شک نہیں کہ ان جنگوں میں مسلمانوں کا بے اندازہ جانی مالی نقصان ہوا اور علاقے کے علاقے ویران ہو گئے۔ اگر صفدر جنگ، سید حسن علی خاں، سید عبداللہ، شجاع الدولہ، آدینہ بیگ اور غازی الدین خاں خودغرضی، فتنہ وفساد، شرارت اور غداری سے کام نہ لیتے اور حضرت شاہ صاحب کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لئے برصغیر کے مسلمان سرداروں کا ساتھ دیتے تو آج برصغیر کی تاریخ بہت مختلف ہوتی لیکن افسوس کہ ایسا نہ ہوسکا مگر اس میں شبہ نہیں کہ حضرت شاہ صاحب کی مساعی جمیلہ سے مرہٹوں کی کمر ہمت ہمیشہ کے لئے ٹوٹ گئی۔

جنگ پانی پت

اس عہد کی غیر مسلم طاقتوں میں سب سے زیادہ منظم قوت مرہٹوں کی تھی جنہوں نے دکن کے علاوہ پنجاب پر بھی قبضہ کر لیا تھا اور سکھ بھی ان سے مغلوب ہو گئے تھے اس لئے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے سب سے زیادہ توجہ اسی قوت کو پاش پاش کرنے پر مرکوز کر دی، انہوں نے احمد شاہ ابدالی کو ذاتی طور پر دعوت دینے کے ساتھ ساتھ نجیب الدولہ اور حافظ الملک حافظ رحمت خاں والیٔ روہیل کھنڈ کے ذریعہ بھی اسے برصغیر آنے اور مرہٹوں پر کاری ضرب لگا کر انہیں نیست و نابود کرنے کی تحریک کی۔ چنانچہ احمد شاہ ابدالی صرف تیس ہزار افغانوں کو اپنے ساتھ لے کر پنجاب روانہ ہو گیا۔ ادھر مرہٹے بھی مقابلے کی تیاری کر کے ٹڈی دَل لشکر کے ساتھ بڑھے۔ ان کے بڑے بڑے جرنیل سداشو راؤ، بشواش راؤ، بلونت سنگھ، ملہار راؤ ہلکر، مہاجی سندھیا، جھنکو جی اور مہاراجہ گائیکواڑ کے علاوہ راجپوت اور جاٹ بھی جن میں راجہ سورج مل بھی شامل تھے، احمد شاہ ابدالی کے مقابلے کے لئے روانہ ہوئے۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ ایسی جنگ تھی جو کفر واسلام کے نام پر لڑی گئی تھی اور تاریخ گواہ ہے کہ اس جنگ میں ہندوستان کے تمام قابل ذکر ہندو راجہ مسلمانوں کو مٹانے اور انہیں ہندوستان میں غلامی کی زندگی گزارنے پر مجبور کرنے کے لئے متحد ہو گئے تھے۔ ان کے عزائم کا اندازہ کرنے کے لئے یہ امر کافی ہے کہ بھاؤ اور دیگر مرہٹہ سردار یہ فیصلہ کر کے دکن سے روانہ ہوئے تھے کہ جنگ میں کامیابی کے بعد بادشاہ دہلی اور افغان سرداروں کا خاتمہ کر دیا جائے گا اور بشواش راؤ کو ہندوستان کا بادشاہ بنایا جائے گا وہ اپنے ساتھ پتھر کا ایک بہت بڑا بت بھی لے گئے تھے تاکہ دہلی فتح کرنے کے بعد اس بت کو جامع مسجد میں نصب کر دیں اور اذان کی آواز کی بجائے صدائے ناقوس جامع مسجد دہلی سے بلند ہو۔

ان کا ارادہ تھا کہ بشواش راؤ کو تخت سلطنت پر بٹھا کر شجاع الدولہ کو وزیراعظم مقرر کیا جائے تاکہ اس مہم میں شجاع الدولہ کی خدمات کا صلہ بھی اسے مل جائے اور ایک مسلمان کے وزیراعظم مقرر ہونے سے باقی مسلمانوں کی اشک شوئی بھی ہو جائے اور وہ یہ نہ سمجھیں کہ ہندوستان پر ہندوؤں کا مکمل عمل دخل ہو گیا ہے۔ لیکن جب احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پہنچ کر دتاجی سندھیا اور جھنکو جی کو شکست فاش دے کر اپنی فتح کا علم لہرا دیا اور اس جنگ میں مرہٹوں کی دو تہائی فوج دتاجی کے ہمراہ میدان میں کام آئی تو مرہٹوں کی آنکھیں کھلیں اور انہوں نے بشواش راؤ کو تخت دہلی پر بٹھانے کا ارادہ اس وقت تک ملتوی کر دیا جب تک کہ احمد شاہ ابدالی سے فیصلہ کن جنگ نہ ہو جائے۔

26 اپریل 1761ء کو پانی پت کے میدان میں فیصلہ کن اور تاریخی جنگ شروع ہوئی۔ جس میں ایک طرف پانچ لاکھ مرہٹے اور ان کا اعلیٰ درجہ کا توپ خانہ تھا، دوسری طرف احمد شاہ ابدالی کے جھنڈے کے نیچے صرف پچاس ہزار سوار اور چالیس ہزار پیادے تھے۔ روہیل کھنڈ کے نواب دوندے خاں، حافظ رحمت خاں، نواب نجیب الدولہ، نواب احمد خاں بنگش اور نواب فیض اللہ کی سرکردگی میں جو روہیلہ فوجیں احمد شاہ ابدالی کے جھنڈے کے نیچے جمع تھیں، وہ بھی ان نوے ہزار میں شامل تھیں۔ مسلمانوں کے پاس صرف تیس توپیں تھیں جن میں سے بیس استعمال کے قابل تھیں۔ گویا یہ نوے ہزار مسلمانوں کو پچاس لاکھ ہندوؤں سے مقابلہ تھا مگر اس قلیل تعداد کے باوجود محض اللہ تعالیٰ کے فضل، مسلمانوں کی جنگی حکمت عملی اور شجاعت و پامردی کی بدولت میدان مسلمان کے ہاتھ رہا اور مرہٹوں کے تمام بڑے سردار مثلاً بھاؤ (جسے عنایت خاں ابن حافظ رحمت خاں نے قتل کیا تھا) بشواش راؤ، جسونت راؤ، سنبھاجی اور جھنکو جی سندھیا وغیرہ بہادر روہیلوں اور ابدالی فوجوں کے ہاتھ قتل ہوئے۔ اس جنگ میں ایک محتاط اندازے کے مطابق دو لاکھ مرہٹے اور ان کے سردار کام آئے اور مرہٹوں کا شاید ہی کوئی گھر ایسا ہو جس کا کوئی نہ کوئی شخص میدان پانی پت میں ہلاک نہ ہوا۔ مرہٹوں کا راجہ بالاجی پیشوا اسی صدمے سے جلد ہی وفات پا گیا۔ افسوس کہ اس جنگ میں شجاع الدولہ نے نہایت ہی شرمناک کردار ادا کیا۔ ادھر تو اس نے مرہٹوں سے خط وکتابت جاری رکھی تاکہ ابدالی کی شکست کی صورت میں اس کی ریاست پر آنچ نہ آئے اور دوسری طرف ابدالی کو اپنی وفاداری کا یقین دلاتا رہا۔ تاریخ گواہ ہے کہ وہ نیم دلی سے اس جنگ میں شریک ہوا اور آخر وقت تک کوشش کرتا رہا کہ ابدالی اور مرہٹوں میں صلح ہو جائے۔ ایک موقع پر تو عین میدانِ جنگ میں ابدالی کے جرنیل شاہ پسند خاں نے امداد کی درخواست کی تو وہ چپ چاپ کھڑا تماشا دیکھتا رہا۔ بہرحال پانی پت میں مرہٹوں کو ایسی شکست ہوئی جس نے ہمیشہ کے لئے ان کی کمر توڑ دی۔ اس طرح حضرت شاہ ولی اللہؒ کے پروگرام کی ایک شق مکمل ہو گئی اور مرہٹوں نے مغلیہ تخت پر بیٹھ کر حکومت کرنے کا جو خواب دیکھا تھا وہ احمد شاہ ابدالی اور روہیلہ سرداروں کی مساعی جمیلہ کی وجہ سے شرمندۂ تعبیر نہ ہوسکا۔

سکھوں کی سرکوبی

احمد شاہ کی واپسی کے بعد سکھ پہاڑوں اور جنگلوں سے نکل آئے اور لاہور، سیالکوٹ، سرہند اور جالندھر میں لوٹ مار اور قتل وغارت سے قیامت برپا کر دی۔ جب ان واقعات کی خبر احمد شاہ ابدالی کو ہوئی تو وہ چالیس ہزار افغانوں کا لشکر لے کر آندھی اور طوفان کی طرح پنجاب آیا اور مورخین کا بیان ہے کہ درانیوں کی ٹوپیاں دیکھتے ہی سکھ بھاگ کھڑے ہوئے مگر افغان فوجوں نے انہیں چاروں

طرف سے گھیر کر مولی گاجر کی طرح کاٹ ڈالا۔ اس معرکے میں 24 ہزار سکھ تہ تیغ ہوئے' زخمیوں کا کوئی شمار نہیں۔ سردار آلہ سنگھ والی پٹیالہ گرفتار ہو کر احمد شاہ کے حضور پیش ہوا اور سات لاکھ روپیہ بہ طور تاوان جنگ ادا کر کے گلو خلاصی کرائی۔ سکھوں کی تاریخ میں یہ سب سے زیادہ خونریز جنگ تھی جس نے سکھوں کو بری طرح تباہ کیا۔

مغربی طاقتوں کی ریشہ دوانیاں

اسی دوران میں ہندوستان مغربی طاقتوں سے روشناس ہوا۔ روشناس وہ پہلے بھی ہوا تھا' مگر یہ روشناسی کچھ اور ہی قسم کی تھی۔ واسکوڈی گاما پہلا مغربی سیاح ہے جو ایک عرب جہازراں کی رہنمائی میں راس امید سے ہوتا ہوا ہندوستان پہنچا۔ اس کا جہاز کالی کٹ کے بندرگاہ پر لنگر انداز ہوا۔ یہ واقعہ ۱۴۹۸ء کا ہے۔ اس کے بعد پرتگیزی تاجروں کی آمد کا سلسلہ شروع ہوا اور انہوں نے اس علاقے کے راجہ ''زمورن'' سے تجارتی مراعات حاصل کر لیں۔ رفتہ رفتہ' کوچین' گوا' دمن' دیو' بسی' بمبئی اور ہگلی میں پرتگیزی نوآبادیاں قائم ہوگئیں۔ ان علاقوں کی حفاظت کے لئے انہوں نے نہایت مضبوط بحری بیڑہ تیار کیا۔ اس بیڑے کے جہازوں پر توپیں نصب رہتی تھیں۔ مذہبی لحاظ سے یہ نہایت متعصب لوگ تھے۔ اپنے علاقوں میں مسلمانوں کو اذان دینے اور نماز تک پڑھنے کی اجازت نہ دیتے تھے۔ ان کے علاقے کا اگر کوئی ہندوستانی باشندہ نابالغ اولاد چھوڑ کر فوت ہو جاتا تو یہ لوگ ان کمسن بچوں کو جبراً اپنی تحویل میں لے کر عیسائی پرورش گاہوں میں بھیج دیتے۔ ان لوگوں نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ قزاقی کا پیشہ اختیار کر لیا اور انتہا یہ ہے کہ حج سے واپس آنے والے جہاز بھی ان کی دست برد سے محفوظ نہ رہے۔ انہوں نے سلطان محمود حاکم گجرات کو سمندری جنگ میں شکست دے کر گوا پر قبضہ کر لیا۔ 1612ء میں پرتگیزیوں نے گوا کے قریب مغلوں کے کچھ جہاز پکڑ لئے۔ آخر 1632ء میں شاہجہاں کے حکم سے ہگلی پر حملہ کیا گیا۔ پرتگیزیوں کو سخت شکست ہوئی اور وہ یہاں سے نکال دیئے گئے۔ اورنگ زیب عالمگیر کے عہد حکومت میں میں بھی پرتگیزیوں نے اپنی ظالمانہ روش ترک نہ کی کیونکہ ابھی گوا' دمن' دیو اور کچھ دیگر علاقے بھی ان کے قبضے میں تھے اور ان کے پاس مضبوط بحری بیڑے بھی تھے۔ ان کے فتنہ سے اورنگ زیب کو سخت تشویش ہوئی اور اس کے حکم سے معتبر خاں نے کوکن پر حملہ کر کے پرتگیزیوں کو سخت شکست دی۔ جب یہ خبر گوا کے پرتگیزی کپتان کو ملی تو اس نے اورنگ زیب کے حضور معافی کی درخواست کی۔ اورنگ زیب نے معاف کر دیا۔ اسی دوران میں فرانسیسیوں اور انگریزوں نے ہندوستان کا رُخ کیا۔ اور ان کے جہاز پرتگیزیوں کے سدِ راہ ہوئے اسی طرح ان کا ہندوستان پر قبضہ کرنے کا منصوبہ ناکام ہوگیا۔

انگریزوں کی برصغیر میں آمد

پرتگیزیوں کے بعد ولندیزی ہندوستان آئے اور پٹنہ' قاسم بازار' سورت اور کوچین وغیرہ میں تجارتی کوٹھیاں تعمیر کیں۔ یہ دوسری مغربی قوم تھی جس نے ہندوستان کو تجارتی منڈی کے طور پر استعمال کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی بحری قوت کا مظاہرہ کیا اور پرتگیزوں کے بہت سے مقامات چھین لئے۔ ہندوستان میں ان کی آمد سولہویں صدی عیسوی کے اختتام پر ہوئی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد انگریز پرتگیزیوں اور ولندیزیوں کے حریف کی حیثیت سے نمودار ہوئے اور انہوں نے اپنے دو پیش رو حریفوں کو شکست دے کر برصغیر میں تجارتی اجارہ داری حاصل کر لی۔ 1600ء میں انگریز تاجروں نے ملکہ الزبتھ کی اجازت سے ایسٹ انڈیا کمپنی کے نام سے ایک تجارتی کمپنی قائم کی۔ 1608ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی کا پہلا جہاز کپتان ہاکنز کی قیادت میں سورت پہنچا۔ اس زمانے میں جہانگیر ہندوستان کا فرماں روا تھا۔ ہاکنز نے جہانگیر سے سورت میں تجارتی مرکز قائم کرنے کی اجازت مانگی۔ جہانگیر نے اجازت دے دی۔ اس طرح ہندوستان میں 1613ء میں پہلی بار انگریزوں نے تاجروں کی حیثیت سے اقامت اختیار کی اور اپنا ایک مرکز قائم کر لیا۔ اس واقعے کے دو سال بعد یعنی 1615ء میں حکومت انگلستان کی طرف سے سرٹامس رو (تھامس رو) ہندوستان میں سفیر بن کر آیا۔ اس نے نہایت قابلیت سے فرائض سفارت ادا کئے اور جہانگیر سے انگریز تاجروں کے لئے مزید مراعات حاصل کر لیں۔ بعد ازاں 1668ء میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے بمبئی کی بندرگاہ میں جو اس وقت انگلستان کے بادشاہ چارلس دوم کے قبضے میں تھی' بادشاہ سے حاصل کر کے اپنی تجارتی کوٹھیاں سورت سے بمبئی منتقل کر لیں۔ یہ بندرگاہ پہلے پرتگیزیوں کے پاس تھی مگر جب پرتگال کی شہزادی کی چارلس دوم سے شادی ہوگئی تو بمبئی شاہ پرتگال کی طرف سے اس کی بیٹی کے جہیز میں شاہ انگلستان کو دے دیا گیا۔ اسی طرح بمبئی انگلستان کے بادشاہ کی ملکیت ہوگیا۔

سورت کے علاوہ انگریزوں نے جہانگیر سے ہگلی' کلکتہ' مدارس اور مچھلی پٹم میں بھی تجارتی مراکز قائم کرنے کی اجازت حاصل کر لی۔ فرخ سیر کے زمانے میں انہیں ہندوستان میں مضبوطی سے قدم جمانے کا موقع مل گیا۔ تفصیل اس اجمال کی یہ ہے کہ فرخ سیر ایک خطرناک مرض میں مبتلا ہوا' اور ایک انگریز ڈاکٹر ہملٹن نے اس کا علاج کیا۔ بیماری سے شفایاب ہونے کے بعد اس عاقبت نااندیش بادشاہ نے خوش ہو کر ڈاکٹر ہملٹن کو پیش کش کی کہ وہ جو چاہے مانگ لے۔ اپنی قوم کے اس سچے ہمدرد اور انگریز قوم کے لئے اس واجب الاحترام ڈاکٹر نے نہ تو اپنے وزن کے برابر زر و جواہر طلب کئے نہ کسی جاگیر کا مطالبہ کیا بلکہ اپنی قوم کے لئے تجارتی مراعات کی درخواست کی یعنی انگریزوں کو بنگال میں آزادانہ تجارت کی اجازت دے دی جائے اور ان سے تین ہزار روپے سالانہ کی حقیر رقم قبول کر لی جایا کرے جو نہ ہونے کے برابر تھی۔ فرخ سیر نے یہ درخواست قبول کر لی۔ اسی طرح انگریزوں کی جڑیں ہندوستان میں نہایت مضبوط ہوگئیں اور وہ بنگال کی معیشت پر پوری طرح حاوی ہو گئے۔ اس زمانے میں انگریزوں نے کلکتہ میں ایک قلعہ تعمیر کیا جس کا نام انگلستان کے بادشاہ ولیم (سوم) کے نام پر ''فورٹ ولیم'' رکھا بعد میں یہی قلعہ بنگال میں انگریزی حکومت کے قیام کا باعث بنا۔

فرانسیسیوں کی برصغیر میں آمد

پرتگیزیوں اور پھر انگریزوں کی ہندوستان میں تجارتی کامیابی نے فرانس کے تاجروں کو بھی طالع آزمائی پر ابھارا۔ چنانچہ انہوں نے اپنی حکومت کی اجازت اور ایک فرانسیسی وزیر کے ایماء سے 1664ء میں ''فرنچ ایسٹ انڈیا کمپنی'' کے نام سے ایک تجارتی ادارہ قائم کیا۔ اس کمپنی نے پہلے سورت' پھر پانڈی چری' چندرنگر اور بعض دیگر مقامات پر تجارتی کوٹھیاں تعمیر کیں۔ رفتہ رفتہ فرانسیسی نو آبادیوں نے ہندوستان میں سلطنت کی شکل اختیار کر لی۔ ڈوما اس سلطنت کا پہلا گورنر تھا اور ڈوپلے دوسرا۔ مغربی مقبوضہ جات میں اب تک جتنے گورنر مقرر ہوئے تھے حقیقت یہ ہے کہ ان سب میں ڈوپلے سب سے زیادہ دور اندیش' مدبر' بہادر اور بہت بڑا سیاست دان تھا جو عرصے تک انگریزوں کے لئے بھی باعث خوش و تشویش بنا رہا۔

انگریزوں اور فرانسیسیوں میں کشمکش

1740-41ء میں یورپ اور فرانس اور انگریزوں کے درمیان جنگ شروع ہوگئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ہندوستان کے فرانسیسی اور انگریزی مقبوضہ جات کے بحری بیڑے اور بری فوجیں بھی حرکت میں آ گئیں اور فرانسیسی فوجوں نے مدراس پر حملہ کر دیا جو انگریزوں کا تجارتی مرکز اور ان کی نو آبادی تھی مگر چونکہ مدراس کرناٹک کے نواب کے حدودِ سلطنت میں شامل تھا اس لئے اس نے اسے کرناٹک پر حملہ تصور کیا۔ ادھر انگریزوں نے اس کی پیٹھ ٹھونکی۔ چنانچہ اس نے انگریزوں کی امداد کے لئے ایک فوج روانہ کر دی۔ فرانس کی فوج نے اس متحدہ فوج کو شکست دی۔ مدارس کی فتح' ڈوپلے کی بہت بڑی کامیابی تھی۔ اس سے انگریزوں کی ساکھ کو سخت نقصان پہنچا۔ لیکن قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا

اور جلد ہی ایسے حالات پیدا ہو گئے کہ فرانسیسیوں کے قدم ہندوستان سے اکھڑنے لگے اور انگریزوں کی طاقت مستحکم ہونے لگی۔ ایک مدبر اور بہادر مگر عیار انگریز کلایو نے انگریزوں کی قسمت کے ستارے کو گردش سے نکال دیا۔ اس نے پانچ سو سواروں اور پیادوں کی مدد سے کرناٹک کے دارالسلطنت ارکاٹ پر حملہ کر دیا۔ اس کے ساتھ ہی اس نے مرہٹوں اور تنجور کے راجہ کو بھی اپنے ساتھ ملا لیا۔ ستمبر ۱۷۵۰ء میں اس متحدہ فوج نے ترچناپلی پر قبضہ کر لیا۔ کرناٹک کا نواب چندا صاحب اس جنگ میں کام آیا۔ انگریزوں کا حامی نواب محمد علی کرناٹک کا حکمراں بن گیا جو پورے انگریزوں کے زیر اثر تھا۔

1752ء میں فرانس اور انگریز پھر ایک دوسرے سے برسرپیکار ہو گئے۔ یہ جنگ سات سال جاری رہی۔ ہندوستان پر بھی اس کا اثر پڑا۔ اور انگریزوں نے آگے بڑھ کر فرانس کے مقبوضہ علاقے چندر نگر پر قبضہ کیا۔ دوسری طرف شاطر کلایو نے دربار حیدرآباد سے بھی رابطہ قائم کیا اور نظام کو اپنے زیر اثر لانے میں کامیاب ہو گیا۔ ادھر حیدرآباد میں انگریزوں کے اقتدار کی بنیاد قائم ہوئی اور ادھر مشہور فرانسیسی جرنیل کونٹ لالی 1760ء اور 1761ء میں مدراس' پانڈی چری اور ماہی کی لڑائیوں میں انگریزوں سے شکست کھا گیا۔ اس طرح بنگال کے ساحلی علاقے مدراس اور مالابار مکمل طور پر انگریزوں کے قبضے میں آ گئے اور فرانسیسی حکومت کے سیاسی عزائم ہندوستان میں ہمیشہ کے لئے ناکام ہو گئے۔

جنگ پلاسی۔ 1757ء

اسی دوران میں ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس نے بعد میں ہندوستان کی تاریخ سیاست پر نہایت گہرا اثر ڈالا۔ جب دہلی کی مرکزی سلطنت کمزور ہو گئی تو بنگال کے گورنر نے بھی سرکشی اختیار کی۔ بنگال کے ان خودمختار حکمرانوں میں نواب علی وردی خاں ایک نہایت دوراندیش' اعلیٰ پایہ کا منتظم اور بہادر انسان تھا۔ وہ جب تک زندہ رہا اس نے ایک طرف مرہٹوں کو دبائے رکھا اور دوسری طرف انگریزوں کی سرگرمیوں پر بھی کڑی نظر رکھی اور انہیں قلعہ بندیوں سے روک دیا۔ مگر 1756ء میں اس قابل اور بہادر حکمراں علی وردی خاں کا انتقال ہو گیا اور اُس کا نواسہ سراج الدولہ بنگال کا حکمران ہوا تو انگریزوں نے اس موقع سے فائدہ اٹھایا اور قبل اس کے کہ سراج الدولہ کی حکومت مستحکم ہو' انہوں نے جنگ کی طرح ڈال دی' اس میں شک نہیں کہ سراج الدولہ حریت پسند حاکم تھا اور وہ انگریزوں کے بڑھتے ہوئے اثر و رسوخ کو نہ صرف اپنے لئے بلکہ سارے ہندوستان کے لئے بہت بڑا خطرہ سمجھتا تھا۔ وہ اپنے ایک خاندانی حریف شوکت جنگ کو شکست دینے کے بعد انگریزوں کی طرف متوجہ ہوا اور انہوں نے (سراج الدولہ کی ممانعت کے) جو قلعے تعمیر کر لئے تھے انہیں منہدم کرنے کے لئے روانہ ہو گیا۔ اس نے قاسم بازار اور کلکتہ پر قبضہ کر لیا اور انگریزوں کو شکست فاش دی۔ قاسم بازار اور کلکتہ سے معرکوں میں شکست کھانے کے بعد ہزیمت خوردہ انگریزوں نے کلایو اور انگریزی بحریہ کے کمانڈر انچیف واٹسن کو اس واقعے کی اطلاع دی جو ان دنوں مدراس میں تھے۔ یہ دونوں جنگی جہازوں کے ساتھ بنگال روانہ ہو گئے اور انہوں نے کلکتہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد انگریزوں اور سراج الدولہ میں صلح ہو گئی۔ صلح نامے کی شرائط سے صاف پتہ چلتا ہے کہ سراج الدولہ نے یہ صلح دب کر کی تھی۔ انگریزوں پر نواب کی کمزوری واضح ہو گئی تھی۔ ادھر خود سراج الدولہ کے بعض ارکان دولت مثلاً میر جعفر جو علی وردی خان کا بہنوئی تھا' انگریزوں سے نواب کے خلاف سازشیں کر رہا تھا۔ اس سازش میں بنگال کے تمام سرکردہ ہندو بھی شامل تھے۔ جنہیں سراج الدولہ نے ممتاز عہدوں پر فائز کیا تھا۔ صرف ایک یادو ہندو اس کے وفادار رہے۔ چنانچہ جب یہ سازش پایہ تکمیل کو پہنچ گئی تو کلایو نے جون 1757ء میں کلکتہ سے اپنی فوجوں کو مارچ کرنے کا حکم دے دیا۔ ادھر نواب سراج الدولہ اپنا لشکر لے کر مقابلے کے لئے روانہ ہوا۔ پلاسی کے تاریخی میدان میں دونوں فوجیں ایک دوسرے سے نبرد آزما ہوئیں' مگر میدان انگریزوں کے ہاتھ رہا۔ اس کی وجہ میر جعفر اور ہندو سپہ سالار کی غداری تھی۔ وہ میدان جنگ میں کھڑے نواب سراج الدولہ کی بربادی کا تماشہ دیکھتے رہے۔ آخر سراج الدولہ میدان جنگ سے پسپا ہوا مگر راستے ہی میں گرفتار کر لیا گیا اور انگریزوں کے ایما اور سازش سے میر جعفر کے بیٹے میرمدن نے اسے قتل کر دیا۔

اس غداری کے صلے میں میر جعفر کو بنگال کا گورنر بنا دیا گیا مگر کچھ ہی عرصے کے بعد میر جعفر کو بھی معزول کر دیا گیا اور اس کی جگہ میر قاسم کو بنگال کا نواب مقرر کیا گیا جو میر جعفر کا داماد تھا۔ مگر یہ داماد اپنے خسر سے بالکل مختلف ثابت ہوا۔ میر قاسم انگریزوں کے آلۂ کار اور حاشیہ بردار کی حیثیت سے نہیں بلکہ ایک آزاد اور خوددار حکمران کی حیثیت سے حکومت کرنا چاہتا تھا۔ اس نے بنگال کے نظم و نسق میں بعض مفید اصلاحات کرنی چاہیں اور یہ دیکھ کر کہ انگریز آزاد تجارت کے نام پر بنگال کے عوام کو بری طرح لوٹ رہے ہیں' ملکی صنعتیں اور مقامی تجارتیں تباہ ہوئی جا رہی ہیں' اس نے انگریزوں کے ساتھ ساتھ ہر ہندوستانی تاجر کو محصول سے مستثنیٰ کر دیا اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ تجارت پر سے انگریزوں کی اجارہ داری ختم ہو گئی۔ میر قاسم کے یہ اقدامات انگریزوں کو ناگوار گزرے اور انہوں نے میر قاسم کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ پٹنہ کی جنگ میں میر قاسم نے انگریزوں کو شکست دی مگر اس کے بعد کی لڑائیوں میں انگریز فتح یاب ہوئے اور میر قاسم کو معزول کر کے پھر میر جعفر کو بنگال کا نواب بنا دیا گیا۔ میر قاسم نے ایک بار پھر انگریزی اقتدار کو چیلنج کیا اور اودھ کے حکمران شجاع الدولہ اور دہلی کے بادشاہ شاہ عالم کی امداد سے 1764ء میں بکسر کے مقام پر انگریزوں سے ایک فیصلہ کن جنگ لڑی۔ اس جنگ میں بھی انگریزوں کا پلہ بھاری رہا اور صرف ان متحدہ فوجوں کو شکست ہی نہ ہوئی بلکہ شاہ عالم کو تاوان جنگ کے طور پر بنگال' بہار اور اڑیسہ کی دیوانی سے بھی محروم ہونا پڑا۔ اس طرح 1757ء میں جنگ پلاسی نے اور 1764ء اور جنگ بکسر نے ہندوستان کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور اس سرزمین سے اسلامی اقتدار کا خاتمہ ہو گیا۔ ان دونوں جنگ میں ہندوستان نے انگریزوں کو ایک عارضی فاتح کی نہیں بلکہ مستقل حاکم کی حیثیت دے دی اور ان کی آئندہ فتوحات کے لئے راستہ کھول دیا بلکہ میدان ہموار کر دیا۔

سلطان حیدر علی کا جہاد آزادی

عین اس وقت جب بنگال' بہار اور اڑیسہ میں اسلامی اقتدار کا آفتاب غروب ہو رہا تھا' دکن کے علاوہ میسور میں ایک غیور' بہادر اور مدبر مسلمان قوم کی عظمت رفتہ کو بحال کرنے میں کوشاں تھا۔ یہ مرد مومن سلطان حیدر علی تھا جو معمولی حیثیت سے ترقی کر کے میسور کا حکمراں بنا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ انگریز' فرانسیسی اور مرہٹے یہ تینوں اسلامی اقتدار کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہیں۔ اس لئے اس نے بڑی حکمت عملی سے کام لے کر پہلے فرانسیسیوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور کرناٹک کی جنگ میں انگریزی فوجوں کے مقابلے میں فرانسیسیوں کی امداد کے لئے اپنا لشکر بھیجا۔ دوسری طرف نظام حیدرآباد کو یہ باور کرانے کی کوشش کی کہ انگریز اور مرہٹے مسلمانوں کے یکساں دشمن ہیں۔ اس کے ساتھ ساتھ اس نے ارکاٹ کے حکمران نواب محمد علی والاجاہ کے ساتھ بھی اتحاد قائم کرنے کی کوشش کی۔ اس کی خواہش تھی کہ مسلم ریاستوں کے حکمران ذاتی اغراض کو قربان کر کے صرف ملی مفاد کی خاطر ایک پلیٹ فارم پر متحد ہو جائیں۔ اس مقصد کے حصول کے لئے سلطان نے متعدد کوششیں کیں۔ اس نے شادی بیاہ کے ذریعے نظام حیدرآباد کے خاندان کو اپنے خاندان کے قریب لانے کی کوشش کی مگر اس کی یہ کوشش کامیاب نہ ہوئی اور نظام نے جو اپنے آپ کو موروثی حکمراں اور شرافت و نجابت کے لحاظ سے برتر اور سلطان حیدر علی کو غاصب سلطنت اور حسب

نسب کے لحاظ سے کمتر سمجھتا تھا۔ حیدر علی کی یہ مخلصانہ تجویز ٹھکرا دی۔ افسوس کہ یہ خود غرض لوگ سلطان حیدر علی کے قلب کی تڑپ کو محسوس ہی نہ کر سکے۔ ایک روایت کے مطابق سلطان نے ایران کے بادشاہ کو بھی خط لکھ کر ہندوستان کے حالات سے آگاہ کیا تھا اور اس کی امداد حاصل کرنے کی کوشش کی تھی۔

بہر حال جہاں تک سلطان حیدر علی کی ذاتی کامیابی کا تعلق ہے اس میں شک نہیں کہ اس نے اپنی زندگی کے آخری لمحے تک تمام اسلام دشمن طاقتوں کا نہایت پامردی اور تدبر سے مقابلہ کیا اور اس سیلاب کو آگے بڑھنے سے روکے رکھا۔ اس نے 1767ء میں بیک وقت نظام حیدرآباد نواب ارکاٹ محمد علی والا جاہ مرہٹوں اور انگریزوں سے پنجہ آزمائی کی اور مخالفوں کے علاقے روندتا اور انہیں شکست پر شکست دیتا مدراس تک پہنچ گیا۔ اس جنگ میں مرہٹوں کے چیدہ چیدہ جرنیلوں کے علاوہ کرنل اسمتھ' کرنل اوڈ' میجر فٹز' کرنل لینگ اور کپتان نکسن جیسے آزمودہ کار جرنیل شریک تھے۔ یہ جنگ دو سال جاری رہی اور حیدر علی کی طوفانی یلغار اور پیہم فتوحات نے پہلے مرہٹوں اور پھر نظام کو خوفزدہ کر دیا اور ان کی فوجیں حیدر علی سے صلح کر کے اپنے اپنے علاقوں کو واپس چلی گئیں۔ جب حیدر علی نے مدراس پر حملہ کیا تو انگریزوں کے حوصلے بھی پست ہو گئے اور انہوں نے سلطان کے سامنے سپر ڈال دی۔

1780ء میں پھر انگریزوں اور سلطان کے درمیان جنگ شروع ہو گئی' مگر اس بار پھر حیدر علی اور ان کے نامور فرزند ٹیپو سلطان نے انگریزوں کے عزائم کو کامیاب نہ ہونے دیا۔ سلطانی فوجوں نے کرنل بیلی اور کرنل بریتھوئٹ کی فوجوں کو نہایت ذلت ناک شکست دی۔ کرنل بیلی اور ڈیوڈ بیرڈ جیسے آزمودہ کار انگریز جرنیل سلطانی فوجوں کے ہاتھوں اسیر ہوئے۔ اس کے ساتھ ساتھ سلطان نے مرہٹوں کا استیصال بھی جاری رکھا۔ مادھو راؤ پیشوا اور ترک راؤ سے اس کی جنگیں تاریخ کے یادگار معرکے ہیں جن میں حیدر علی نے قلیل فوج کے ذریعے محض اپنی شجاعت' عزم و حوصلہ اور تدبر سے مرہٹوں کی ٹڈی دل فوج کو تہس نہس کر دیا اور 1782ء میں جب وہ اس دنیا سے رخصت ہوا تو دکن میں ایک مضبوط اسلامی سلطنت قائم ہو چکی تھی جس کا رقبہ 80 ہزار مربع میل سے بھی زیادہ تھا اور جو ہندوستان میں اس عہد کی سب سے بڑی اور طاقتور اسلامی سلطنت تھی۔ اگر ملک کے دوسرے حکمران اس سے تعاون و اتحاد پر آمادہ ہو جاتے تو برصغیر خوں ریزی و بربادی اور دو سو سالہ غلامی سے محفوظ ہو جاتا جس کے اثرات آج تک موجود ہیں۔

سلطان ٹیپو کی جدوجہد

حیدر علی کے انتقال کے بعد اس کے اولوالعزم اور بہادر بیٹے سلطان ٹیپو نے اپنے والد گرامی کے مشن کو جاری رکھا۔ سلطان ٹیپو غیور اور شجاع ہونے کے ساتھ ساتھ نہایت فاضل اور غیر معمولی انتظامی صلاحیتوں کا بھی مالک تھا۔ وہ جذبۂ اسلامی سے سرشار اور وطن دشمن طاقتوں کا سب سے بڑا دشمن تھا۔ اگر اس میں مردم شناسی کے جوہر کی کمی نہ ہوتی تو شاید وہ انگریزوں کو ہندوستان سے بے دخل کرنے اور مرہٹوں کی طاقت کو مکمل طور پر ختم کرنے میں کامیاب ہو جاتا۔ اس کے بعد جانثاروں اور سکھوں کو زیر کرنا چنداں دشوار نہ تھا۔ اس کے دربار میں سازشوں کا جال بچھا رہا اور وہ اس سے بے خبر رہا۔ اس نے جن لوگوں کو اپنے دست و بازو کی حیثیت سے منتخب کیا۔ وہی اس کی ناکامی کا سبب بنے۔ اس لحاظ سے اس کا نامور باپ اس سے کہیں اونچا تھا۔ بہر حال وہ اس ایک خامی کے باوجود برصغیر کے ان معدودے چند جاں بازوں اور سرفروشوں میں سے تھا جنہوں نے اپنی زندگی اسلام کی بقا اور اتحاد اسلامی کے فروغ کے لئے وقف کر دی تھی۔ وہ برصغیر میں ایک آزاد اور مضبوط اسلامی حکومت کے قیام کا خواہاں تھا۔ اس نے نظام دکن کو متعدد پیغامات بھیجے اور خطوط ارسال کئے جن میں اسلامی اخوت کا واسطہ دے کر اس سے درخواست کی گئی تھی کہ وہ سلطان کی مخالفت ترک کر دے۔ اس نے نظام کو یہ تجویز بھی پیش کی کہ دونوں خاندانوں کی بیٹیاں اور بیٹے ایک دوسرے سے بیاہ دیئے جائیں۔ اس طرح ہم ایک دوسرے کے قریب آ جائیں گے مگر ہندوستان سے اسلامی اقتدار کے خاتمے کا وقت قریب سے قریب تر ہوتا جا رہا تھا اس لئے نظام نے اس کی کسی تجویز کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔

سلطان نے ہندوستان کے مسلمان والیان ریاست سے مایوس ہو کر بیرونی اسلامی ممالک کی طرف رجوع کیا اور افغانستان' ایران اور ترکیہ کے فرماں رواؤں کو ہندوستان کے مسلمانوں کی حالت زار سے مطلع کرنے کے بعد ان سے مدد کی درخواست کی۔ مگر ان کوششوں کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ نہ نکلا اور آزادیٔ وطن کی یہ جنگ سلطان کو تنہا ہی لڑنی پڑی۔ اس نے انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لئے فرانسیسی فوجوں کی امداد بھی حاصل کی۔ سلطان حیدر علی کی وفات کے وقت انگریزوں سے جنگ جاری تھی۔ مراسم تخت نشینی ادا کرنے کے بعد سلطان ٹیپو نے جنگ کو اور تیز کر دیا اور دو ہزار فرانسیسی فوج کو انگریزوں سے مقابلے کے لئے روانہ کر دیا۔ اس کے بعد خود بھی انگریزی مقبوضات کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ حیدر نگر' کوڑیال بندر اور پائین گھاٹ میں انگریزوں سے شدید جنگیں ہوئیں جن میں کرنل کیمبل' جنرل میتھیوز اور کرنل لانگ جیسے انگریز جرنیلوں نے حصہ لیا۔ مگر سلطان ٹیپو نے ہر معرکے میں انگریزی فوجوں کو شکست دی اور بہت سے انگریز افسروں اور سپاہیوں کو قید کر لیا۔ یہ دیکھ کر انگریزوں نے سلطان کی طرف صلح کا ہاتھ بڑھایا مگر اس صلح سے انگریزوں کو سخت نقصان ہوا اور سلطان ٹیپو کی شجاعت اور عسکری قابلیت کی دھاک سارے ہندوستان بلکہ یورپ تک بیٹھ گئی۔

مرہٹوں اور نظام سے معرکے

اس جنگ کے اختتام کے چند روز بعد ہی نظام اور مرہٹوں نے انگریزوں کے خفیہ اشارے سے سلطان کے خلاف جنگ چھیڑ دی۔ اس سے مقصد یہ تھا کہ سلطان کو اطمینان کا سانس لینے اور اپنی سلطنت کو مضبوط کرنے کا موقع نہ ملے۔ ادھر سلطان کی اس فتح نے خود نظام اور مرہٹوں کو بھی تشویش میں مبتلا کر دیا تھا چنانچہ 1778ء میں مرہٹوں اور نظام کی متحدہ فوج نے میسور پر حملہ کر دیا۔ شاہنور میں دونوں فوجوں کے درمیان ایک فیصلہ کن جنگ ہوئی۔ مرہٹوں اور نظام کی متحدہ فوجوں کو شکست فاش ہوئی۔ مرہٹے توپ خانہ اور بہت سا اسلحہ جنگ میں چھوڑ کر میدان سے فرار ہو گئے اور ان کے نامی گرامی سردار کام آئے۔ اس کامیابی کے بعد سلطان نے اپنی فوجوں کو نظام اور مرہٹوں کے علاقوں پر حملہ کرنے کا حکم دیا۔ سلطان کی فوج کا ایک دستہ مرہٹوں کے کیمپ میں داخل ہو گیا۔ اس اچانک حملے کا یہ اثر ہوا کہ مشہور مرہٹہ راجہ ہولکر اپنی عورتوں اور بچوں تک کو کیمپ میں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔ آخر مرہٹوں نے صلح کی درخواست کی اور سلطان ٹیپو نے عالی ظرفی سے کام لے کر ان کی درخواست قبول کر لی۔ اس طرح مرہٹوں اور نظام دونوں کو اپنی شکست کے محضر نامے پر خود دستخط کرنا پڑے۔

انگریزوں سے جنگیں

سلطان ٹیپو کی اس فتح نے انگریزوں کو بے حد خوف زدہ کر دیا۔ سلطان کی طاقت سے انہیں اپنا مستقبل تاریک نظر آنے لگا۔ چنانچہ انگریزوں نے نظام اور مرہٹوں کے ساتھ ایک معاہدہ کیا کہ ٹیپو سلطان کی طاقت ختم کر کے اس کی سلطنت تینوں آپس میں تقسیم کر لیں۔ 1786ء میں جب لارڈ کارنوالس ہندوستان کا گورنر جنرل ہو کر آیا تو اس نے سلطان ٹیپو سے فیصلہ کن جنگ لڑنے اور جنوبی ہند کی اس اسلامی سلطنت کو تباہ و برباد کرنے کا ایک جامع منصوبہ تیار کیا اور شراؤ کور پر سلطان ٹیپو کے حملے کو بہانہ بنا کر نظام اور مرہٹوں کے اشتراک سے میسور پر حملہ کر دیا۔ فروری 1791ء میں اتحادی فوجیں بنگلور پر حملہ آور ہوئیں۔ مگر سلطان کے بعض سرداروں کی غداری کی وجہ سے اسے شکست ہوئی۔ اسے اپنا نصف علاقہ اتحادیوں کے حوالے

کرنا پڑا۔ تین کروڑ روپیہ بطور تاوان جنگ اس پر عائد کیا گیا جس میں سے نصف روپیہ تو اسی وقت ادا کر دیا گیا اور نصف رقم کے لئے سلطان نے اپنے دو بیٹوں کو یرغمال کے طور پر لارڈ کارنوالس کے سپرد کر دیا۔ اس ساری کارروائی کے بعد انگریزوں نے سلطان سے علاقہ کورگ کا مطالبہ کیا۔ چونکہ وہ اپنے دونوں بیٹوں کو انگریزوں کے حوالے کر چکا تھا اس لئے لارڈ کارنوالس کو یقین تھا کہ سلطان بیٹوں کی خاطر اس علاقے کے لئے جنگ نہیں کرے گا چنانچہ سلطان کو کورگ سے بھی دست بردار ہونا پڑا۔ اس جنگ میں سلطان کے امراء دربار خصوصاً میر غلام علی لنگڑا نے نہایت شرمناک کردار ادا کیا اور بکثرت ہندو سرداروں اور ہندو قلعہ داروں نے سلطان ٹیپو سے غداری کی۔ انہوں نے انگریزوں سے سازش کر کے ان کی پیش قدمی کی۔ خبر کو سلطان سے پوشیدہ رکھا۔ یہ سازش اتنی گہری تھی اور اس قدر احتیاط سے تیار کی گئی تھی کہ سلطان کو انگریزوں کے حملے کی خبر اُس وقت تک نہ ہوئی جب تک کہ ان کی فوجیں بنگلور تک نہ پہنچ گئیں۔

سلطان ٹیپو کی شہادت

سلطان نہایت اولوالعزم آدمی تھا اور مصائب میں حوصلہ ہارنا اسے آتا ہی نہ تھا۔ باوجود یکہ اس کا نصف ملک اس کے قبضے سے نکل گیا تھا مگر اس کی ہمت پست نہیں ہوئی بلکہ اس نے سلطنت کا اندرونی نظم و نسق درست کرنے اور اسلامی ممالک سے امداد حاصل کر کے انگریزوں سے ایک فیصلہ کن جنگ کرنے کی تیاری شروع کر دی۔ ادھر 1797ء میں مشہور انگریز مدبر لارڈ ولزلی ہندوستان کا گورنر جنرل ہو کر آیا جسے فرانسیسیوں اور مسلمانوں دونوں سے نفرت تھی۔ چونکہ فرانسیسی سلطان ٹیپو کی حمایت کر رہے تھے اور سلطان کی شجاعت اور طاقت کا شہرہ بھی یورپ تک پہنچ چکا تھا اس لئے اس نے ہندوستان آتے ہی سلطان کی طاقت کا خاتمہ کرنے کی کوششیں شروع کر دیں۔ اس نے نظام اور مرہٹوں سے سلطان کے خلاف خفیہ معاہدہ کیا اور اس کے دربار سے قلعوں تک سازش کا جال بچھا دیا۔ 22 فروری 1798ء کو انگریزی نظام اور مرہٹوں کی متحدہ فوجوں نے سلطان ٹیپو کی حدود سلطنت پر حملہ کر دیا مگر سلطان کے مشیروں اور امرائے سلطنت میر صادق، پورنیہ، غلام علی لنگڑا، میر معین الدین، میر قاسم اور میر فخر الدین نے آخر وقت تک سلطان کو انگریزوں کی پیش قدمی سے بے خبر رکھا جب دارالسلطنت سرنگا پٹم سے متحدہ فوجیں تین دن کی مسافت پر رہ گئیں تو سلطان کو اطلاع ہوئی۔ سلطان بجلی کی سی سرعت سے مقابلے پر پہنچا اور انگریزی فوجوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ اس دوران دوسری جانب سے متحدہ فوجوں نے سرنگا پٹم پر حملہ کر دیا۔ مجبوراً سلطان دارالسلطنت کو بچانے کے لئے واپس آیا۔ مگر یہاں بھی اس کی امرائے دربار اور سردارانِ فوج نے غداری کی اور میر قاسم نے فصیل کے کمزور حصے پر گولہ باری کر کے اس میں شگاف ڈال دیا۔ یہ دیکھ کر سلطان خود اس شگاف پر آ کھڑا ہوا اور یہیں مٹھی بھر جاں نثاروں کے ساتھ دشمن کی ٹڈی دل فوجوں کا مقابلہ کرتے ہوئے 4 مئی 1799ء کو شہید ہو گیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اس طرح جنوبی ہند بلکہ سارے ہندوستان سے انگریزوں اور مرہٹوں کے سب سے طاقتور مسلمان حریف کا خاتمہ ہو گیا۔ جنگ پلاسی اور جنگ بکسر کے بعد یہ تیسری جنگ تھی جس نے ہندوستان خصوصاً مسلمانانِ ہند کی قسمت کا فیصلہ کر دیا اور انگریزوں کے قدم نہایت مضبوطی سے جم گئے۔

حافظ رحمت خاں

سلطان ٹیپو کی شہادت سے قبل ایک اور سانحہ پیش آیا جس نے شمالی ہندوستان کے مسلمانوں کی قوت کو بہت ضعف پہنچایا۔ نواب نجیب الدولہ کے انتقال کے بعد اس علاقے کی صورت حال نہایت خراب ہو گئی تھی۔ نواب اودھ شجاع الدولہ کی خود غرضی اور فتنہ پردازی نے بھی مسلمانوں کو سخت نقصان پہنچایا۔ روہیل کھنڈ کا حکمران حافظ رحمت خاں جس کی فوجیں پانی پت کی جنگ میں نجیب الدولہ اور احمد شاہ ابدالی کی معیت میں نہایت مردانگی کے ساتھ مرہٹوں سے نبرد آزما ہوئی تھیں، اب شجاع الدولہ، مرہٹوں اور انگریزوں کی حریصانہ نگاہوں کا مرکز بنا ہوا تھا۔ شمالی ہند میں اب یہی ایک ایسا مسلمان حکمران رہ گیا تھا جو دینی حمیت سے سرشار نہایت اولوالعزم، بڑا بہادر اور ایک بڑی ریاست کا سربراہ تھا۔ انگریز اور مرہٹے دونوں اسے اپنے اپنے عزائم کی راہ میں سب سے بڑا خطرہ سمجھتے تھے۔ ادھر شجاع الدولہ کی ہر ممکن کوشش یہی تھی کہ حافظ رحمت خاں کا خاتمہ کر کے روہیل کھنڈ کی اس سب سے بڑی اسلامی ریاست پر قبضہ کر لے۔ اس مقصد کے لئے اس نے انگریزوں اور مرہٹوں سے ساز باز کرنے میں کوئی باک محسوس نہ کی اور 1774ء میں ان متحدہ فوجوں نے حافظ رحمت خاں پر حملہ کر دیا۔ ضلع شاہجہاں پور کے قصبہ میراں پور کٹرہ میں دونوں فوجوں کے درمیان جنگ ہوئی۔ اگرچہ حافظ رحمت خاں کی فوج متحدہ فوج سے تعداد اور سامانِ حرب میں بہت کم تھی مگر حافظ صاحب نے بڑی مردانگی سے مقابلہ کیا اور عین میدان جنگ میں توپ کا گولہ لگنے سے شہادت پائی۔ اس طرح انگریزوں اور مرہٹوں کا ایک بہادر اور مضبوط حریف اور ایک نام نہاد مسلمان حکمران کی سازش کے نتیجے میں ان کے راستے سے ہٹ گیا۔ ایک اور اسلامی ریاست کا چراغ گل ہو گیا جس کا سربراہ ذہنی لحاظ سے حضرت شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے مکتبہ فکر سے تعلق رکھتا تھا۔

سید احمد شہیدؒ کا جہادِ آزادی

انگریزوں اور مرہٹوں کے بعد اب مسلمانانِ ہند کو سب سے زیادہ نقصان سکھوں سے پہنچ رہا تھا۔ نواب عبدالصمد خاں، میر معین الملک اور احمد شاہ ابدالی نے ان پر پے در پے حملے کئے اور کاری ضربیں لگا کر ان کی طاقت کو کمزور کر دیا۔ یہ درست ہے کہ اب ان کے میرٹھ اور دلی پر قبضے کے منصوبے خاک میں مل گئے تھے مگر مرکز کی کمزوری اور پنجاب کے مقامی مسلمان سرداروں کی نااتفاقی نے ماحول کو سکھوں کے لئے سازگار بنا دیا۔ ادھر افغانستان میں اندرونی خلفشار پیدا ہو گیا اور پنجاب کے جن علاقوں پر افغانوں کا تسلط تھا وہاں کے حاکموں کو معقول کمک نہ مل سکی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سکھوں نے پھر سر اٹھایا اور اب کے وہ مسلوں یعنی جتھوں کی شکل میں نمودار ہوئے۔ اس طرح پنجاب کے مختلف علاقوں پر سکھوں کی بارہ مختلف مسلیں قابض ہو گئیں جن کے ہاتھ پنجاب کے عوام خصوصاً مسلمانوں کو ناقابلِ بیان مظالم برداشت کرنے پڑے۔ بیشتر علاقوں میں باجماعت نمازیں موقوف ہو گئیں، مساجد سنسان، مقبرے ویران اور آبادیوں میں ہو کا سماں نظر آنے لگا۔ شریف مسلمان کمین بنا دیئے گئے، نچلے طبقے کے مسلمانوں کی بہو بیٹیاں جس طرح رسوا کی گئیں ان کی نظیر چشم فلک نے کم ہی دیکھی ہو گی۔ ان مسلوں کے سردار نہایت درجے کے جاہل، سفاک اور انتظامی صلاحیتوں سے قطعاً عاری تھے ان کی آپس میں بھی جنگیں ہوتی رہتی تھیں اور ان جنگوں میں بھی مفتوحہ علاقے کے مسلمانوں کو ظلم و ستم کا نشانہ بننا پڑتا تھا۔ آخر سکھوں کی ایک مِسل سکر چکیا کے سردار رنجیت سنگھ نے افغانوں کے حکمران شاہ زماں کی ایک خدمت سرانجام دے کر اس سے خوشنودی کا پروانہ اور لاہور کی حکومت حاصل کر لی۔ نواں کوٹ کے ایک مسلمان رئیس محکم دین نے رنجیت سنگھ کی امداد کی اور وہ 1799ء میں لاہور پر قابض ہو گیا۔ رنجیت سنگھ بلاشبہ ایک اولوالعزم اور بیدار مغز حکمران تھا۔ اس نے سکھوں کو متحد کر کے ایک وسیع حکومت قائم کر لی اور پشاور سے کشمیر اور ملتان کی سرحدوں تک اس کی حکومت کا دائرہ وسیع ہو گیا لیکن ظلم و ستم اور لوٹ مار میں وہ کسی سکھ سردار سے کم نہ تھا۔ اب تک مسلمانوں پر جو مظالم غیر منظم طریقے سے ہو رہے تھے رنجیت سنگھ نے بقول مولانا غلام رسول مہر انہیں منظم شکل دے دی۔ اس کے ہاتھوں پنجاب کے مسلمان بلبلا رہے تھے اور صوبہ سرحد تک مسلمانوں میں ایک حشر برپا تھا۔

حضرت سید احمد شہیدؒ کی اصلاحی تحریک

یہ تھے وہ حالات جنہوں نے رائے بریلی کے ایک سید زادے کو بے قرار کر دیا۔ وہ پنجاب و سرحد کے مسلمانوں کی امداد کے لئے اٹھا اور سخت نامساعد حالات کے باوجود معجزانہ طور پر پشاور کے مطلع پر نمودار ہو گیا۔ اس مرد مومن کا نام سید احمد تھا جو ہماری ملی تاریخ میں سید احمد شہیدؒ کے معزز و محترم نام سے مشہور ہے۔ حضرت سید احمد شہیدؒ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی طرح اللہ تعالیٰ کے ان برگزیدہ بندوں میں تھے جنہیں وہ اپنی خاص حکمتوں کے تحت دنیا میں مامور فرماتا ہے۔ بلاشبہ وہ اپنی صدی کے مجدد تھے۔ انہوں نے احیائے دین کی اسی تحریک کو زندہ کیا جسے حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ نے جاری فرمایا تھا۔ حضرت شاہ ولی اللہ کی طرح ان کی تحریک کے بھی دو حصے تھے۔ اول مسلمانوں کی اخلاقی و روحانی اصلاح۔ دوم ان کی مادی ترقی' روحانی و اخلاقی اصلاح کے تحت انہوں نے مسلمانوں کے سامنے سب سے پہلے اسلام کی اصل تصویر پیش کی اور ان غلط عقائد اور قبیح رسوم کی نشاندہی کی جو صدہا سال سے غیر مسلموں کے ساتھ رہنے بسنے سے مسلمانوں نے اختیار کر لی تھیں۔ شرک اور بدعات کے خلاف ان کا جہاد بجائے خود اتنا بڑا کارنامہ ہے جو انہیں مجدد کے مقام پر فائز کرتا ہے۔ ان کی کوشش سے ہزاروں مسلمان جو نام کے مسلمان تھے کام کے مسلمان بن گئے۔ بہتوں نے منشیات اور فسق و فجور سے توبہ کر لی اور بد رسومات ترک کر کے مومنین کی صف میں شامل ہو گئے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ کی طرح حضرت سید احمدؒ نے بھی بیعت لی اور اس طرح ایک ایسی جماعت تیار کی جو خود بھی پاکیزہ زندگی بسر کرتی تھی اور دوسروں کو بھی پاکیزہ زندگی بسر کرنے کی تلقین کرتی تھی۔ خوش قسمتی سے حضرت سید احمد شہید کو ایک ایسا مرید باصفا مل گیا جس نے ان کی تحریک کو آگے بڑھانے اور اسے مقبول بنانے میں نمایاں کردار ادا کیا۔ یہ خاندان ولی اللہ کے چشم و چراغ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ تھے جو علم و فضل کے زیور سے آراستہ ہونے کے ساتھ ساتھ ڈاکٹر ہنٹر کے بقول اپنے زمانے کے بہت بڑے جرنیل بھی تھے۔ انہوں نے حضرت سید احمد شہیدؒ کی تحریک کے دونوں حصوں کو پایہ تکمیل تک پہنچانے میں آخر وقت تک اپنے مرشد کا ساتھ دیا۔

عسکری تحریک

جیسا کہ قبل ازیں عرض کیا جا چکا ہے کہ حضرت سید احمد شہید کے دو مقاصد تھے۔ مقصد اول یعنی مسلمانوں کے عقائد و اعمال کی اصلاح میں جب کسی قدر کامیابی حاصل ہو گئی اور نیک نفس اور پاکیزہ کردار مسلمانوں کی ایک جماعت تیار ہو گئی تو آپ نے اس جماعت کو مقصد دوم کے حصول کا ذریعہ بنایا۔ یعنی مسلمانوں کو غیر مسلموں کی غلامی سے نجات دلانا خصوصاً سکھوں کے جبر و استبداد کا خاتمہ۔ آپ نے ملک کے مختلف حصوں میں اپنے داعی بھیج کر مسلمانوں کو سکھوں کے خلاف جہاد میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ چنانچہ آپ کے مبلغوں کی کوشش سے ایسے جانباز آپ کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو گئے جنہوں نے اپنی جانیں اسلام کی سربلندی اور مظلوم مسلمانوں کو ظالموں کے پنجے سے نجات دلانے کے لئے وقف کر دیں۔

ضروری انتظامات کے بعد سید صاحب 17 جنوری 1826ء کو اپنے وطن رائے بریلی سے روانہ ہوئے اور وہاں سے گوالیار' ٹونک' اجمیر' جودھپور' میرپور' ٹنڈو الہ یار' حیدرآباد' شکار پور اور کوئٹہ ہوتے ہوئے افغانستان میں داخل ہوئے اور وہاں سے قندھار اور غزنی ہوتے ہوئے نومبر 1826ء میں پشاور پہنچ گئے۔ جس وقت آپ رائے بریلی سے روانہ ہوئے تو آپ کے ساتھ پانچ سو مجاہدین کی مختصر سی جماعت تھی لیکن چارسدہ پہنچ کر یہ تعداد ڈیڑھ ہزار ہو چکی تھی۔ ظاہر ہے کہ یہ ایک ہزار مجاہدین رائے بریلی سے پشاور تک کے طویل سفر میں آپ کے ساتھ شامل ہوئے تھے۔

پشاور پر سید صاحب کا غلبہ

چارسدہ پہنچنے کے بعد سید صاحب نے شمال مغربی صوبہ سرحد کا دورہ کیا اور افغانوں کے قصبات و قریات تک دعوت جہاد پہنچائی۔ اس دعوت کا افغانوں پر خاطر خواہ اثر ہوا اور سینکڑوں پٹھان آپ کے جھنڈے تلے جمع ہو گئے۔ اسی دوران میں ہندوستان سے مجاہدین کے قافلے زر نقد اور سامان جنگ لے کر آپ کے پاس پہنچے۔ ان مجاہدین میں متعدد بنگالی' پنجابی اور سندھی سرفروش بھی تھے۔ سید صاحب کی بڑھتی ہوئی طاقت دیکھ کر سکھ خائف ہو گئے اور آپ کا راستہ روکنے کے لئے میدان میں آ گئے۔ اکوڑہ خٹک' حضرو اور شیدو مضافات نوشہرہ میں سکھوں سے سید صاحب کی متعدد جنگیں ہوئیں جن میں ایک (شیدو) کے سوائے باقی سب میں مجاہدین کو کامیابی ہوئی اور سکھوں کو زبردست جانی نقصان اٹھانا پڑا۔ رفتہ رفتہ سابق صوبہ سرحد کا بہت بڑا علاقہ جس میں پشاور بھی شامل تھا سید صاحب کے زیر نگیں آ گیا۔ اس علاقے میں آپ کے نام کا خطبہ پڑھا جانے لگا۔ سید صاحب شمال مغربی صوبہ میں چار سال سے کچھ زیادہ عرصے تک مقیم رہے اور افغانوں کے اخلاق و عادات اور ان کی معاشرتی و روحانی اصلاح میں مصروف رہے۔ آپ کی کوشش سے عرصہ دراز کے بعد یہاں اسلامی قوانین کا نفاذ عمل میں آیا۔ فسق و فجور کا خاتمہ اور یہ علاقہ ایک نئے رنگ میں رنگ گیا۔

سرداران پشاور کی سازشیں

سید صاحب کے تسلط سے جہاں شمال مغربی سرحدی صوبہ کے مسلمانوں کی حالت میں دینی لحاظ سے تغیر پیدا ہو گیا وہاں غریب مسلمان بھی خانوں کے ظلم و ستم سے نجات پا گئے۔ اب کسی کو کمزور پر دست درازی کی جرأت نہ ہوتی تھی لیکن اس سے سرداران پشاور اور بعض دیگر علاقوں کے افغان سردار گھبرا گئے کیونکہ اس طرح امیر و غریب' چھوٹے اور بڑے سب ایک سطح پر آ گئے تھے اور یہ مساوات ان سرداروں کے مزاج کے خلاف تھی جو سالہا سال سے نفس پرستی اور کبر و نخوت کے سرکش گھوڑے پر سوار تھے۔ یہ لوگ آزاد اور معصیت کی زندگی گزارنے کے عادی تھے۔ سید صاحب نے ان پر جو پابندیاں عائد کر دی تھیں وہ ان کے خوگر نہ تھے۔ ادھر سکھ بھی سید صاحب کی قوت سے خائف تھے اور اپنے ایجنٹوں کے ذریعے افغان عوام میں سید صاحب کے خلاف بے چینی اور بددلی پھیلانے کی پوری کوشش کر رہے تھے۔ چنانچہ ان کے خلاف سازشیں شروع ہو گئیں۔ ان سازشوں میں ملاؤں نے بھی سرگرم حصہ لیا جن کی مذہبی دوکانیں سید صاحب کے آنے سے بند ہو گئی تھیں۔ سرداران پشاور کے ساتھ مل کر ان ملاؤں نے عوام الناس کو سید صاحب کے خلاف بھڑکایا اور اس عہد کے سب سے بڑے مومن بلکہ امیر المومنین کے خلاف کفر کے فتوے دینے سے بھی اجتناب نہ کیا۔ عجیب بات ہے کہ سکھوں کو جو اس وقت پنجاب میں سب سے بڑی طاقت تھے سید صاحب کی ہیبت کی وجہ سے پشاور پر حملہ کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ مگر خود پشاور اور سرحد کے بعض سرداروں اور ملاؤں نے ان کے خلاف ایسی ریشہ دوانیاں کیں کہ انہیں یہ علاقہ خالی کرنا پڑا بلکہ مسلمانوں کا خون بہایا اور بہت سے مجاہدین کی جانیں تلف ہو گئیں۔ یہ صورت حال دیکھ کر سید صاحب پشاور سے روانہ ہوئے اور مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے اپریل 1831ء میں بالاکوٹ پہنچے جو ضلع ہزارہ کا نہایت محفوظ مقام ہے۔

سید صاحب کی شہادت

آپ کا منصوبہ یہ تھا کہ بالاکوٹ کو مرکز بنا کر کشمیر میں جہاد کیا جائے جہاں سکھوں نے مسلمانوں پر عرصۂ حیات تنگ کر رکھا تھا۔ کشمیر اور ہزارہ کی فتح کے بعد پھر پنجاب کا رخ کیا جائے اور مسلمانوں کو سکھوں کے ظلم و ستم سے نجات دلا کر ان علاقوں میں اسلامی حکومت قائم کی جائے۔ مگر افسوس کہ غداروں اور سازشوں نے یہاں بھی آپ کا منصوبہ کامیاب نہ ہونے دیا۔ ابتداء میں بالاکوٹ کے لوگوں خصوصاً وہاں کے افغان سرداروں نے آپ کی مہمان

نوازی اور پذیرائی میں بہت اخلاص کا مظاہرہ کیا مگر جب انہوں نے دیکھا کہ سیّد صاحب کے اسلامی قوانین نافذ کر رہے ہیں اور ان کے افعال کی باز پرس کر رہے ہیں جس سے ان کی آزادی پابندی میں بدل رہی ہے تو وہ سیّد صاحب کے مخالف ہو گئے۔ ادھر سکھوں اور سردارانِ پشاور کی سازش سے علماء کا ایک فتویٰ بالاکوٹ اور نواحی علاقوں میں تقسیم کیا گیا جس میں سیّد صاحب اور ان کے رفقاء کو کافر قرار دیا گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ سیّد صاحب کی مخالفت شروع ہو گئی اور یہاں کے خوانین ان کی امداد سے دست کش ہو کر بالائی پہاڑوں پر چلے گئے۔ ادھر سکھوں کو جب سیّد صاحب کی پشاور سے روانگی اور بالاکوٹ میں آمد کا علم ہوا تو ان کا ایک بہت بڑا لشکر شیر سنگھ کی قیادت میں بالاکوٹ کے قریب آ پہنچا۔ اگر اس علاقے کے بعض لوگ غداری اور سکھوں کی رہنمائی نہ کرتے تو یہ لشکر بالاکوٹ کے دشوار گزار پہاڑی راستوں سے گزر کر نیچے نہیں اتر سکتا تھا۔ اگرچہ دشمن کی طاقت سیّد صاحب کی جماعت سے کم از کم دس گنا زیادہ تھی اور بعض لوگوں نے سیّد صاحب کو مشورہ بھی دیا کہ سکھوں سے کھلے میدان میں لڑنے کی بجائے محفوظ جگہ پر جنگ کرنی چاہئے مگر قضا و قدر کے فیصلوں کو کون بدل سکتا ہے۔ سیّد صاحب نے دشمن کے سامنے سے فرار ہونا گوارا نہ کیا اور کھلے میدان میں نبرد آزما ہو گئے۔

اس میں شبہ نہیں کہ سیّد صاحب اور آپ کے رفقاء نے حیرت انگیز شجاعت سے جنگ کی جس کا سکھ جرنیلوں نے بھی اعتراف کیا۔ حضرت شاہ اسماعیل شہید نے جو سیّد صاحب کے امیر لشکر یا سپہ سالار تھے مردانگی کا بے نظیر نمونہ دکھایا لیکن آخر سیّد صاحب نے مع شاہ اسماعیل دادِ شجاعت دیتے ہوئے شہادت پائی۔ ان کے ساتھ بکثرت مجاہدین بھی شامل ہو گئے جن میں ہندوستانیوں' پنجابیوں اور سندھیوں کے علاوہ وفادار افغانوں کی ایک جماعت بھی شامل تھی اس طرح 6/مئی 1836ء کو یہ تحریک اپنوں کی غداری اور بے وفائی کے ہاتھوں ختم ہو گئی اور سیّد صاحب جن لوگوں کی رستگاری کے لئے اپنا عیش و آرام اور گھر بار چھوڑ کر اور اُس زمانے میں ہزاروں میل کا دشوار گزار اور تکلیف دہ سفر کر کے آئے تھے انہوں نے ہی سیّد صاحب سے آنکھیں پھیر لیں۔ ہمارے خیال میں جنگِ پلاسی اور ٹیپو سلطان کی شہادت کے بعد یہ تیسرا بڑا حادثہ' سانحہ یا المیہ تھا جو ہندوستان کے مسلمانوں کو پیش آیا اور جس کے نتیجے میں اس سرزمین میں احیائے اسلام کی آخری کوشش بھی ناکام ہو گئی۔

برصغیر پر انگریزوں کا مکمل تسلط

سراج الدولہ' سلطان حیدر علی' سلطان ٹیپو' نواب نجیب الدولہ' نواب رحمت خان اور سیّد صاحب شہیدؒ' غرض وہ تمام لوگ ایک ایک کر کے رخصت ہو چکے تھے جو احیائے دین کے لئے جدوجہد کر رہے تھے۔ اب میدان میں کوئی ایسی شخصیت باقی نہ رہی تھی جو مسلمانوں کو غیر ملکی استعمار کے مقابلے میں صف آراء کرتی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انگریزوں کے عزائم نے آخری کروٹ لی اور انہوں نے سب سڈی ایری سسٹم کے ذریعے ایک ایک کر کے تمام آزاد ریاستوں کو ختم کر دیا۔ اب بنگال' بہار' اڑیسہ' مدراس' بمبئی' اودھ' روہیل کھنڈ اور سارا جنوبی ہند مکمل طور پر انگریزوں کے زیر اقتدار آ چکا تھا صرف پنجاب اور سندھ باقی رہ گئے تھے۔ سندھ اس وقت تک آزاد سلطنت تھی جس پر تالپور خاندان کے امراء کی حکومت تھی۔ مگر انگریزوں کو اس آزاد اسلامی حکومت کا وجود کب گوارا ہو سکتا تھا۔ چنانچہ انہوں نے ایک معمولی سے واقعے کو بہانہ بنا کر فروری 1843ء میں امیران سندھ سے جنگ چھیڑ دی۔ امیروں کو شکست ہوئی اور سندھ بھی انگریزی حکومت میں شامل کر لیا گیا۔

اب قابل ذکر علاقہ صرف پنجاب کا رہ گیا تھا جو ابھی تک انگریزوں کی سلطنت سے باہر تھا۔ مگر رنجیت سنگھ کی وفات نے انگریزوں کے لئے یہ راستہ بھی صاف کر دیا۔ سکھ سرداروں میں خانہ جنگی شروع ہو گئی جس سے فائدہ اٹھا کر 11/دسمبر 1845ء' پھر جنوری 1849ء اور آخر میں فروری 1849ء میں لاہور' جلیانوالہ اور گجرات کے مقام پر انگریزوں نے سکھوں سے نبرد آزمائی کی اور انہیں سخت جانی و مالی نقصان پہنچا کر پنجاب پر بھی مکمل طور پر قبضہ کر لیا۔ گجرات کے قریب سکھوں کو ایسی سخت شکست ہوئی کہ وہ اپنا توپ خانہ اور دوسرا ساز و سامان جنگ تک چھوڑ کر بھاگ گئے۔ دلیپ سنگھ کو معزول کر کے انگلستان بھیج دیا گیا۔ اس کی ذاتی جاگیر' زیورات' طلائی برتن حتیٰ کہ ریشمی اور کامدار پارچات بھی انگریزوں نے اپنے قبضے میں لے لئے۔

1857ء کی بغاوت

پنجاب پر انگریزوں کے قبضے کے بعد سارا ہندوستان ان کے زیر نگیں آ گیا اور اب کوئی شخصیت ایسی باقی نہ رہی جو ان کے اقتدار کو چیلنج کرتی۔ اس لئے اُن میں تکبر اور اہل ہند کے خلاف نفرت و حقارت کے جذبات پیدا ہو گئے۔ ہندوستانی سپاہیوں کی بھی وہ عزت نہ کی جاتی تھی جس کے وہ مستحق تھے حالانکہ یہی وہ لوگ تھے جنہوں نے بنگال سے پشاور اور ہمالیہ کی ترائی سے راس کماری تک کا ہزاروں میل علاقہ اپنی تلوار سے فتح کر کے انگریزوں کو دیا تھا مگر اس کے صلے میں انہیں گالیاں دی جاتی تھیں اور ان سے سخت بدسلوکی کی جاتی تھی۔ جب ان کی ان جانکاہ خدمات کی قدر نہ ہوئی تو وہ فطرتاً انگریزوں سے دل برداشتہ ہو گئے۔ انہوں

"ندائے خلافت" کے خصوصی تحقیقی شمارے

اگر آپ نے اب تک دیکھے ہوں نہ پڑھے ہوں' تو آج ہی خط لکھ کر طلب فرمایئے۔ بہتر ہے کہ آپ "ندائے خلافت" کے سالانہ رُکنیت قبول کیجئے۔

فلسطین نمبر

سرزمین انبیاء کے بارے میں ایک دستاویزی شمارہ۔ حضرت ابراہیمؑ سے لے کر اسرائیل کے غاصبانہ قبضے تک کی داستان۔ (35 روپے)

اقبال نمبر

اس کا اصل نام "پیامِ اقبال بنام نوجوانانِ ملت" ہے۔ نوجوان طلبہ و طالبات کے لئے علامہ اقبال کی شاعری اور نثر کے منتخبات کا پہلا حسین' رنگین مجموعہ۔ (50 روپے)

عراق نمبر

امریکا نے عراق پر حملہ کر کے اپنی دانست میں فتح حاصل کر لی' لیکن "ندائے خلافت" برابر امریکا کے تعاقب میں ہے۔ امریکا کو شکست دے کر رہے گا۔

(20 روپے)

نظریۂ پاکستان نمبر

نظریۂ پاکستان اور ہے' دو قومی نظریہ اور دونوں نظریوں کی مشترکہ تاریخ کا الگ الگ تذکرہ۔

قیمت 50 روپے

تحریکِ پاکستان نمبر

جب دو قومی نظریہ بالآخر نظریۂ پاکستان (اسلام) میں ضم ہو گیا تو مسلمانانِ ہند نے ایک عظیم الشان تحریک چلائی جسے بیسویں صدی کی سب سے بڑی تحریک کہا جاتا ہے۔ (زیر تحقیق)

ندائے خلافت۔ 36 کے' ماڈل ٹاؤن' لاہور

نے دور دراز علاقوں میں جانے کے لئے بھتہ میں اضافے کا مطالبہ کیا مگر ان کا یہ مطالبہ بھی نہایت سختی سے رد کر دیا گیا۔ غرض انگریزوں کے وسیع اقتدار ان کی ناانصافیوں اور غیر دانش مندانہ حرکات نے صورت حال کو اس درجہ خراب کر دیا کہ 1857ء میں وہ ہنگامہ رونما ہوا جس نے انگریزی حکومت کی بنیادیں ہلا ڈالیں۔ اس ہنگامے کے اسباب تو اسی وقت جمع ہونے لگے تھے جب کلائیو نے 1757ء میں پلاسی کے میدان میں نواب سراج الدولہ پر بلاوجہ اور جارحانہ حملہ کر کے اسے شکست دی اور بنگالے میں انگریزی سلطنت کی بنیاد رکھ دی لیکن اس وقت اس کا ردعمل ظاہر نہ ہوا اور ایک سو سال تک یہ مواد پکتا رہا۔ بعد کے واقعات نے اس کی شدت میں اور اضافہ کر دیا۔ انگریزوں نے جن حکمرانوں کی ریاستوں پر قبضہ کر لیا تھا وہ اور ان کے جانشین سب سے زیادہ دل برداشتہ تھے۔ ان علاقوں کے عوام میں بھی ایسے لوگوں کی کمی نہ تھی جو انگریزوں کے اقتدار کو نفرت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ صرف یہی نہیں کہ انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کر کے اہل ہند کو سیاسی لحاظ سے غلام بنا لیا تھا بلکہ انہوں نے ایک قدم اور آگے بڑھ کر یہ احمقانہ حرکت کی کہ اپنے مذہب کا جوا بھی ان کے کندھے پر رکھنا چاہا۔ پادریوں نے علی الاعلان ہندوؤں اور مسلمانوں کے مذاہب پر اعتراض کرنے شروع کئے اور خصوصاً مسلمانوں کے اکابر پر ناروا حملے کئے۔ پولیس کو حکم دیا گیا کہ وہ ایسے اجتماعات میں پادریوں کے ہمراہ رہے جن میں عیسائیت کی تبلیغ اور ہندوستانیوں کے مذہب کی تنقیص کی جاتی تھی۔ بعض انگریز حکام نے اپنے ہندوستانی ماتحتوں کو حکماً اپنے بنگلوں پر بلایا اور پادریوں کے لیکچر سننے پر مجبور کیا جن میں اہل ہند کی سخت دل آزاری کی جاتی تھی۔ 1837ء کی قحط سالی میں کچھ ہندوستانی لڑکوں کو ان کی کسمپرسی اور بے چارگی سے فائدہ اٹھا کر عیسائی بنا لیا گیا۔ اس طرح تمام مغربی و شمالی علاقوں کے لوگ یہ سمجھنے لگے کہ انگریز ہر مفلس و محتاج کو اپنے مذہب میں لے آئیں گے۔

سرسید احمد خان کے بقول اس ہنگامے کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ انگریزوں نے حکومت کے معاملات میں ہندوستانیوں کو شریک نہیں کیا بلکہ ان پر نرے آقا بن کر حکومت کرتے رہے۔ اس سے عوام اور حکومت میں نفرت اور بُعد پیدا ہونے لگا۔ اس کے علاوہ اس کا ایک سبب معاشی بدحالی بھی تھا۔ ریاستوں کی ضبطی سے ہزاروں افراد جو ان ریاستوں کے حکمرانوں سے وابستہ تھے بے روزگار ہو گئے۔ تجارت پر انگریزوں کے قبضے کی وجہ سے بھی ملکی منڈیوں اور ملکی صنعتوں پر نہایت خراب اثر پڑا اور ہزاروں خاندان روٹیوں کو محتاج ہو گئے۔ اس کے علاوہ جنگ و جدل اور کشت و خون ریزی کی وجہ سے گاؤں کے گاؤں اور شہر کے شہر ویران ہو گئے۔ ہزاروں افراد جن میں بڑے بڑے شرفاء بھی شامل تھے در بدر خاک چھاننے لگے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت حال سے ملک کا اقتصادی ڈھانچا تباہ ہو گیا اور لوگوں میں انگریزوں کے خلاف نفرت پیدا ہونے لگی۔

1856ء میں اودھ کے حکمران واجد علی شاہ کو معزول کر کے انگریزوں نے اس ریاست پر بھی قبضہ کر لیا۔ یہ بغاوت سے ایک سال قبل کا واقعہ ہے اور اگر اسے بغاوت کے فوری اسباب میں سے ایک بڑا سبب قرار دیا جائے تو غلط نہ ہو گا۔ انگریزوں کی فوج میں اس علاقے کے ہندوستانی سپاہیوں کی خاصی بڑی تعداد تھی جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے وطن پر بھی غلامی کے تاریک بادل امنڈ آئے ہیں اور ان کے بادشاہ کو انگریزوں نے نظر بند کر دیا ہے تو قدرتاً انہیں اس واقعے کا رنج ہوا اور وہ دل ہی دل میں انگریزوں سے نفرت کرنے لگے۔ اس سے قبل ہندوستان کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر سے وائسرائے ہند لارڈ کیننگ نے اس ''حکم'' کی تعمیل کرائی کہ بادشاہ کا خطاب اور قلعہ پر تصرف صرف ان کی زندگی تک ہے۔ ان کے بعد ان کے بیٹے کو شہزادہ اور ولی عہد ضرور کہا جائے گا اور وظیفہ بھی دیا جائے گا مگر وہ بادشاہ نہیں کہلائیں گے نہ انہیں قلعے میں رہنے کی اجازت ہو گی بلکہ اس میں انگریزی فوج متعین کر دی جائے گی۔

اس ''حکم نامے'' کا بہادر شاہ ظفر، شہزادوں اور دہلی کے لوگوں پر نہایت خراب ردعمل ہوا اور انہوں نے سمجھ لیا کہ اب اس برائے نام بادشاہت کا بھی خاتمہ ہو رہا ہے اس طرح ان میں انگریزوں کے خلاف سخت نفرت پیدا ہو گئی۔

اس ہنگامے کی آخری اور فوری وجہ وہ کارتوس تھے جو ہندوستانی سپاہیوں کو دیئے گئے تھے اور جنہیں استعمال کرنے سے پہلے ان پر چربی لگائی ہوتی تھی اس کے بعد ان کا سرا دانتوں سے کاٹنا پڑتا تھا۔ ہندوؤں کا خیال تھا کہ اس میں گائے کی چربی شامل ہے اور مسلمان سمجھتے تھے کہ سور کی۔ اس طرح ہمارے مذہب کو خراب کیا جا رہا ہے۔ ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ جب ان ہندوستانی سپاہیوں نے ان کارتوسوں کو استعمال کرنے سے انکار کر دیا تو ان پر فوجی عدالت میں مقدمہ چلا کر دس سال قید مشقت کی سزا دی گئی اور فوج کو پریڈ کرا کر سب کے سامنے انکار کرنے والوں کی وردیاں اتار کر ہتھکڑیاں لگائی گئیں اور انہیں جیل کو روانہ کر دیا گیا۔

واقعاتِ بغاوت

ظاہر ہے کہ ہندوستانی سپاہیوں کے ساتھ یہ ذلت آمیز سلوک ایسا نہ تھا جسے خاموشی سے برداشت کر لیا جاتا۔ یہ 9 مئی کا واقعہ ہے۔ دوسرے روز یعنی 10 مئی کو اتوار تھا ۔ جب شام کو انگریز عبادت کرنے کی غرض سے گرجا چلے گئے تو سپاہی اور ان کے ہندوستانی افسر ہتھیار لے کر بیرکوں سے نکل آئے اور جیل کے دروازے کھول کر قیدیوں کو رہا کر دیا۔ اس کے بعد ان مشتعل ہندوستانی سپاہیوں نے اپنے انگریز افسروں کے بنگلوں کا رخ کیا اور انہیں لوٹ کر نذرِ آتش کر دیا۔ انگریزی فوج کے دستے سے ان کی جھڑپ ہوئی اور اس میں بہت سے انگریز مارے گئے۔ یہ ہندوستان میں اس بغاوت کا نقطۂ آغاز تھا جس کے اسباب خود انگریز گزشتہ ایک سو سال سے پیدا کر رہے تھے۔ اس کے بعد باغی فوجیں دہلی کی طرف روانہ ہو گئیں اور لال قلعہ پہنچ کر مغلوں کے آخری بادشاہ بہادر شاہ ظفر سے درخواست کی کہ ان کی سرپرستی فرمائی جائے۔ پہلے تو بادشاہ نے انکار کیا اور ان سے کہا ''میرے پاس تنخواہ دینے کے لئے خزانہ ہے نہ ملک جہاں سے روپیہ حاصل ہو، نہ فوج ہے جس سے تمہاری مدد کروں۔ میں تو نام کا بادشاہ ہوں۔ بہتر ہے کہ تم لوگ مجھے میرے حال پر چھوڑ دو'' مگر جب سپاہیوں اور ان کے ہندوستانی افسروں نے بادشاہ سے کہا کہ ہم نہ آپ سے روپیہ مانگتے ہیں نہ فوجی امداد۔ ہم تو صرف یہ چاہتے ہیں کہ آپ ہماری سرپرستی قبول فرمالیں اور تختِ سلطنت پر رونق افروز ہو جائیں۔ آپ کے اقبال سے ہم سب کچھ حاصل کر لیں گے تو بہادر شاہ ظفر نے ان کی درخواست قبول کر لی اور ان کی بادشاہت کا اعلان کر دیا گیا۔ دہلی میں جتنے انگریز تھے ان میں سے بہت سے قتل کر دیئے گئے اور شہر پر باغیوں کا قبضہ ہو گیا۔

جب میرٹھ کی بغاوت اور دہلی پر باغیوں کے قبضے کی خبر ہندوستان کے دوسرے علاقوں میں پہنچی تو وہاں بھی بغاوت کی آگ بھڑک اٹھی اور دیکھتے ہی دیکھتے لکھنؤ، کانپور، بریلی، بجنور، شاہجہاں پور، الہ آباد، علی گڑھ، آگرہ، جھانسی، گوالیار اور کالپی وغیرہ میں ہندوستانی فوجیوں نے ہتھیار سنبھال لئے۔ اور اپنے انگریز افسروں کو قتل کر کے ان شہروں پر قبضہ کر لیا۔ شروع شروع میں ہر جگہ باغیوں کو کامیابی ہوئی مگر جب پانچ ماہ کے بعد ستمبر 1857ء میں انگریزوں نے سکھ فوج کی امداد سے دہلی پر قبضہ کر لیا تو بغاوت کی اس تحریک کو سخت دھچکا لگا۔ گو اس کے بعد بھی لکھنؤ، کانپور، شاہجہاں پور، گوالیار، جھانسی اور کالپی وغیرہ میں انگریزوں سے باغی فوجوں کے نہایت خون ریز مقابلے ہوئے اور بعض مقامات پر باغی فوجوں نے اس بے جگری اور عسکری قابلیت سے جنگ کی کہ خود انگریز حیرت زدہ رہ گئے اور انہیں سخت شکست ہوئی۔ مگر چونکہ بغاوت کے اصل مرکز یعنی دہلی پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا تھا اور جس بادشاہ (بہادر شاہ ظفر) کے نام پر یہ جنگ لڑی جا رہی تھی وہ انگریزوں کا قیدی بن چکا تھا اس لئے یہ جنگ زیادہ عرصے

جاری نہ رہ سکی اور نہ اس میں باغیوں کو کامیابی حاصل ہوئی۔ رفتہ رفتہ انگریزی فوجوں نے ایک ایک شہر پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ گو ان میں سے بعض شہروں میں باغیوں نے نہایت پامردی سے مقابلہ کیا۔ گوالیار' جھانسی اور کالپی باغیوں کے آخری گڑھ تھے جب یہ بھی فتح ہو گئے تو بغاوت کا شعلہ سرد پڑ گیا۔

فاتحین کا انتقام

سرسید احمد خان اور ان کے ہم خیال بزرگوں کا اندازہ درست ثابت ہوا اور بغاوت ایک سال جاری رہنے کے بعد ناکامی پر منتج ہوئی۔ اس بغاوت کے بعد ہندوستان کے مسلمانوں کا جو حشر ہوا اس کے تصور سے بھی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ انگریزوں نے باغیوں کے ساتھ ساتھ بے گناہ لوگوں سے بھی ایسا خوفناک اور ظالمانہ انتقام لیا کہ چنگیز اور ہلاکو کے مظالم بھی بے حقیقت نظر آنے لگے۔ سب سے پہلے اہل دہلی کی شامت آئی۔ انگریزوں کا شہر پر قبضہ ہوتے ہی اہل شہر خصوصاً مسلمانوں نے بھاگنا شروع کر دیا۔ وہ شریف زادیاں جن کے دوپٹے کا پلو بھی کسی نے نہ دیکھا تھا کھلے منہ عزت و آبرو کے ڈر سے بھاگ رہی تھیں۔ بیمار اور بوڑھے جن سے قدم اٹھانا مشکل تھا گھسٹ گھسٹ کر شہر سے نکل رہے تھے۔ اس عالم میں پشتوں سے جمع کیا ہوا گھر کا اثاثہ تو کجا کپڑے اور زیور بھی لے جانا مشکل تھا۔ بے شمار لوگ شہر سے بھاگتے ہوئے انگریزی فوجوں کی سفاکی کا نشانہ بنے۔ جو اس دار و گیر سے بچے انہیں اجڈ دیہاتیوں نے لوٹ مار کا نشانہ بنایا جو لوگ شدید بیماری' ضعف' بڑھاپے یا وطن کی محبت کی وجہ سے شہر نہ چھوڑ سکے انہیں اس جرمِ بے گناہی میں قتل کر دیا گیا۔ ان مقتولوں میں سب سے زیادہ ننانوے فیصد مسلمان تھے۔

''سکھ فوجی جس گلی کوچے میں کسی مسلمان کو وجیہہ یا تنومند دیکھتے اسے اپنا شکار بنا کر دل کو ٹھنڈا کرتے۔ ان کے ہاتھ سے بہت سے معزز خاندانی مسلمان جو بدقسمتی سے شہر میں رہ گئے تھے' مارے گئے' وہ بوڑھے باپوں کے سامنے جوان بیٹیوں کو مارتے اور باپ کو کہتے کہ چلا جا''۔ انگریز فوجی افسر اسیروں سے پوچھتے کہ ہندو یا مسلمان؟ جو شخص اپنے آپ کو مسلمان بتاتا اسے گولی مار کر ختم کر دیا جاتا یا پھانسی پر لٹکا دیا جاتا۔ مسلمانوں کو برہنہ کر کے زمین پر لٹایا گیا ان کی مشکیں کسی گئیں اور پھر انہیں سر سے پاؤں تک گرم تانبے سے داغ دیا گیا۔ سکھوں اور انگریز فوجیوں نے مسلمان قیدیوں کو زندہ آگ میں جلا دیا اور ان کے تڑپنے اور جلنے کا تماشا دیکھتے رہے۔ زندہ مسلمانوں کو سور کی کھال میں جلایا گیا۔ بعض کو مجبور کیا گیا کہ وہ ایک دوسرے کے ساتھ بدفعلی کریں۔ سینکڑوں مسلمانوں کو ایک چھوٹے سے برج میں ٹھونس دیا گیا اور جب انہیں قتل کرنے کے لئے باہر نکالا گیا تو ان میں سے 45 آدمی گرمی کی شدت اور دم گھٹنے کی وجہ سے ایڑیاں رگڑ رگڑ کر مر چکے تھے۔ بہت سے لوگوں کو اس جرم میں پھانسی دے دی گئی کہ انگریزی فوجوں کے مارچ کے وقت ان کے چہرے دوسری طرف کیوں تھے۔ ان پھانسی پانے والوں میں عوام الناس بھی تھے' اہل علم و فضل بھی تھے' سردار اور رئیس بھی تھے۔ شہزادے بھی تھے۔ دلی کے پاس جتنے شہزادے پکڑے گئے' ان کی تعداد انتیس بیان کی جاتی ہے۔ ان میں بوڑھے' لنگڑے' بیمار سب کے سب پھانسی پر لٹکا دیئے گئے حتیٰ کہ میرزا محمود شاہ اکبر شاہ بادشاہ کا پوتا وجع المفاصل میں مبتلا تھا اس کی لاش پھانسی پر گولا لاٹھی بنی ہوئی لٹکتی رہی۔

انگریزی فوج کے رسوائے زمانہ افسر ہڈسن نے بادشاہ کے تین بیٹوں کو کپڑے اتروا کر اپنے ہاتھ سے گولی کا نشانہ بنایا اور ان کی لاشیں کوتوالی کے سامنے ڈال دیں جہاں ان کی بوٹیاں گدھ' کتے نوچتے رہے۔ ہزاروں مسلمان اور شریف خاندان کی عورتیں عصمت دری کے ڈر اور کوچہ گردی کی رسوائی سے بچنے کے لئے کنوؤں میں گر کر مر گئیں۔ فوج کے افسروں اور سپاہیوں کو لوٹ کھسوٹ کر کھلی چھٹی دے دی گئی۔ انہوں نے کوئی گھر نہ چھوڑا جس کا صفایا نہ کیا ہو۔ مکانوں کے صحن اور دیواریں کھود کھود کر دفینے نکالے گئے۔ قیمتی سامانوں کے ساتھ ساتھ چھتوں کی کڑیاں' تختے اور کیواڑ تک اتار کر لے گئے۔ الفنسٹن کے بقول اس لوٹ کھسوٹ کی کارروائی نے نادر شاہ کے کارنامے بھی جلا دیئے۔ مساجد ویران ہو گئیں ان کے قیمتی پتھر نکال لئے گئے۔ بعض سرے سے منہدم کر دی گئیں۔ شاہی مسجد کو اصطبل بنا دیا گیا۔ سکھ فوجی اس میں گھوڑے باندھتے' شراب پیتے اور سور ذبح کر کے پکاتے اور انگریزوں کے ساتھ ان کے کتے بھی مسجد میں پھرتے رہے۔

یہ صرف ایک دہلی کی تباہی اور مسلمانوں کی بربادی کی نامکمل تصویر ہے ورنہ اس شہر اور مسلمانوں پر جو قیامت گزر گئی اس کی تفصیلات کے لئے دفتر درکار ہوں گے۔ اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ باقی شہروں اور ان کے ساکنوں پر کیا بیتی ہو گی۔

ہم یہ نہیں کہتے کہ اس بغاوت میں ہندوستانی فوجوں نے اخلاقی پابندی کی۔ بلاشبہ انہوں نے بھی بعض شرمناک حرکتیں کیں اور بہت سی انگریز عورتوں اور ان کے معصوم بچوں کو نہایت سفاکی سے قتل کیا۔ نانا صاحب کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انگریزوں کو پناہ دینے کے باوجود اس وقت قتل کرا دیا جب وہ کشتیوں میں بیٹھ کر دریا پار اتر رہے تھے۔ یقیناً کوئی منصف مزاج اور شریف آدمی ان قبیح اور ظالمانہ افعال کی تائید نہیں کر سکتا۔ مگر ایک یا چند افراد کی مجنونانہ اور ظالمانہ حرکات کا انتقام بے گناہ لوگوں اور شہری آبادی سے لینا اخلاق کے کون سے ضابطے کے تحت جائز ہے اور پھر انتقام بھی ایسا ہولناک جس نے خود منصف مزاج انگریزوں کو بھی لرزہ براندام کر دیا۔ سب سے زیادہ قابل ذکر بات یہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف ہتھیار اٹھانے والوں میں ہندو اور مسلمان برابر کے شریک تھے بلکہ باغیوں کی اکثریت ہندو سپاہیوں پر مشتمل تھی مگر انتقام کا نشانہ اکثر و بیشتر مسلمانوں کو بنایا گیا۔ اسی اندیشے کے پیش نظر سرسید اور ان کے ہم خیال لوگوں نے کوشش کی تھی کہ مسلمان اس بغاوت میں شریک نہ ہوں کیونکہ وہ جانتے تھے کہ اس کی زد مسلمانوں پر پڑے گی۔

20

علمائے دیوبند کی ایک تاریخی نشست

پچھلے باب میں ہندوستان میں احیائے اسلام کی تحریکوں کا ذکر ہوا جو 1857ء کے ہنگامے پر موقوف ہوا' لیکن تجدید و احیائے اسلام کا جذبہ و محرک تو ایک دائمی چیز ہے اور 1857ء کے بعد سے بھی جاری ہے اور ہنوز جاری ہے۔ انگریزوں کے اقتدار میں آنے کے بعد صورت حال مزید پیچیدہ ہو گئی۔ 1857ء سے 1947ء تک' یہ پوری صدی فکری و سیاسی انقلاب کی صدی تھی۔ ہندوؤں نے انگریزوں کے زیر سایہ انڈین نیشنل کانگریس بنائی۔ مسلمانوں نے آل انڈیا مسلم لیگ بنا لی۔ کانگریس نے متحدہ قومیت کا نظریہ دیا۔ مسلم لیگ نے جداگانہ نیابت کا مطالبہ کیا جو کانگریس کی ہٹ دھرمی کے باعث رفتہ رفتہ دو قومی نظریے کی راہ سے ''مطالبۂ پاکستان'' بن گیا۔

مسلمانوں کے تحفظ کے لئے سرسید احمد خان نے علی گڑھ کالج بنایا۔ اسلام کے تحفظ کے لئے مولانا قاسم نانوتوی اور اُن کے رفقاء نے مدرسہ دیوبند قائم کیا۔ کیسے کیسے عظیم لوگ اس صدی میں مسلمانانِ ہند کے کارواں میں پیدا ہوئے۔ آخر میں جب ''قرارداد پاکستان'' سامنے آئی تو مسلم زعماء اور جماعتوں نے پوری شدت وقوت سے احیائے اسلام کی تحریک کو آزادیٔ ہند کے پیش منظر میں کھنگالا اور اپنے اپنے تجزیے اپنے اپنے رنگ اور انداز میں پیش کئے۔ مولانا ابوالکلام آزاد تو پورے کے پورے کانگریس کے ہم نوا ہی نہیں' بلکہ اُس کے صدر نشین تھے۔ دوسرے مسلم اکابرین میں علامہ مشرقی اور اُن کی خاکسار جماعت' مولانا مودودی اور اُن کی جماعتِ اسلامی' مولانا سید احمد حسین مدنی اور اُن کی جمعیت العلمائے ہند' مجلس احرار اور اِن بزرگوں سے ذرا پہلے مولانا احمد رضا خان فاضل بریلوی اور مولانا اشرف علی تھانوی' سب حضرات اپنا اپنا نقطۂ نظر رکھتے تھے اور بلا خوف وخطر بیان کرتے تھے۔ موضوع ایک ہی تھا کہ ''مسلمانانِ ہند کا مفاد کس چیز میں ہے۔ انگریزوں سے آزادی حاصل کرنے کی صورت میں یا ہندوؤں کے ساتھ ایک قوم' ایک بھارت کا نظریہ اختیار کیا جائے' یا مسلمانوں کے لئے ایک علیحدہ مستقل مرکز قائم کیا جائے جہاں اسلام کے اصول واحکام پر عمل کرنے کی آزادی ہو''۔

مسلم لیگ خالصتاً ایک سیاسی جماعت تھی اور دو قومی نظریے کی بنیاد پر روز بروز طاقت اتنی تیزی سے پکڑ رہی تھی کہ دیر سے چلی آنے والی دینی جماعتیں انگشت بدنداں رہ گئیں۔ بہت سے لوگ کٹ کٹ کر مسلم لیگ کے اِس مرے کی چھاؤں میں چلے گئے ''مسلم ہے تو مسلم لیگ میں آ''۔ جب 1945ء کے انتخابات میں مرکزی اسمبلی کی 30 میں سے 30 نشستیں مسلم لیگ نے حاصل کر لیں تو دینی جماعتوں کا اندرونی نظام ہل گیا۔ بہت سوں نے دیرینہ رائے سے رجوع کر لیا۔ بعض نے کچھ ترمیم کر لی۔ بعض نے دلائل کا رخ بدل لیا۔ سب سے عجیب صورت حال دارالعلوم دیوبند میں ہوئی۔ اُس کی قیادت کے صف اول کے لوگ مثلاً علامہ شبیر احمد عثمانی' مفتی محمد شفیع' مولانا احتشام الحق تھانوی وغیرہم نے کھل کر علی الاعلان اپنے تمام علم اور اپنی پوری عملی طاقت کا وزن پاکستان کے حق میں ڈال دیا اور یوں فکری ونظری لحاظ سے اتنی مستحکم جماعت دو لخت ہوگئی۔

لیکن دینی جماعتوں کی یہ سب کوششیں' خواہ متحدہ قومیت کے حق میں تھیں یا پاکستان کے حق میں' بہرحال اسلام اور مسلمانوں کے تحفظ کے لئے مبنی بر اخلاص تھیں۔ ہمارے جو بزرگ جو متحدہ قومیت کے حق میں تھے وہ بھی اسلام کی خاطر' اسلام ہی کی وجہ سے تھے اور اس کے لئے اپنے دلائل رکھتے تھے۔ جو بزرگ پاکستان کے حق میں تھے' وہ بھی اسلام کی بالادستی اور اسلام ہی کی خاطر اپنے دلائل رکھتے تھے۔ یہ صورتِ حال کتنی دلچسپ اور اسلام دوستی کا کتنا بڑا مظاہرہ تھا کہ ایک ہی جماعت کے صف اوّل کے قائدین ایک جگہ بیٹھ کر باہم گفتگو کیا کریں کہ مسلمانانِ ہند کے مفادات کا تقاضا کیا ہے۔

یہاں ہم بطور مثال ایک ایسی ہی نشست کا حال آپ کو سناتے ہیں۔ یہ تاریخی نشست 7 دسمبر 1945ء کو دیوبند میں ہوئی تھی۔ ایک طرف پاکستان کے حق میں بولنے والے علامہ شبیر احمد عثمانی تھے اور دوسری طرف اُن کے رُوبرو پاکستان کے مخالف علماء مولانا سید حسین احمد مدنی اور اُن کے رفقاء مفتی کفایت اللہ دہلوی' مولانا احمد سعید دہلوی' مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی' مولانا عبدالحلیم صدیقی' مولانا عبدالحنان اور مفتی عتیق الرحمٰن شریک گفتگو تھے۔ اس نشست میں مطالعۂ پاکستان کے موضوع پر ان جید علمائے دین کے درمیان جو گفتگو ہوئی' اُسے طاہر احمد القاسمی صاحب (رکن مجلس عاملہ' آل انڈیا جمعیت علمائے اسلام) نے ''مکالمۃ الصدرین'' کے عنوان سے ایک کتابچے کی صورت میں شائع کر دیا تھا۔ یہ کتابچہ قائداعظم اکیڈمی' کراچی کے تاریخی ریکارڈ میں محفوظ ہے۔ وہاں سے ہفت روزہ ''تکبیر'' نے نقل کیا۔ اور اب ''تکبیر'' کی آواز ''ندائے خلافت'' میں شامل ہو کر آپ تک پہنچ رہی ہے۔

پیش لفظ

7 دسمبر 1945ء

وہ معرکۃ الآراء مکالمہ جو اس وقت ناظرین کے ہاتھوں میں ہے فی الحقیقت تمام مسلمانوں کے لئے ایک شمع ہدایت ہے جس سے بآسانی وہ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ مسلمانوں کی فلاح وبہبود اور ان کا استقلال کس راستہ پر چلنے سے حاصل ہو سکتا ہے۔ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی جو اس وقت ہندوستان کے یگانۂ روزگار علماء میں سے ہیں اور جو جماعت دیوبند کے مسلم اکابر میں سے ہیں ان کا تبحر علمی محتاجِ تشریح نہیں۔ تبحر علمی کے ساتھ ساتھ ان کی سیاسی معلومات سونے پر سہاگہ ہے۔ حضرت علامہ عثمانی اور وفد جمعیت العلماء ہند کے درمیان گفت وشنید کو احقر نے قلم بند کیا اور جہاں وضاحت کی ضرورت سمجھی وہاں قوسین میں عبارت کا اضافہ کر دیا تاکہ مکالمہ کی اصل عبارت میں امتیاز رہے۔ احقر نے مزید احتیاط یہ کی کہ حضرت علامہ عثمانی کو یہ تمام مکالمہ قلم بند کر کے حرفاً حرفاً دکھلایا اور حضرت ممدوح نے جہاں جہاں ترمیم یا اضافہ کی ضرورت سمجھی وہ فرما دیا یہ کہنا درست ہے کہ یہ مکالمہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی صاحب کا مصدقہ ہے۔ خدا تعالیٰ اس کے ذریعے سیاسی پیچیدگیوں میں الجھے ہوئے مسلمانوں کو صاف اور روشن راستہ دکھلائے اور مسلمان زیادہ سے زیادہ تعداد میں اپنے قومی وسیاسی پلیٹ فارم کی ضرورت واہمیت کو تسلیم کر کے دامے' درمے' قدمے' سخنے مساعی ہوں۔

طاہر احمد القاسمی از آستانہ' قاسمی دیوبند

9 محرم الحرام 365ھ مطابق 25 دسمبر 1948ء

گفت وشنید کی ابتدا کیسے ہوئی؟

غالباً یکم دسمبر 1645ء کو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب سیوہاروی ناظم اعلیٰ جمعیت العلماء ہند دہلی اپنی کسی ضرورت سے دیوبند تشریف لائے تھے۔ اس وقت وہ حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی کے دولت کدہ پر بھی بغرض عیادت ومزاج پرسی حاضر ہوئے۔ دورانِ مزاج پرسی میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے علامہ عثمانی سے فرمایا کہ ہمیں کچھ آپ سے حالاتِ حاضرہ پر نیازمندانہ گزارشات کرنی ہیں۔ مسئلہ پر شرعی حیثیت سے تو ہم آپ سے کیا گفتگو کرتے' یہ درجہ تو ہمارا نہیں' البتہ کچھ واقعات ایسے بیان کرنے ہیں جن کے متعلق ہمارا خیال ہے کہ شاید وہ آپ کے علم میں نہ آئے ہوں۔ ممکن ہے کہ ان واقعات کو سن کر حضرت والا کی جو رائے قائم شدہ ہے اس میں تغیر ہو جائے۔

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ میں گفتگو کے لئے ہر وقت حاضر ہوں۔ جب دل چاہے تشریف لائیں۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ اس گفتگو میں میرے ساتھ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب عثمانی (ناظم ندوۃ المصنفین دہلی برادر زادہ علامہ عثمانی) کوئی تیسرے صاحب جو مناسب ہوں شریک ہوں گے۔ اس کے بعد 5 دسمبر 45ء کو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا دہلی سے ایک خط بذریعہ ڈاک بنام علامہ عثمانی موصول ہوا جو بجنسہ درج ذیل ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کا خط

بنام حضرت علامہ عثمانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

از ندوۃ المصنفین دہلی

۲۷/ذی الحجہ ۳۶۴ھ

ذوالمجد والکرم استاذی عوام اللہ فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ مزاج اقدس

کل دیوبند سے نو بجے صبح چل کر دہلی پہنچ گیا۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب سے شب میں گفتگو کے بعد معلوم ہوا کہ جمعیت العلمائے ہند کی ایک خصوصی مجلس مشاورت وہ جمعرات کے روز دیوبند بلانا چاہتے ہیں تاکہ جمعیت العلماء سے متعلق بعض اہم معاملات پر گفتگو ہو سکے۔ اس مشاورت میں غالباً حضرت مفتی صاحب (مولانا کفایت اللہ صاحب) اور مولانا احمد سعید صاحب بھی شرکت فرمائیں گے۔

میں نے اپنے اس معروضہ کے پیش نظر جو حضرت والا میں حاضر ہو کر پیش کیا تھا اب یہ مناسب سمجھا کہ مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب اور میں جمعرات کو شب میں پہنچیں اور جمعہ کے دن گزارشات پیش کریں۔ اب میری یہ بھی سعی ہوگی کہ اکابر جمعیت العلماء بھی اس گفتگو میں حصہ لیں تو اکابر علمائے دیوبند کے سیاسی افکار کی یکجہتی میں انشاء اللہ بہت مدد ملے گی۔ اگر میری گزارشات منظور ہو گئیں تو جمعہ کے دن آٹھ بجے یہ گفتگو آپ ہی کے دولت کدہ پر ہو جائے تو بہت بہتر اپنی مشاورت تو شب میں اور باقی دوسرے وقت میں بھی ہو سکتی ہے۔

خادم محمد حفظ الرحمٰن کان اللہ لہٗ

27/ذی الحجہ 1364ھ

اس پروگرام کے بموجب 7 دسمبر 1945ء یوم جمعہ کو ساڑھے آٹھ بجے (1) حضرت مولانا حسین احمد صاحب صدر جمعیت العلمائے ہند (2) حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحب سابق صدر جمعیت العلمائے ہند (3) حضرت مولانا احمد سعید صاحب سابق ناظم اعلیٰ جمعیت العلمائے ہند (4) مولانا حفظ الرحمٰن صاحب صاحب حال ناظم اعلیٰ جمعیت العلماء ہند (5) مولانا عبدالحلیم صاحب صدیقی (6) مولانا عبدالحنان صاحب (7) مولانا مفتی عتیق الرحمٰن صاحب' علامہ عثمانی کے دولت کدہ پر تشریف لائے۔ علامہ عثمانی نہایت خندہ پیشانی کے ساتھ ان حضرات سے ملے۔ کچھ دیر مزاج پرسی ہوتی رہی۔ عیادت کے بعد چند منٹ مجلس پر سکوت طاری رہا۔ یہ خاموشی غالباً اس لئے تھی کہ کون ابتدا کرے اور کس نوعیت سے مسئلہ پر گفتگو کا آغاز ہو۔

چونکہ علامہ عثمانی کو ابتدا کرنا مقصود نہ تھا اور یہ حضرات خود تشریف لائے تھے اس لئے علامہ عثمانی بھی خاموش رہے۔ آخر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے مسائل حاضرہ پر گفتگو کی ابتداء کی اور ایک طویل تقریر فرمائی جو تقریباً پون گھنٹہ جاری رہی۔ علامہ عثمانی برابر اس تقریر کو بغور سنتے رہے۔ جب وہ تقریر فرما چکے تو علامہ عثمانی نے فرمایا کہ مجھے پورے الفاظ اور اجزا تو آپ کی لمبی چوڑی گفتگو سے محفوظ نہیں رہے البتہ جو تلخیص میرے ذہن میں آئی ہے اس کے جوابات بلالحاظ ترتیب عرض کروں گا۔ اگر کوئی ضروری بات رہ جائے تو آپ یاد دلا کر اس کا جواب مجھ سے لے سکتے ہیں۔

اس گفت وشنید کا سلسلہ سوا تین گھنٹے مسلسل جاری رہا۔ اس مکالمہ میں سب سے زیادہ حصہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب لیتے رہے اور دوسرے درجے میں مولانا احمد سعید صاحب ان کے شریک رہے۔ کبھی کبھی اور صاحب بھی کچھ بول پڑتے تھے لیکن حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے جو مزاج پرسی کے بعد سکوت اختیار فرمایا وہ ختم مجلس تک ختم نہیں ہوا۔ کسی موقعہ پر بھی ایک حرف نہیں بولے۔

علامہ عثمانی کو اس طویل سکوت پر خود حیرت تھی وہ بحث میں تو کیا حصہ لیتے اشارۃً کنایۃً بھی کسی موضوع پر اثباتاً یا نفیاً کسی طرح کا اظہار خیال نہیں فرمایا۔ آخر مجلس میں حضرت مولانا حسین احمد صاحب مدنی کچھ بولے جو تقریباً دس پندرہ منٹ سے زیادہ نہ تھا۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تقریر کا خلاصہ

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی تقریر کا خلاصہ یہ تھا کہ کلکتہ میں جمعیت العلمائے اسلام حکومت کی مالی امداد اور اس کے ایماء سے قائم ہوئی ہے۔ مولانا آزاد سبحانی جمعیت العلمائے اسلام کے سلسلہ میں دہلی آئے اور حکیم دلبر حسن صاحب کے ہاں قیام کیا جن کی نسبت عام طور پر لوگوں کو معلوم ہے کہ وہ سرکاری آدمی ہیں۔ مولانا آزاد سبحانی صاحب اسی قیام کے دوران میں پولیٹیکل ڈیپارٹمنٹ گورنمنٹ آف انڈیا کے ایک مسلمان اعلیٰ عہدہ دار سے ملے جن کا نام بھی قدرے شبہ کے ساتھ بتلایا گیا اور مولانا آزاد نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ہم جمعیت العلماء ہند کے اقتدار کو توڑنے کے لئے ایک علماء کی جمعیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ گفتگو کے بعد طے ہوا کہ گورنمنٹ ان کو کافی امداد اس مقصد کے لئے دے گی۔ چنانچہ ایک بیش قرار رقم اس کے لئے منظور کر لی گئی اور اس کی ایک قسط مولانا آزاد سبحانی صاحب کے حوالہ بھی کر دی گئی۔ اس روپیہ سے کلکتہ میں کام شروع کیا گیا۔ مولوی حفظ الرحمٰن صاحب نے کہا کہ یہ اس قدر یقینی روایت ہے کہ اگر آپ اطمینان فرمانا چاہیں تو ہم اطمینان کرا سکتے ہیں۔ چنانچہ مولانا آزاد سبحانی صاحب نے اس کے بعد کلکتہ میں جلسہ کیا۔ جلسہ میں انہوں نے جو کچھ بکواس کی وہ آپ کے علم میں ہے۔ ان کی تلون مزاجی بھی سب کو معلوم ہے۔ ایک زمانہ میں وہ گاندھی کے ساتھ سایہ کی طرح رہتے تھے۔ پھر کچھ دنوں بعد ان کے خلاف ہو گئے۔ بہرحال اس مسلمان افسر کا تبادلہ ہو گیا اور ایک ہندو اس کی جگہ آ گیا۔ جس نے گورنمنٹ کو ایک نوٹ لکھا۔ جس میں دکھلایا گیا کہ ایسے لوگوں یا انجمنوں پر حکومت کا روپیہ صرف ہونا بالکل بے سود ہے۔ اس پر آئندہ کے لئے امداد بند ہو گئی۔ اس ضمن میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے کہا کہ مولانا الیاس صاحب رحمتہ اللہ علیہ صاحب کی تبلیغی تحریک کو بھی ابتداءً حکومت کی جانب سے بذریعہ حاجی رشید احمد صاحب کچھ روپیہ ملتا تھا' پھر بند ہو گیا۔ اس کے بعد مولوی حفظ الرحمٰن صاحب نے پاکستان کی صورت میں جو نقصانات ان کے نزدیک تھے' وہ ذرا بسط کے ساتھ بیان کئے اور دکھلایا کہ مسلمانوں کے لئے نظریۂ پاکستان سراسر مضر ہے۔

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ آپ نے کلام اس قدر طویل کر دیا ہے کہ نمبروار ہر ایک چیز کا جواب دینا مشکل ہے۔ میں جو کچھ یاد رکھ سکا ہوں ان کے جوابات دوں گا۔ اگر کسی چیز کو بھول جاؤں تو آپ مجھے یاد دلا کر اس کا جواب لے لیں۔

علامہ عثمانی کا جواب

پہلے میں اس معاملہ کی نسبت گفتگو شروع کرتا ہوں جو روایت آپ نے بیان کی' میں نہ اس کی تصدیق کرتا ہوں نہ تکذیب۔ ممکن ہے کہ آپ صحیح کہتے ہوں۔ مجھے اس سے پہلے ہی بذریعہ ایک گمنام خط کے (جو دہلی سے ڈالا گیا تھا) یہی بتلایا گیا تھا اور مجھے بھی اس خط میں دھمکی دی گئی تھی۔ یہ روایت صحیح ہو یا غلط۔ بہرحال میرے علم میں آ چکی ہے۔ لیکن اس روایت سے مجھ پر کیا اثر پڑ سکتا ہے اور میری رائے کیا متاثر ہو سکتی ہے؟ میں نے جو رائے پاکستان وغیرہ کے متعلق قائم کی ہے وہ بالکل وہ بالکل خلوص پر مبنی ہے۔ جمعیت العلمائے اسلام میں آزاد سبحانی رہیں یا نہ رہیں جمعیت العلماء اسلام خود قائم رہے یا نہ رہے میری رائے جب بھی یہی رہے گی کہ مسلمانوں کے لئے پاکستان مفید ہے۔ اگر میں تھوڑی دیر کے لئے اس روایت کو تسلیم بھی کر لوں کہ جمعیت العلمائے اسلام گورنمنٹ کے ایما پر قائم ہوئی ہے تو میں آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ کانگریس کی ابتدا کس نے کی تھی اور کس طرح ہوئی تھی؟ آپ کو معلوم ہے کہ ابتداءً اس کا قیام ایک وائسرائے کے اشارہ پر ہوا (اور برسوں وہ گورنمنٹ کی وفاداری کے راگ الاپتی رہی ہے۔ (مرتب) بہت سی چیزوں کی ابتدا غلط ہوتی ہے مگر انجام میں بسا اوقات وہی چیز سنبھل جایا کرتی ہے۔ ہم نے مولانا آزاد سبحانی یا جمعیت العلماء اسلام کی وجہ سے مسلم لیگ کی تائید نہیں کی بلکہ دیانتاً یہ رائے قائم کی ہے کہ مسلمانوں کا ایک مرکز اور ایک پلیٹ فارم ہونا چاہئے اور علماءِ ملت کے اس کی پشت

پناہی اور اصلاح میں جدوجہد کرنی چاہئے۔ عام دستور ہے کہ جب کوئی شخص کسی سیاسی جماعت یا تحریک کا مخالف ہو تو اسی قسم کی باتیں اس کے حق میں مشتہر کی جاتی ہیں۔ دیکھئے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمتہ اللہ علیہ ہمارے آپ کے مسلم بزرگ و پیشوا تھے۔ ان کے متعلق لوگوں کو یہ کہتے ہوئے سنا گیا کہ ان کو چھ سو روپیہ ماہوار حکومت کی جانب سے دیئے جاتے تھے۔ اسی کے ساتھ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ گو مولانا تھانوی رحمتہ اللہ علیہ کو اس کا علم نہیں تھا کہ روپیہ حکومت دیتی ہے۔ مگر حکومت ایسے عنوان سے دیتی تھی کہ ان کو اس کا شبہ بھی نہ گزرتا تھا۔ اب اسی طرح اگر حکومت مجھے یا کسی شخص کو استعمال کرے مگر اس کو یہ علم نہ ہو کہ اسے استعمال کیا جا رہا ہے تو ظاہر ہے کہ وہ شرعاً اس میں ماخوذ نہیں ہو سکتا۔ اس کے بعد علامہ عثمانی نے اشارہ کر کے فرمایا کہ ان مولوی عتیق الرحمٰن صاحب سے آپ پوچھئے کہ معاملات دارالعلوم کے سلسلہ میں دیوبند کے بعض پارٹی باز اشخاص نے ان کے سامنے نہایت قطعی الفاظ میں کیا یہ نہیں کہا تھا کہ وائسرائے کے دفتر میں ہم اپنی آنکھوں سے وہ چٹھی دیکھ کر آئے ہیں جس کے ذریعہ مولانا مدنی کو شبیر احمد عثمانی نے گرفتار کرایا ہے (فلعنة الله على الكاذبين) لیکن میں پوچھتا ہوں کہ کیا اس میں ذرا بھی کوئی اصلیت ہے۔ اس پر مولوی عتیق الرحمٰن صاحب نے آنکھیں نیچی کر لیں اور خاموش ہو رہے۔ اس کے بعد علامہ عثمانی نے فرمایا کہ آپ حضرات کے متعلق بھی عام طور پر مشہور کیا جاتا ہے کہ آپ ہندوؤں سے روپیہ لے کر کھا رہے ہیں کیا یہ صحیح چیزیں ہیں۔ اب ہمیں ان سب قصوں سے بالکل علیحدہ رہ کر غور کرنا چاہئے کہ کونسا راستہ اختیار کرنے میں مسلمانوں کا فائدہ ہے اور کس راستہ میں ان کا نقصان (قطع نظر اس سے کہ وہ بات انگریز کے ایجنٹ کی زبان سے نکلے یا کوئی ہندو کا دلال کہے۔ (مرتب) لہٰذا اب میں مزید گفتگو سے پہلے تین چیزیں دریافت کرنا چاہتا ہوں؟

گفتگو کا محور

پہلی چیز دریافت طلب یہ ہے کہ (1) جو فارمولا جمعیت العلمائے ہند نے پاکستان کا نعم البدل ظاہر کر کے ملک کے سامنے پیش کیا اور جس کا حوالہ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اپنی تقریر میں بھی دیا ہے اس فارمولا کو آپ حضرات نے کم از کم کانگریس سے منوالیا ہے یا نہیں؟

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اس کا جواب نفی میں دیتے ہوئے کچھ اعذار بیان کئے۔ علامہ عثمانی صاحب کو چونکہ ان اعذار سے کچھ بحث نہیں تھی اس لئے فرمایا کہ اعذار کچھ بھی ہوں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ آپ کا فارمولا کانگریس نے تسلیم کر لیا ہے یا نہیں۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ ہمارا یہ اصول نہیں ہے کہ ہم جنگ آزادی کی شرط کے طور پر ہندوؤں سے کوئی چیز منوالیں۔

(2) دوسری بات یہ کرنی ہے کہ آپ جو کچھ گفتگو اس وقت مجھ سے فرمانا چاہتے ہیں وہ کس تقدیر پر ہے۔ آیا یہ فرض کرتے ہوئے کہ انگریز حکومت ہندوستان سے چلی گئی ہے یا جا رہی ہے یا یہ مان کر ابھی وہ موجود ہے اور سردست جا نہیں رہی۔ گویا جو کچھ لینا ہے اسی سے لینا ہے۔

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ یہ تو ماننا ہی پڑے گا کہ انگریزی حکومت ابھی ہندوستان میں موجود ہے اس کی موجودگی تسلیم کرتے ہوئے جو کچھ لینا ہے اسی سے لینا ہوگا۔

(3) تیسری بات دریافت طلب یہ ہے کہ آپ حضرات جو انقلاب اس وقت چاہتے ہیں وہ فوجی انقلاب ہے یا آئینی۔ اس کا جواب دیا گیا کہ فوجی انقلاب کا تو اس وقت کوئی موقع ہی نہیں نہ فی الحال اس کا امکان ہے نہ اس کے وسائل مہیا ہیں۔ اس وقت تو آئینی انقلاب ہی زیر بحث ہے۔

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ بس اب بحث کا رخ متعین ہو گیا۔ اب کلام اس پر رہے گا کہ سردست انگریزی حکومت کی موجودگی کے باوجود آئینی انقلاب میں کون سا راستہ مسلمانوں کے لئے مفید ہے۔ آیا وہ راستہ جو جمعیت العلماء ہند نے تجویز کیا ہے یا پاکستان کا راستہ جو مسلم لیگ اختیار کر رہی ہے۔

پاکستان کے نقصانات کا اظہار

مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے اپنی طویل تقریر میں فرمایا کہ پاکستان قائم ہونے میں مسلمانوں کا سراسر نقصان اور ہندوؤں کا فائدہ ہے۔ بنگال میں مسلمانوں کی اکثریت 53 فیصد ہے۔ فلاں صوبہ میں اس قدر فلاں میں اتنی اور آسام میں اکثریت دوسروں کی ہے۔ ہر جگہ مسلم اکثریت کے صوبوں میں غیر مسلم اقلیت اتنی زبردست ہے کہ مسلمان اس سے کسی طرح بھی عہدہ برآ نہ ہو سکیں گے اور بہت ہی تھوڑی اکثریت کچھ نہ کچھ کر سکے گی بلکہ ہمیشہ معرض خطر میں رہے گی۔ اُدھر مسٹر جناح یہ کہہ ہی چکے ہیں کہ پاکستان میں جمہوری طرز کی حکومت ہوگی۔ ایسی مشکل میں ظاہر ہے مسلمانوں کو پاکستان سے کوئی بھی فائدہ نہ ہوگا۔ بلکہ تنظیم دولت اور تعلیم وغیرہ میں پست ہونے کی وجہ سے 53 فیصد مسلمانوں کی اکثریت سینتالیس فی صد غیر مسلم اقلیت ہی کے عملاً تابع و محکوم رہے گی۔ سکھ نہایت جنگجو قوم ہے وہ کسی طرح بھی پاکستان قائم نہ رہنے دے گی۔ ادھر جاٹوں کی قوم ہے وہ بھی مسلمانوں کو چین سے نہ بیٹھنے دے گی۔

اس موقعہ پر علامہ عثمانی نے پوچھا کہ کیا آپ کے نزدیک پاکستان کا مطالبہ کرنے والے صوبہ دار چھ پاکستان بنانا چاہتے ہیں یا تمام مسلم اکثریت والے صوبوں کا ایک پاکستان مطلوب ہے؟ جواب دیا گیا کہ نہیں پاکستان تو ایک ہی بنانا چاہتے ہیں۔ علامہ عثمانی نے فرمایا تب صوبجاتی اعداد کی گفتگو اس موقع پر بیکار ہے۔

مولانا عثمانی نے فرمایا تو اس وقت ہم کو پاکستان کی مرکزی حکومت میں یہ دیکھنا چاہئے کہ مسلم اور غیر مسلم آبادی میں کیا تناسب ہے۔ مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کی طرف سے کہا گیا کہ پاکستان میں مجموعی تعداد مسلمانوں کی چھ کروڑ ہوگی اور غیر مسلم تین کروڑ ہوں گے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ یہ تعداد غلط ہے۔ مجموعہ میں مسلمان تقریباً سوا سات کروڑ ہیں۔ لیکن ہم سات کروڑ تسلیم کئے لیتے ہیں اور غیر مسلم جو تین کروڑ سے کم ہیں ان کو پورے تین کروڑ کر لیا جائے۔ اس تعداد سے سات اور تین کی نسبت مسلم و غیر مسلم کے درمیان ہوگی اور مجموعہ آبادی میں آپ کے فرمانے کے مطابق ساٹھ اور چالیس کی نسبت ہوگی یعنی مسلمان ساٹھ فیصد اور غیر مسلم چالیس فی صد ہوں گے (حالانکہ اس صورت میں مجموعہ میں مسلمان واقعتاً ستر فی صد اور غیر مسلم تیس فی صد ہوتے ہیں)

حضرت علامہ کا مسکت جواب

مگر علامہ عثمانی نے اس وقت سے بھی اغماض کر کے اور ان کے ہی بیان کردہ تناسب کو صحیح مان کر اس پر کلام فرمایا۔ آپ نے کہا کہ اب آپ اپنے فارمولا پر نظر ڈالئے کہ اس میں مسلمانوں اور غیر مسلموں کا مرکزی حکومت میں کیا تناسب رہتا ہے تو آپ کے فارمولا کی رو سے مرکز میں چالیس مسلمان ہوں گے اور چالیس ہندو اور بیس فی صدی میں دیگر اقلیتیں ہوں گی۔ اس طرح سے آپ کے فارمولا کے لحاظ سے غیر مسلموں کی تعداد ساٹھ فی صد اور مسلمانوں کی تعداد چالیس فیصد ہوئی اور مسلم لیگ کے پاکستانی فارمولا میں (بقول آپ کے یہی نسبت علی العکس رہے گی) یعنی ساٹھ فی صد مسلمان اور چالیس فی صد غیر مسلم ہوں' حالانکہ حقیقی تناسب پاکستانی فارمولا میں ستر فیصد اور تیس فیصد کا ہوتا ہے اب آپ ہی انصاف سے فرمائیے کہ آپ کے اس فارمولا سے مسلمانوں کو کیا فائدہ پہنچا (ہم اگر ساٹھ فی صد رہتے ہوئے بھی کچھ نہیں کر سکتے تو چالیس فیصد میں کیا کر سکیں گے)

نوٹ: جمعیت العلماء کے فارمولا میں یہ بھی مندرج

ہے کہ خالص اسلامی مسائل میں دو تہائی مسلمان اگر کسی چیز کے مخالف ہوں گے تو وہ چیز مسلمانوں کے لئے قبول نہیں کی جائے گی۔ اس شرط سے کسی درجہ میں مضر امور کا تدارک تو ہو سکتا ہے لیکن باقی مسلمانوں کے حق میں جو ضروری یا مفید امور ہوں ان کے خاطر خواہ حاصل ہونے کی کوئی تدبیر نہیں کیونکہ مرکز میں مسلم تعداد چالیس اور غیر مسلم تعداد ساٹھ فیصد ہوگی۔ ایسی تمام تجاویز غیر مسلم اکثریت کی رحم و کرم پر رہیں گی اور یہ معاملہ بھی کہ خالص اسلامی مسئلہ کون سا ہے (اکثریت ہی فیصلہ کرے گی)

اس موقع پر کہا گیا کہ عیسائی ہمارے ساتھ ہو جائیں گے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ یہ عجیب بات ہے کہ جب پاکستان کا فارمولا سامنے آتا ہے تو عیسائی مسلمانوں سے علیحدہ غیر مسلم بلاک میں شمار کئے جاتے ہیں اور جب جمعیت العلماء ہند کا (مقدس) فارمولا پیش کیا جاتا ہے تو وہی عیسائی گویا کلمہ پڑھ کر مسلمان ہو جاتے ہیں اور مسلمانوں کے سائیڈ میں شمار کئے جانے لگتے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ غیر مسلم سب کے سب بہر صورت ایک ہی شمار ہوں گے (الفکر ملت واحدۃ) اور خالص مسلمانوں کو ان سب کے مقابل رکھ کر مسئلہ پر غور کرنا چاہئے۔ وفد جمعیت العلماء نے آخر کار اس کو تسلیم کر لیا۔

اس قدر اضطراب کیوں؟

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ آپ کا یہ دعویٰ کہ پاکستان قائم ہونے میں سراسر مسلمانوں کا نقصان اور ہندوؤں کا فائدہ ہے اگر صحیح تسلیم کر لیا جائے تو کیا آپ باور کر سکتے ہیں کہ ہندو پاکستان کی مخالفت محض اس لئے کر رہا ہے کہ اس میں مسلمانوں کا نقصان ہے اور وہ کسی طرح بھی مسلمانوں کا نقصان دیکھنے کو تیار نہیں۔ ان کا تو اعلان یہ ہے کہ جو جماعت یا جو شخص بھی پاکستان اور مسلم لیگ کے خلاف کھڑا ہوگا کانگریس اس کی ہر طرح امداد کرے گی۔ (اس وعدہ کا تعلق کسی شخص خاص سے نہیں کانگریس کے پورے ادارے سے ہے) اور ان کا قول ہے پاکستان ہماری لاشوں پر ہی بن سکتا ہے وغیرہ وغیرہ۔ آخر یہ پرزور اور انتہائی مخالفت کیوں ہے؟ اس کے جواب میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ ان کی کوئی مصلحت ہوگی۔ لیکن اس کا کوئی معقول جواب نہیں دیا گیا اور بار بار اس پہلو سے گریز کیا جاتا رہا۔

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اس کی جو کچھ بھی مصلحت ہو آخر آپ حضرات نے بھی کچھ غور کیا کہ وہ مصلحت کیا ہو سکتی ہے۔ میرے نزدیک تو اس کی مخالفت کی وجہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ انگریز کی حکومت تو سر دست اوپر قائم ہے۔

خیرکم من تعلم القرآن وعلمه (حدیث)

ترجمہ: تم میں سے بہترین وہ ہے جو قرآن سیکھے اور سکھائے

شعبہ سمع و بصر کی تیار کردہ سی ڈیز

1۔ **اسلامی انقلاب کا طریق کار سیرت النبی کی روشنی میں**
- ☆ مقرر: ڈاکٹر اسرار احمد
- ☆ چھ گھنٹے پر محیط آٹھ لیکچرز کی ویڈیو
- ☆ Real Media Format میں

New

2۔ **بیان القرآن**
- ☆ مدرس: ڈاکٹر اسرار احمد
- ☆ قرآن مجید کا ترجمہ اور مختصر تشریح دو CDs میں
- ☆ MP3 FORMAT میں

3۔ **خطابات جمعہ (والیم 1 تا 4)**
- ☆ مقرر: ڈاکٹر اسرار احمد
- ☆ ۱۹۹۸ سے لیکر آج تک 160 خطاباتِ جمعہ کا مجموعہ 4 CD's میں جس میں اہم دینی موضوعات اور حالاتِ حاضرہ پر تبصرہ زیر بحث ہے
- ☆ MP3 FORMAT میں

4۔ **الھدیٰ**
- ☆ مقرر: ڈاکٹر اسرار احمد
- ☆ قرآن حکیم کے منتخب نصاب پر مشتمل دین کے جامع تصور سے آگاہی اور دینی تقاضوں کا فہم حاصل کرنے کا موثر قرآنی نصاب
- ☆ MP3 FORMAT میں 44 سلسلہ وار دروس

5۔ **اسلام اور خواتین**
- ☆ مقرر: ڈاکٹر اسرار احمد
- ☆ اہم معاشرتی موضوعات کے بارے میں قرآن و سنت کی راہنمائی پر مشتمل تقاریر جس میں اسلام میں عورت کا مقام، اسلام میں شرعِ حجاب کے احکام، جہاد میں خواتین کا کردار، قرآن اور پردہ جیسے اہم موضوعات شامل ہیں۔
- ☆ MP3 FORMAT میں

6۔ **Basic Themes of Al Quran**

English
- ☆ مقرر: ڈاکٹر اسرار احمد
- ☆ ایمان، شرک، جہاد، نفاق اور خلافت کے موضوعات پر تفصیلی لیکچرز بزبانِ انگریزی
- ☆ MP3 FORMAT میں

7۔ **پاکستان فیصلہ کن دوراہے پر**
- ☆ مقرر: ڈاکٹر اسرار احمد
- ☆ حالاتِ حاضرہ اور ہمارے لئے کرنے کا اصل کام کے سلسلہ میں ایک فکر انگیز خطاب

8۔ **AL-HUDA**

English
- ☆ مقرر: ڈاکٹر اسرار احمد
- ☆ قرآن مجید کے منتخب نصاب پر مشتمل سلسلہ وار تقاریر
- ☆ MP3 FORMAT میں 2 CDs پر مشتمل

9۔ **انٹرنیشنل خلافت کانفرنس (VIDEO)**
- ☆ گزشتہ سال لاہور میں منعقد ہونے والی انٹرنیشنل خلافت کانفرنس کی کاروائی پر مشتمل ویڈیو (تقریباً 9 گھنٹے)
- ☆ Real Media Format میں

10۔ **تلاوت قرآن**
- ☆ تاریخ اسلام کے دو مصری قراء کی آواز میں تلاوت قرآن قاری محمد صدیق المنشاوری اور قاری محمود خلیل الحصری
- ☆ MP3 FORMAT میں

11۔ **بیان القرآن -VCD**
- ☆ 1998 میں ریکارڈ شدہ دورہ ترجمہ قرآن کی ویڈیو۔
- ☆ VCD 108 پر مشتمل
- ☆ بہترین ویڈیو اور ساؤنڈ کوالٹی کے ساتھ
- ☆ قرآن مجید کا Text بھی شامل ہے
- ☆ مقرر: ڈاکٹر اسرار احمد

یہ پروگرام ARY-DIGITAL پر گزشتہ دو سال سے روزانہ دکھایا جا رہا ہے۔

VISIT US AT www.tanzeem.org

One of the biggest Islamic Websites

مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور قرآن اکیڈمی ۳۶۔کے ماڈل ٹاؤن، لاہور۔

Tel: (92-42) 5869501-03 Fax: (92-42) 5834000 E-mail: info@tanzeem.org Web: www.tanzeem.org

جسے آپ خود شروع میں تسلیم کر چکے ہیں' ہندو یہ چاہتا ہے کہ انگریزی حکومت کے زیرِ سایہ دس کروڑ مسلمانوں میں سے ایک شخص کی گردن پر سے بھی ہندو اکثریت کا جوکھی اور کہیں اترنے نہ پائے اور اس طرح مسلمان ہمیشہ انگریز اور ہندو کی ڈبل غلامی میں بااختیار خود بستے ہیں۔ علامہ عثمانی نے کئی بار اس چیز کو ان لوگوں سے پوچھا مگر ادھر سے کوئی شافی جواب ہاتھ نہ آیا۔ اس کے بعد جمعیت العلماء ہند کے وفد کی طرف سے کہا گیا کہ اچھا اگر پاکستان بن جائے تو تین کروڑ کی مسلم اقلیت ہندو صوبوں میں رہے گی' اس کی حفاظت کا کیا انتظام ہوگا۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ ان کے لئے معاہدات کے ماتحت مسلم اقلیت ان کے ہاں اور ہندو اقلیت ہمارے یہاں رہے گی اور ہر ایک کا ہاتھ دوسرے کے تلے دبا رہے گا۔ آخر اکھنڈ ہندوستان میں دس کروڑ مسلمانوں کی حفاظت کس طرح ہوگی۔ اس کے بعد مولانا حفظ الرحمٰن صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب نے موضوعِ گفتگو بدل کر کہا۔

اجی حضرت یہ علی گڑھ کے نیچری علماء کے وقار کے دشمن ہیں۔ یہ لوگ اگر مسلمانوں کے رہنما بن گئے تو دین کو برباد کر دیں گے' علماء کو مٹا دیں گے۔ اسی سلسلہ میں ان بدتمیزیوں کا بھی ذکر کیا گیا جو بعض مقامات میں مولانا حسین احمد صاحب کے ساتھ کی گئی تھیں اسی سلسلہ میں یہ بھی کہا کہ مسلم لیگ راجاؤں' نوابوں' خطاب یافتہ لوگوں کی جماعت ہے۔ سر فیروز خان نون کے متعلق فرمایا کہ وہ حکومت کے اشارہ سے مستعفی ہو کر مسلم لیگ میں داخل ہوئے ہیں اور وہ کھلے طور پر سرکاری آدمی ہیں۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ سر فیروز خان نون کے متعلق میں بحث نہیں کرتا۔ آپ جو چاہیں کہیں لیکن مسٹر جناح کے متعلق کبھی میرا یہ گمان نہیں ہو سکتا کہ وہ سرکاری آدمی ہیں یا وہ کسی دباؤ یا لالچ میں آ سکتے یا کسی قیمت پر خریدے جا سکتے ہیں۔

مولانا احمد سعید صاحب کے اس کہنے پر کہ علی گڑھ کے تعلیم یافتہ اور دوسرے بعض فرقے علماء کا اقتدار مٹانا اور دین کو تباہ کرنا چاہتے ہیں۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ یہ تو مشکلات ہوئیں ان کا حل آپ کے ذہن میں کیا ہے۔ وہ بھی تو فرمایئے۔ اس پر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے اور کچھ خاموشی سی طاری ہوگئی۔ پھر وفد کی طرف سے کہا گیا کہ حضرت آپ ہی فرمائیں کیا حل ہے۔ حضرت علامہ نے فرمایا کہ یہ خوب رہی مشکلات تو بیان فرمائیں آپ نے اور حل بتلاؤں میں۔ آخر آپ نے بھی تو کچھ اس کا حل سوچا ہوگا۔

علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اچھا لیجئے میں ہی اس کا حل عرض کرتا ہوں۔ میرے نزدیک اس کا حل صرف ایک ہے اور وہ یہ کہ آپ سب حضرات مل کر مسلم لیگ میں داخل ہو کر اس پر قبضہ کریں اور ایک دو مہینے دورہ کر کے تین' چار لاکھ دو آنہ والے ممبر مسلم لیگ کے بھرتی کرائیں۔ جب ہمارے ہم خیال ممبران کی اتنی بھاری تعداد مسلم لیگ میں داخل ہو جائے گی تو پھر ہم عوام کے ذریعہ سے جو مفید صورت مسلمانوں کے لئے ہوگی بہ آسانی بروئے کار لائیں گے۔ کیا ہمارا اثر عوام پر اتنا بھی نہیں کہ ہم دو' چار لاکھ ممبران بھرتی کرا سکیں۔ میں اس کے لئے تیار ہوں کہ آپ حضرات کے ساتھ مل کر اس کام میں حصہ لوں۔ میرے نزدیک تو اصلاح کی یہی بہترین شکل ہے۔ اس پر مولانا احمد سعید صاحب نے فرمایا کہ یہ تو صحیح ہے لیکن جب ہم لوگ ایسا کریں گے تو یہ راجے مہاراجے' نواب اور سر' مسلم لیگ سے علیحدہ ہو کر دوسری مسلم لیگ بنا لیں گے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اگر وہ نئی مسلم لیگ بنا لیں گے تو اس سے کیا ہوگا۔ عوام کی طاقت تو ہمارے ہی ساتھ رہے گی۔ (سر شفیع مرحوم نے بھی تو ایک زمانہ میں شفیع لیگ بنائی تھی لیکن اسکا حشر کیا ہوا۔ جب شفیع صاحب رحلت کر گئے ان ہی کے ساتھ ان کی لیگ بھی ختم ہوگئی اور رابطۂ عوام وہ کبھی بھی پیدا نہ کر سکے)

رہا ان بدتمیزیوں کا قصہ جو آپ کے ساتھ ہوئیں اس کے متعلق آپ کو معلوم ہے کہ میں نے جو پیغام جمعیت العلماء اسلام کے اجلاس کلکتہ کے موقعہ پر بھیجا تھا اس میں صاف طور پر لکھ دیا کہ یہ پرلے درجے کی شقاوت وحماقت ہے کہ قائداعظم کو کافر اعظم کہا جائے یا مولانا حسین احمد وغیرہ کے ساتھ کوئی ناشائستہ سلوک کیا جائے۔

اس موقع پر مجھے ایک بات کہنی پڑتی ہے وہ یہ کہ جن انگریزی خواں طلباء کے رویہ کی آپ شکایت فرما رہے ہیں وہ نہ تو آپ کے مرید ہیں نہ شاگرد۔ نہ انہوں نے کسی دینی ماحول میں تربیت پائی ہے (اور سمجھتے یہ ہیں کہ آپ مسلم قوم کو ہندوؤں کی دائمی غلامی میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں) اس کے بالمقابل جو عربی مدارس کے طلباء آپ کے شاگرد آپ کے مرید اور دینی ماحول بلکہ مرکزِ دین واخلاق ہیں تربیت پانے والے ہیں' ذرا ادھر بھی تو دیکھئے کہ انہوں نے کیا کچھ کیا ہے۔ دارالعلوم دیوبند کے طلباء نے جو گندی گالیاں اور اشتہارات اور کارٹون ہمارے متعلق چسپاں کئے جن میں ہم کو ابوجہل تک کہا گیا اور ہمارا جنازہ نکالا گیا۔ آپ حضرات نے اس کا بھی کوئی تدارک کیا تھا۔ آپ کو معلوم ہے کہ اس وقت دارالعلوم نے تمام مدرسین' مہتمم اور مفتی سمیت (باستثناء ایک دو کے) بالواسطہ یا بلاواسطہ مجھ سے نسبتِ تلمذ رکھتے تھے۔ دارالعلوم کے طلباء نے میرے قتل تک کے حلف اٹھائے اور وہ فحش اور گندے مضامین میرے دروازہ میں پھینکے کہ اگر ہماری ماں بہنوں کی نظر پڑ جائے تو ہماری آنکھیں شرم سے جھک جاتیں۔ کیا آپ میں سے کسی نے بھی اس پر ملامت کا کوئی جملہ کہا۔ بلکہ میں کہہ سکتا ہوں کہ بہت سے لوگ ان کمینہ حرکات پر خوش ہوتے تھے۔

''حریت'' اخبار دہلی آج کل جو میری ذاتیات پر نہایت رکیک مضامین لکھ رہا ہے کیا آپ حضرات میں سے کسی نے اس پر بیزاری کا اظہار کیا۔ اس پر سب کی آنکھیں شرم سے جھکی ہوئی تھیں۔ مولانا احمد سعید صاحب نے اتنا فرمایا کہ اجی حضرت عزیز حسن بقائی تو ہمیشہ اس قسم کی بے ہودہ بکواس کیا کرتا تھا کیا آپ کو معلوم نہیں۔ علامہ عثمانی نے فرمایا اس وقت تو وہ آپ کی حمایت اور ہمنوائی میں سب کچھ کہہ رہا ہے۔ گو مجھے یہ بھی معلوم ہے کہ ایک زمانہ میں اس نے آپ صاحبان کو بھی بری طرح مجروح کیا تھا لیکن دکھلانا صرف یہ ہے کہ آپ حضرات نے کبھی اس قسم کی چیزوں سے جو ہمارے متعلق کہی گئیں اظہارِ بیزاری نہیں کیا نہ کسی پر ملامت کی۔ ہم نے تو یہ کیا کہ موقع ملنے پر ایسے امور سے پوری قوت کے ساتھ اظہارِ بیزاری کرتے رہے۔

محلہ کسرول مراد آباد کے ایک شخص نے مجھ سے پوچھا کہ کیا مولانا حسین احمد صاحب اور مفتی کفایت اللہ صاحب آپ کے نزدیک محض ذاتی مفاد کے لئے ہندوؤں کا ساتھ دے رہے ہیں یا ان کا اجتماع بے دینی اور کفر ہے یا وہ اپنے استاد کے مسلک سے ہٹ گئے ہیں؟ میں نے جواب میں لکھا کہ میرے حاشیہ خیال میں ہی نہیں آ سکتا کہ یہ حضرات محض ذاتی مفاد کے لئے ایسا کریں وہ اپنے نزدیک جو حق سمجھتے ہیں کر رہے ہیں اور اسی کو اپنی استاد کا مسلک سمجھتے ہیں۔ باقی یہ لازم نہیں کہ جو ان کا خیال ہے وہ واقع میں صحیح ہو نہ ان کی تقلید دوسروں سے واجب ہے۔ امورِ مذکورہ کا تذکرہ میں نے اس لئے نہیں کیا کہ مجھے کوئی انتقام لینا مقصود ہے میں تو بہرصورت ایسے امور کو برا سمجھتا ہوں۔ دکھلانا صرف یہ ہے کہ ہم نے اپنی بساط کے موافق اس قسم کے امور کو روکنے کی ہمیشہ سعی کی۔

مولانا مدنی کا ایک استدلال

آخر گفتگو میں مولانا حسین احمد صاحب نے اپنی جیب سے دو تین کالم کا ایک مضمون نکال کر تقریباً آٹھ دس منٹ تک پڑھ کر سنایا۔ یہ مضمون ایک انگریز کی تجویز اور رائے پر مشتمل تھا۔ جس میں اس نے ہندوستان کی سیاسیات پر

بحث کرتے ہوئے حکومت برطانیہ کو اس کا ایک حل بتلایا تھا۔ اس مضمون میں یہ تجویز پیش کی گئی ہے کہ ہندوستان کو دو حصوں میں تقسیم کر دیا جائے اور بمبئی کے بجائے کراچی کو تجارت کا مرکز بنایا جائے۔ گویا اس مضمون کو سنانے کی غرض یہ تھی کہ مسلم لیگ نے جو نظریۂ پاکستان پیش کیا وہ اس انگریز کی تجویز پر مبنی ہے اور مسلم لیگ انگریزوں کے اشاروں پر چلنے والی جماعت ہے۔

مولانا احمد سعید صاحب نے یہ سوال کیا کہ انگریز کی پالیسی ٹکڑے کرنے کی ہے یا جمع کرنے کی۔ یعنی اس کا فائدہ کس جانب میں ہے۔ مطلب یہ تھا کہ ہم جو وفاقی حکومت چاہتے ہیں' انگریز کے لئے مہلک ہے اور آپ جو تقسیم ہند چاہتے ہیں یہ صورت حکومت کے لئے مفید و معین ہے۔ علامہ عثمانی نے ارشاد فرمایا کہ میرے نزدیک آپ کے سوال کا جواب نہیں ہو سکتا۔ یعنی آپ کے سوال کے جواب میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ انگریز کا فائدہ ہمیشہ ٹکڑے کرنے میں ہے یا نہیں۔ میرا جواب یہ ہے کہ کبھی انگریز کا فائدہ ٹکڑے کرنے میں اور کبھی جمع کرنے میں ہوتا ہے۔ چنانچہ اس کی ایک حالیہ نظیر ملاحظہ فرمائیے برطانیہ نے ترکی اور عرب کے ٹکڑے ٹکڑے کئے۔ عراق' شام' لبنان' نجد' یمن سب کو علیحدہ علیحدہ حصوں میں منقسم کر دیا۔ ایک وقت میں پالیسی یہ تھی اب جو عرب لیگ قائم ہو رہی ہے جس میں تمام عربوں کو روس کے خطرہ سے انگریز متحد کرنا اور ان سب کا ایک بلاک بنانا چاہتا ہے کیا یہ بھی آپ کے نزدیک انگریز کے اشارہ سے نہیں ہو رہا جس کا منشا یہ ہے کہ تمام عرب ممالک کی ایک آہنی دیوار بنا دی جائے۔ اس کو وفد نے تسلیم کیا کہ بے شک علامہ عثمانی نے فرمایا کہ پھر یہ کہنا صحیح نہیں کہ انگریز کی پالیسی ہمیشہ ٹکڑے کرنا ہے۔ معلوم ہوا کہ کبھی اس کی پالیسی جمع کرنے کی بھی ہوتی ہے۔ اب ہمیں تو یہ سوچنا چاہئے کہ ہمارا فائدہ کس صورت میں ہے خواہ اس میں حکومت کا فائدہ ہو یا نقصان ظاہر ہے ہندو یا مسلمان کسی کے مقابلہ میں بھی گورنمنٹ اپنے مفاد کو بہ اختیار خود نظر انداز نہیں کر سکتی۔

اس کے بعد علامہ عثمانی نے فرمایا کہ مولانا حسین احمد صاحب نے جو ایک انگریز کا مضمون پڑھ کر سنایا یہ ایک انگریز کی شخصی رائے اور تجویز ہے جواب سے چودہ برس پہلے اسے پیش کی گئی تھی۔ لیکن حکومت برطانیہ کا سب سے بڑا نمائندہ وائسرائے ہند لارڈ زویل جو ہندوستان پر اس وقت حکمران ہے اس نے اپنی تقریروں میں برملا یہ کہا کہ اس ملک کا مرکز اور اس کی حکومت ایک ہی رہنی چاہئے۔ اس ملک پر کوئی بڑا عمل جراحی نہیں ہو سکتا۔ پہلی مرتبہ یہ تقریر کلکتہ کے کامرس چیمبر میں کی۔ دوسری مرتبہ لجس لیجر میں یہی مضمون ادا کیا اور ابھی دو تین ماہ ہوئے کہ راولپنڈی کے دربار میں لارڈ ویول نے یہی کہا کہ اس ملک کی تقسیم نہیں ہو سکتی۔ اس سے پہلے سابق وائسرائے لارڈ لنلتھگو نے بھی 42ء میں اس قسم کی تقریر کی تھی۔ اب آپ حضرات غور فرمائیں کہ آج وائسرائے ہند کے نظریئے کی حمایت کانگریس کر رہی ہے یا مسلم لیگ۔

مولانا احمد سعید صاحب نے فرمایا کہ اجی حضرت یہ تو انگریزوں کی چالیں ہیں کہتے تو کچھ ہیں کرتے کچھ ہیں۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اس انگریز کی تجویز میں بھی تو یہی احتمال ہو سکتا ہے۔ لیکن حجت کے درجہ میں تو سب سے بڑے ذمہ دار ہی کا قول ہم پیش کر سکتے ہیں۔

اسی سلسلہ میں مولانا حسین احمد صاحب نے فرمایا' کہ اچھا اگر پاکستان قائم ہو گیا تو ہندوستان کا دفاع کیسے ہو سکے گا۔ روس نے اگر حملہ کر دیا تو سرحد کے مسلمان بیچارے پس جائیں گے۔ سارا بوجھ ان پر پڑ جائے گا۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ یہ تو آپ مان چکے ہیں کہ انگریز ابھی یہاں موجود ہے۔ سردست اگر پاکستان بنائے گا تو وہی بنائے گا۔ سرحدوں کی حفاظت کی بھی کوئی صورت ضرور نکالے گا اور اس کے چلے جانے کی صورت میں بیرونی قوت ہندوستان پر چڑھائی کرے گی تو دونوں طبقے مل کر اس کی مدافعت کریں گے اور ہر ایک دوسرے کی آدمیوں' سامان' اسلحہ اور روپے سے مدد کرے گا کیونکہ یہ سب کا مشترکہ مفاد ہو گا۔ ایسا نہیں کریں گے تو سب کا نقصان ہے۔ اس قسم کے دفاع کے کام باہمی معاہدوں سے انجام پائیں گے۔ مولانا احمد سعید صاحب نے فرمایا کہ حضرت معاہدوں کو آج کل کون پوچھتا ہے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ جب بلا معاہدہ آپ سب کچھ کرنے کو تیار ہیں تو معاہدہ کی صورت تو بہرحال اس سے قوی تر ہونی چاہئے۔

پھر آپ کی تقریر کا حال تو یہ ہوا کہ ہم کسی حالت اور کسی وقت بھی ہندوؤں کی احتیاج سے باہر نہیں ہو سکتے اور نہ ان کے بدوں کبھی کوئی کام کر سکتے ہیں۔ (یہ بات کم از کم شیر دل بہادروں کو زیب نہیں دیتی جو کہتے ہیں کہ ذرا انگریز سے آزادی مل جائے پھر ہم نہرو وغیرہ کسی سے نہیں ڈرتے)

نیز آپ دیکھتے ہیں کہ معاہدات ہی کی طاقت تھی کہ روس اور برطانیہ نے مل کر جرمن اور جاپان کو کس طرح پیس ڈالا کیونکہ تینوں کی غرض مشترک تھی۔ پاکستان اور ہندوستان کا مفاد جب مشترک ہو گا تو دونوں بذریعہ معاہدات عملی اتحاد کیوں نہیں کر سکتے (گو قومی اتحاد نہ ہو نہ سہی)

اس موقع پر مفتی عتیق الرحمٰن صاحب نے علامہ عثمانی سے کہا کہ آپ تو ہمیشہ سیاسیات سے یکسو رہا کرتے تھے۔ اس الیکشن میں کیا داعیہ ایسا پیش آیا جس کی وجہ سے آپ نے شرکت فرمائی۔

حضرت علامہ نے ارشاد فرمایا کہ اس الیکشن کی نوعیت پچھلے الیکشنوں سے بالکل مختلف ہے۔ حکومت نے صاف لفظوں میں اس کا اعلان کر دیا ہے کہ اس مرتبہ منتخب ہونے والی اسمبلیاں ہی آئندہ ہندوستان کا مستقل دستور بنائیں گی چونکہ اس الیکشن سے قوموں کی قسمتوں کا فیصلہ وابستہ تھا اس بناء پر میں نے ضروری سمجھا کہ اس بنیادی موقع پر ان مسلمانوں کی مدد کی جائے جو استقلال ملت اور مسلم حق خودارادیت کے حامی ہیں۔ اس کے بعد فرمایا کہ آپ نے یہ کیا کہا کہ میں سیاسیات سے ہمیشہ علیحدہ رہا ہوں۔ گزشتہ چند سالوں کو چھوڑ دیجئے اس سے پیشتر جمعیت العلماء ہند میں ہماری بھی تو کچھ ناچیز خدمات رہی ہیں ہم نے بھی تو کچھ معرکے سر کئے ہیں۔ ادھر آپ حضرات طوفانی دورہ کر رہے تھے جس سے میرے نزدیک مسلمانوں کا نقصان تھا' تو ظاہر تھا کہ ایسے موقع پر میں سکوت کیسے باقی رکھ سکتا تھا۔

اگر ہیچم کہ نابینا و چاہ ہست
اگر خاموش بہ نشینم گناہ است

ان وجوہ سے میں نے مسلم لیگ کی تائید و حمایت کی (پھر علامہ عثمانی نے یکا یک کوئی اعلان نہیں فرمایا' بلکہ مہینوں پاکستان کے نظریۂ پر شرعی و سیاسی حیثیت سے انتہائی غور و تعمق کیا' جب کلکتہ کے اجلاس کل ہند جمعیت العلماء اسلام میں اپنا پیغام بھیجا تو استخارہ بھی فرمایا۔ مکمل بصیرت اور شرح صدر کے بعد یہ اقدام فرمایا گیا۔ (مرتب) اس کے بعد علامہ عثمانی نے فرمایا کہ پھر میرا اثر ہی کیا ہے۔ ہندوستان میں اگر میری اپیل پر بے چارے نوابزادہ لیاقت علی خان کو دس بیس ووٹ مل ہی گئے تو کیا ہوا۔ آپ حضرات تو ماشاء اللہ بااثر ہیں۔ (موجودہ پروپیگنڈے کی طاقتیں آپ کے ساتھ ہیں) میں تو اب آپ میں ایک اچھوت کی حیثیت رکھتا ہوں۔ کسی نے کہا نہیں یہ بات نہیں آپ کے اعلانات نے ملک میں ہلچل ڈال دی ہے۔

علامہ عثمانی سے سکوت کی درخواست

مولانا احمد سعید نے فرمایا کہ بہرحال یہ اختلافی مسئلہ ہے۔ اس میں احتمال خطا کا دونوں طرف ہے۔ مگر آپ تو اس قوت سے بیان دے رہے ہیں کہ اپنے مخالفوں کے لئے کوئی گنجائش ہی نہیں چھوڑتے' ذرا کچھ تو نرمی اختیار کریں۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ آپ حضرات تو

ماشاء اللہ سب اہل علم ہیں آپ کو معلوم ہے کہ جب احناف و شوافع وغیرہ کے باہمی اختلافی مسائل کی تقریریں آپ اور ہم کرتے ہیں تو باوجود یہ کہ سب آئمہ ہدیٰ ہیں لیکن ہم میں سے کون اپنے مذہب کی تصویب و تائید میں کسر اٹھا رکھتا ہے اور حنفی مذہب کو ترجیح دیتے ہوئے شافعی یا مالک یا احمد کے لئے اپنی زعم میں کوئی گنجائش باقی نہیں چھوڑتا ہے۔ اس پر سب ہنسنے لگے علامہ عثمانی نے فرمایا کہ اس سلسلہ میں میرا تو وہی خیال ہے جو فقہائے کرام نے مسئلہ کے عقیدے کی نسبت لکھا ہے کہ اپنا امام جو مسئلہ بیان کرے اس کی نسبت یہ اعتقاد رکھے صوات یحتمل الخطائو۔ یعنی جو ہمارے امام نے مسئلہ بیان کیا وہ صحیح اور درست ہے۔ ہاں اس میں خطا کا بھی احتمال ہے اور دوسرے امام نے جو کہا (خطائو عقل الصواب) یعنی وہ خطا ہے گو اس میں احتمال ثواب کا بھی قائم ہے کیونکہ معصوم ان میں سے کوئی نہیں۔ آخر میں مولوی حفظ الرحمٰن صاحب نے فرمایا کہ جمعیت العلمائے اسلام محض ہماری جمعیت کے مقابلے میں اس کو توڑنے کے لئے قائم کی ہے مناسب ہوگا آپ کم از کم ان کی صدارت قبول فرمائیں۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ میں نے ابھی صدارت کے قبول و عدم قبول کی نسبت کوئی باضابطہ فیصلہ نہیں کیا ہے لیکن کل کے لئے کچھ نہیں کہہ سکتا کہ کیا کروں گا۔

(نوٹ: لیکن اس کے بعد علامہ عثمانی نے کل ہند جمعیت العلماء اسلام کے ناظم کے تار کے جواب میں باضابطہ صدارت کی منظوری کا تار روانہ فرمادیا ہے۔)

جب یہ حضرات علامہ عثمانی سے رخصت ہونے لگے۔ مولانا احمد سعید صاحب نے دریافت فرمایا کہ حضور نظام نے حیدرآباد بھی تو بلایا تھا آپ حیدرآباد کب تشریف لے جائیں گے۔ علامہ عثمانی نے فرمایا کہ میں نے حضور نظام کو لکھا ہے کہ ابھی دو تین ماہ تک مجھے یہاں بغرض علاج قیام کرنا ہے۔ سردی کم ہونے پر اگر اجازت ہو تو حیدرآباد آؤں۔ اب حضور نظام پر موقوف ہے کہ اگر اس کے باوجود انہوں نے مجھے طلب فرمایا تو مجھ کو بہرحال جانا پڑے گا اور اگر اجازت دے دی تو ٹھہر جاؤں گا۔

(الحمدللہ اس تحریر کے مرتب کرتے وقت ہی حضور نظام کے چیف سیکریٹری کا تار بنام علامہ عثمانی پہنچ گیا کہ آپ کو فروری تک قیام کی اجازت ہے۔ مرتب)

چلتے چلتے وفد کا منشاء یہ معلوم ہوتا تھا کہ جو تحریرات آپ کی شائع ہو چکی ہیں وہ بیان مسئلہ کے لئے کافی ہیں۔ اب اگر یکسوئی اختیار کر لی جائے تو کیا بہتر نہ ہوگا۔ لیکن علامہ عثمانی نے فرمایا کہ جس چیز کو میں حق سمجھتا ہوں ظاہر ہے کہ اس معاملہ میں میرے لئے سکوت کیسے مناسب ہے۔

اس کے بعد وفد رخصت ہوگیا۔ یہ تمام گفتگو نہایت خوشگوار فضا میں ہوئی کسی موقع پر بحمداللہ ادنیٰ تلخی پیدا نہ ہوئی۔ جب یہ تاریخی مجلس برخاست ہونے لگی تو علامہ عثمانی نے اپنے یہاں آنے والے علماء کے احترام میں اتنا فرمایا کہ یہ سلسلہ گفتگو آخری سلسلہ نہیں ہے پھر جب چاہیں گفتگو کر سکتے ہیں۔ جانبین کو موقع غور و فکر کا حاصل ہے۔ اب تک کی صورتِ حال یہ ہے کہ آپ اپنی جگہ قائم ہیں اور میں اپنی جگہ پر رہا۔ اس کے بعد مجلس برخاست ہو گئی۔ شرعی حیثیت سے مسائل حاضرہ پر علماء ہند کے وفد کی طرف سے کوئی کلام نہیں ہوا۔

(غالباً یہ حضرات یہ سمجھ کر آئے تھے کہ علامہ عثمانی کی سیاسی معلومات کم ہوں گی تو ہم اپنے بیان کردہ واقعات سے علامہ موصوف کی رائے کو متاثر کر دیں گے۔ شرعی حیثیت سے گفتگو کو تو مولانا حفظ الرحمٰن صاحب پہلے ہی کہہ چکے تھے کہ اس پر ہم آپ سے کیا بحث کرتے۔ لیکن اس مکالمہ سے غالباً ان پر یہ حقیقت بھی روشن ہوگئی ہوگی کہ علامہ عثمانی کو معلومات شرعیہ جہاں بے پناہ ہیں وہاں سیاسی مذاق بھی کچھ اس سے کم نہیں۔ یہ حقیقت ہے کہ علامہ عثمانی نے مسئلہ پاکستان کو اپنی گفتگو میں اس طرح سے منقطع کیا کہ جو لوگ سیاسی ہیں جب اس مکالمہ کو سنتے ہیں تو وہ خود بھی تنقیح مسئلہ کے اس انداز پر عش عش کرتے ہیں)

ضروری گزارش

جو مکالمہ اوپر درج ہوا اس پر گفتگو کے سب اجزاء آ گئے۔ کوئی ایک آدھا جز چھوٹ گیا ہو تو جدا بات ہے۔ ترتیب کلام میں تقدیم و تاخیر بھی ممکن ہے کیونکہ جس وقت مکالمہ ہو رہا تھا بروقت منضبط نہیں ہوا لیکن گفتگو کا ملخص اور ضروری لب لباب جہاں تک ممکن تھا لے لیا گیا۔ علامہ عثمانی نے جس طرح گفتگو نقل فرمائی اسی طرح قلمبند کر لی گئی اور مزید احتیاط یہ کی گئی کہ مسودہ صاف کر کے حضرت علامہ کو دکھلا دیا گیا۔ حضرت علامہ نے کہیں کہیں اس میں ترمیم و اصلاح بھی فرمائی۔ لہٰذا یہ مکالمہ اب حضرت علامہ کا مصدقہ مکالمہ ہے جو بغرض افادۂ عوام شائع کیا جا رہا ہے۔ اس مکالمہ سے اہلِ بصیرت مہذب دنیا کو یہ واضح ہو گا کہ اختلافات میں حزم و احتیاط اور عدل و توازن سے کیا لطافت پیدا ہوتی ہے اور کس طرح مسئلہ کے تمام پہلو سامنے آ سکتے ہیں اور بے اعتدالیوں یا بدتہذیبوں سے اختلاف کس طرح خلاف و شقاق کی نوعیت اختیار کر لیتے ہیں اور یہ کہ ہر دو جماعتوں کا رُخ کیا ہے۔ کون اصول کو مقدم کرنا چاہتی ہے اور کون ذاتیات پر اتری ہوئی ہے۔

(طاہر احمد القاسمی)

21

دو قومی نظریے کی پیدائش و پرورش

دو قومی نظریہ اُسی دن پیدا ہو گیا تھا جب ہندوستان میں پہلے سے صدیوں سے آباد و شاد دو قوموں کے درمیان ایک تیسری قوم باہر سے آ کر بیٹھ گئی تھی اور اِس تیسری قوم (انگریز) نے قوموں کے درمیان اپنی شاطرانہ چالوں اور سازشوں سے پھوٹ ڈالی تھی۔ پہلے یہ گوری رنگت کے کاروباری لوگ تجارت کے بہانے یہاں کی (مغلیہ) حکومت سے تجارتی مراعات حاصل کرتے رہے۔ پہلے مغربی ساحل پر بمبئی، گوا، دمن، دیو پر، بعد ازاں مشرقی ساحل پر مدراس، مالابار، پانڈی چری اور مچھلی پٹم وغیرہ پر۔ پھر حیدرآباد، میسور، دکن اور پھر کلکتہ، ہگلی، چٹاگانگ کے علاقوں میں اپنے تجارتی دفاتر پھیلاتے گئے۔

1600ء سے لے کر ایک صدی تک اہلِ ہند میں رہ کر یہاں کے لوگوں کی اجتماعی نفسیات کا جائزہ لیتے رہے۔ اُنہیں اندازہ ہو گیا کہ ایک معمولی اقلیت بھاری اکثریت پر ایک ہزار سال سے حکومت کرتی چلی آ رہی ہے۔ دونوں کے تعلقات و معاملات معمول کے مطابق ہیں، اس کے باوجود ہندو قوم میں ایک خاص قسم کا احساسِ کمتری موجود ہے جو محکوم و مغلوب قوم میں ہونا قدرتی امر ہے۔ 1707ء میں اورنگزیب عالمگیر کی وفات کے بعد مسلمانوں کا ہر صوبے اور علاقے میں شیرازہ بکھرنا شروع ہوا تو انگریزوں کو اندازہ ہوا کہ مسلمان احساسِ

برتری کے مرض میں مبتلا ہیں اور ''پدرم سلطان بود'' ہر مسلمان کی زبان پر ہے۔ چنانچہ ایک سو سال تک اپنے اِن مشاہدات کی روشنی میں اپنے تجارتی لین دین میں اور اپنے تعلقات میں ہندوؤں کو اُبھارتے رہے اور مسلمانوں کو دباتے رہے۔ مسلمانوں میں تعلیم' قابلیت' تہذیب اور زور آوری زیادہ تھی۔ اِن سے نمٹنا مشکل تھا۔ ہندو اکثریت میں ہونے کے باوجود ہر شعبے میں کمزور تھے۔ صرف کاروبار میں اُن کی عقل زیادہ چلتی تھی' اس لئے انگریزوں نے اپنے زمانۂ تجارت میں ہندوؤں کو اپنا شریکِ کار بنایا اور مسلمانوں کو اپنے سے دُور رکھا۔

یوں ہندوؤں اور مسلمانوں میں رفتہ رفتہ مغائرت پیدا ہوتی گئی' جس کا پہلا پہلا شعور دونوں قوموں کو 1757ء کی جنگ پلاسی کے موقع پر ہوا۔ اسی لئے مورخین عام طور پر 1757ء ہی کو دو قومی نظریے کی پیدائش کا سال قرار دیتے ہیں۔

1757ء کو تیسری قوم کے سیاسی استحکام کا پہلا سال کہا جاتا ہے۔ یہی وہ سال ہے جب پلاسی کے مقام پر انگریزوں نے فتح حاصل کر کے اپنے استحکام کے جھنڈے گاڑ دیئے تھے۔ اس کے بعد کا دور مقبوضات میں توسیع اور سیاسی مرکزیت کے حصول کا دور ہے جو ٹھیک سو سال کے بعد 1857ء میں پورا ہوا۔

جنگ پلاسی کے بعد

معرکۂ پلاسی کے بعد ہی مسلم بنگال (سابق مشرقی پاکستان) کی دولت لٹ لٹ کر لندن پہنچنے لگی اور اس کا فوری اثر ظاہر ہو گیا' کیونکہ ماہرین معاشیات سب اس پر متفق ہیں کہ صنعت و حرفت کا انقلاب انگلستان میں 1760 ہی سے شروع ہوا۔ صنعت و حرفت میں انگلستان کی برتری مسلم بنگال اور کرناٹک کے خزانوں کا نتیجہ ہے۔ یہ بنگال اور کرناٹک کے خزانے ہی تھے جو اُس دور میں انگریز کے تصرف میں آئے۔ پلاسی کی جنگ سے پہلے جب ہندوستان کا سونے کا دریا انگلستان کی طرف بہنا شروع ہوا تھا' وہاں کی صنعت و حرفت کا بازار ٹھنڈا تھا۔ چرخوں کے لحاظ سے سوت کاتنے اور کپڑا بننے میں لنکا شائر کو ہندوستان پر کوئی فوقیت حاصل نہ تھی۔ البتہ وہ دست کاری جس نے ہندوستانی کپڑے کو صناعی اور ہنرمندی کا عجوبہ بنا رکھا تھا' پورے مغرب میں کہیں بھی موجود نہ تھا۔

انگریزی تجارت پر ہندوؤں کی ساجھاداری

انگریز جب مسلم بنگال میں تجارت پر قبضہ کرنے کی دُھن میں مصروف تھی' اُس کے اپنے اِس مقصد کے حصول میں سب سے زیادہ مدد بنگالی ہندوؤں ہی سے ملی۔ انگریز کے ہندوؤں سے تعلقات ایک طرح سے پلاسی کی جنگ سے پہلے ہی اُستوار ہو گئے تھے۔ اُس وقت کے بنگالی مسلم معاشرے میں مسلم تعلیم یافتہ طبقہ حکومت سے منسلک تھا' اہم ملازمتیں اُن کے پاس تھیں' دیہات میں مال گزاری اکٹھا کرنا ان کا کام تھا۔ اس طرح یہ طبقہ حکومت اور دیہی کاشت کاروں کے درمیان ایک اہم واسطے کی حیثیت سے معروف تھا۔

ہندوؤں کی اکثریت' تجارت' لین دین' ساہوکارہ اور زمین داری میں مصروف تھی۔ جیسے ہی انگریز بحیثیت تاجر بنگال میں آئے تو اُن کا پہلا واسطہ یہاں کے تاجروں ہی سے پڑا۔ ہندوؤں ہی کی وساطت سے انگریزوں نے یہاں تجارتی کوٹھیاں قائم کیں۔ ہندوؤں میں سے اُنہوں نے اپنے کاروبار کے لئے ملازم اور ایجنٹ بھرتی کئے۔ پھر جب انگریزوں نے سیاسی استحکام حاصل ہونے کے بعد تجارت میں دھاندلی مچائی اور بنگال کے تاجروں کو میدانِ تجارت سے نکالنا شروع کیا تو جن تاجروں نے شکست کھائی' وہ پٹ پٹا کر انگریزوں کے ایجنٹ بننے پر مجبور ہو گئے اور اس طرح انگریزوں کے تجارتی ڈھانچے میں انہوں نے ایک خاص اور اہم حیثیت اختیار کرنے میں ہی اپنی عافیت دیکھی۔ چنانچہ فرخ سیر نے جب اپنی بیٹی کے تندرست ہونے پر اُس کے معالج ڈاکٹر ہملٹن کی درخواست پر' نتائج سے بے پروا ہو کر یہ پروانہ جاری کیا کہ: ''ایسٹ انڈیا کمپنی کے تمام کارکنوں کو تجارتی ٹیکس سے مستثنیٰ کیا جاتا ہے''۔ تو بنگال کا یہ تاجر' جو عموماً ہندو ہوتا تھا' کمپنی کے نام پر کام کرنے کے لئے مجبور ہو گیا۔ اس طرح سے یہ پہلا گہرا رابطہ ہندو تاجروں اور انگریزوں کے درمیان ہو گیا جو بعد میں زبردست سیاسی نتائج کا حامل ہوا۔

فرخ سیر' بادشاہ دہلی کی اِس عطا کردہ کھلی اجازت کے بعد جب انگریزوں کو یہ ضرورت محسوس ہوئی کہ وہ پورے بنگال کے بازاروں اور منڈیوں میں لین دین کریں۔ جبراً اپنی من مانی قیمتوں پر اشیاء کی خرید و فروخت کریں تو انہیں ایسے ایجنٹوں کی ضرورت پڑی جو مقامی زبان جانتے ہوں اور لین دین کا تجربہ رکھتے ہوں۔ اس میدان میں اِن مقاصد کے لئے ہندو بنئے سے زیادہ انگریز کے کون کام آ سکتا تھا۔ مسلمانوں کو وہ ویسے بھی منہ لگانے کے لئے تیار نہ تھے۔ اس طرح ہندو تاجروں کو عوام کو لوٹنے کا موقع میسر آیا۔ عوام کون تھے' مسلمان۔ ان ہندو ایجنٹوں نے انگریزوں کے کاروبار کے ساتھ ساتھ اپنا نجی کاروبار بھی شروع کر دیا۔ چنانچہ یہ ہندو بنئے پورے بنگال کے کاروبار پر چھا گئے۔

اٹھارہویں صدی کے اواخر میں تو عوام نے ان ہندو ایجنٹوں کے مظالم کے خلاف چیخ و پکار شروع کر دی۔ خود انگریز مورخین بھی جو انگریزوں کے مظالم کا ذکر کرتے ہیں' وہاں ان ہندو تاجروں کی سیاہ کاریوں کو بھی بیان کرنے پر مجبور ہوئے ہیں۔

مسلمانوں کے خلاف انگریز ہندو گٹھ جوڑ

انگریزوں کی آمد سے پہلے بنگال کے حکمران مسلمان تھے۔ اس حکومت کی بدولت مسلمانوں کا حکومت اور اس کے مختلف اداروں سے بہت ہی گہرا تعلق قائم تھا۔ ان کی زندگیاں حکومت سے وابستہ تھیں۔ فوج تھی تو اس میں مسلمان کثیر تعداد میں تھے۔ پولیس تھی تو اُس میں مسلمانوں کی اکثریت تھی۔ چنانچہ جب پلاسی کے میدان میں مسلمان حکمرانوں کو شکست ہوئی تو اُس کے بعد فوج اور پولیس کے تنظیمی ڈھانچے میں تبدیلی شروع ہوئی اور مسلمانوں کو فوج اور پولیس سے علیحدہ ہونا پڑا۔ یہ پہلا وار تھا جو عام مسلمانوں پر پڑا۔

دوسرا حملہ اُس وقت ہوا جب دیوانی کے اختیارات انگریزوں کو منتقل ہوئے اور انہوں نے آہستہ آہستہ مال گزاری کے پورے بندوبست کو تبدیل کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس تبدیلی نے بھی مسلمانوں کو متاثر کیا' اس لئے کہ اب تک مال گزاری کی وصول کرنے کے زیادہ تر اختیارات مسلمانوں ہی کے پاس تھے۔ جب یہ طے ہوا کہ خود انگریز اور اُن کے (ہندو) ایجنٹ مال گزاری کی وصولی کا کام سرانجام دیا کریں گے تو ظاہر ہے کہ ملازموں اور مال گزاری وصول کرنے والے پُرانے طبقوں کا متاثر ہونا لازمی تھا۔ چنانچہ انگریزوں کے اس اقدام سے بھی مسلمان متاثر ہوئے۔

تیسرے حملے نے تو مسلمانوں کو بالکل ہی نیم جان کر دیا۔ یہ حملہ دوامی بندوبست کا تھا' جس کے تحت زرعی اراضی مستقلاً ایک مقررہ مالیہ دینے والے کے نام منتقل ہو جاتی تھی۔ اِس طرح انتقال اراضی کے لئے نیلام کو ذریعہ بنایا گیا اور اس طرح جس نے بھی نقد اور زیادہ رقم پیش کر دی' اُسی کے نام زمین منتقل کر دی جاتی۔ اب نقد روپے یا نیلامی کے طریق کار کا سامنا کرنا مسلمان کاشتکار بلکہ عام مسلمان زمیندار کے بس میں کہاں تھا۔ اُن کے پاس تو اراضی ہی اراضی تھی۔ نقد روپیہ ہندو بنیوں اور انگریزوں کے ایجنٹوں کے پاس تھا جو پچھلے بیس پچیس برس سے انگریزوں کے ساتھ مل کر تجارت میں اندھا دھند کما رہے تھے اور یہ سب کے سب ہندو تھے۔ چنانچہ انہوں نے اپنا سرمایہ اراضی کے

کاروبار میں لگا دیا اور اس طرح محسوس کیا کہ اب وہ مسلمانوں کی جگہ حاکم بن جائیں گے اور مسلمان کاشت کاروں کی فوج کی فوج اُن کو سلام کرنے اور اُن کے احکام بجالانے کے لئے تیار رہا کرے گی' اور ہوا بھی ایسا ہی۔ زمینداری بھی مسلمانوں کے ہاتھ سے نکل کر ہندو بنیوں کے پاس منتقل ہوگئی۔

چوتھے حملے پر دیہی پولیس' چوکیدار اور دوسرے متعلقہ لوگ بھی جاگیروں سے ہٹا دیئے گئے اور اُن کی جگہ نئے زمینداروں کے چہیتے ہجوم در ہجوم دیہات میں پہنچنا شروع وہ گئے۔ غرضیکہ بہت تھوڑے عرصے میں سرعت سے ایک انقلاب تھا جو رونما ہو رہا تھا اور مسلمان شعوری اور غیر شعوری طور پر محرومین کی صفوں میں شامل ہو رہے تھے۔ اُن کو یہ محرومی صدیوں کے بعد برداشت کرنا پڑی تھی۔

پانچویں حملے کی داستان بہت المناک ہے۔ یہ حملہ بنگال کے پارچہ بافوں پر ہوا۔ یہ پارچہ باف بھی سب کے سب مسلمان تھے۔ اُن پر جو بیتی' اُس کی محض یاد بھی نہایت دل خراش ہے' اور اس کا زہر آج تک برعظیم کے بچے کی نس نس میں گھلا ہوا ہے۔ ڈھاکے کی ململ اور ریشم آج بھی زبان زدِ عام ہے۔ آج بھی نظریں اُس کی متلاشی ہیں' لیکن یہ تو ڈھائی صدی پہلے کی داستان ہے۔ مسلمان کاریگروں کے ہاتھوں کے بنائے ہوئے ململ کے تھان کی نفاست اور باریکی کا یہ عالم تھا کہ انگوٹھی میں سے پورا تھان گزار لیجئے' لیکن آج یہ سب باتیں قصۂ پارینہ ہیں۔ پارچہ بافوں کی داستانِ غم نے تمام دوسرے مظالم کو فراموش کر دیا۔ یہ مظالم کی شدت ہی تھی کہ یہ چرچا عام ہوا کہ اِن پارچہ بافوں کے انگوٹھے کاٹ دیئے گئے ہیں کہ نہ ہوگا بانس اور نہ بجے بانسری۔ نہ یہ انگوٹھے ہوں گے اور نہ اس قدر نفیس و ملائم اور باریک ململ اپنی کھڈی پر بُن کر اپنی ہنرمندی اور دست کاری کے شاہکار پیش کر سکیں گے۔

مولانا سید حسین احمد مدنی نے اپنی خود نوشت "نقشِ حیات" میں 1869ء میں سرکاری ملازمتوں میں ہندوؤں کے مقابلے میں مسلمانوں کا تناسب دیا ہے۔ یہ گوشوارہ مولانا صاحب نے ایک کمیشن کی رپورٹ سے نقل کیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے:

اسسٹنٹ انجینئرز کے تین درجوں میں	(ہندو 14۔ مسلمان صفر)
اکاؤنٹنٹ آفس	(ہندو 50۔ مسلمان 3)
محکمہ پبلک ورکس۔ سب انجینئر	(ہندو 24۔ مسلمان 1)
محکمہ پبلک ورکس۔ اوورسیر	(ہندو 63۔ مسلمان 2)
محکمہ پبلک ورکس۔ ماتحت عملہ	(ہندو 125۔ مسلمان 4)

گزیٹڈ ملازمتوں کی کل تعداد دو ہزار 111 تھی۔ اِن میں انگریزوں کی تعداد ایک ہزار 338 اور ہندوستانی صرف 773۔ ان میں سے مسلمان صرف 92 اور 661 ہندو۔ دس سال کے اندر اندر مسلمانوں کو اس حد تک نیچے گرایا گیا اور ہندوؤں کو اوپر اٹھایا گیا۔ یہ صورتِ حال بڑھتی گئی' تا ایں کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان دو قومی نظریہ آ کر بیٹھ گیا اور جب انگریزوں کے یہاں سے اٹھنے کا وقت آیا تو اُس وقت تک دو قومی نظریہ اس قدر پختہ ہو چکا تھا کہ ہندوؤں نے صاف صاف اعلان کر دیا کہ ہندوستان ہمارا ہے۔ ہم ایک قوم ہیں۔ یہاں کے مسلمان بھی دراصل پہلے ہندو ہی تھے' اس لئے انگریزوں کے ساتھ وہ بھی ہمارا ملک چھوڑ دیں یا پھر ہندو مت دوبارہ اختیار کر لیں' یا ہمارے تابع ہو کر رہیں۔ مسلمانوں نے صاف صاف کہہ دیا' ہم بھی ایک قوم ہیں اور ہر معاملے میں تم سے جدا قوم ہیں۔ جن جن علاقوں میں ہماری اکثریت ہے' وہ ہمارا ملک ہے۔ اس دو قومی نظریے کی بنیاد پر آئینی جنگ ہوئی' جو ایک صدی تک جس میں 1947ء میں مسلمانوں کو فتح نصیب ہوئی اور پوری دنیا کو تسلیم کرنا پڑا کہ واقعی برعظیم پاک و ہند میں بسنے والے کروڑوں مسلمان ایک جداگانہ تشخص رکھتے ہیں اور انہیں اپنے جداگانہ ملک میں اپنے نظریے کے مطابق زندگی بسر کرنے کا پورا حق حاصل ہے۔

22

دو قومی نظریے کا ارتقاء

پہلے باب میں ہم تفصیل سے اپنا یہ نقطۂ نظر واضح کر چکے ہیں کہ "نظریۂ پاکستان" اور چیز ہے' اور دو قومی نظریہ اور چیز۔ یہ دوسری بات ہے کہ برعظیم پاک و ہند کے خصوصی حالات کی حد تک دونوں کے درمیان لازم و ملزوم کا رشتہ ہے' اور دونوں ایک ہی ڈوری میں گندھی ہوئی دو لڑیاں نظر آتی ہیں۔ دونوں نظریات کی ملی جلی کیفیت کے حوالے اور مثالیں پچھلے ابواب میں دیئے گئے ہیں۔ البتہ دو قومی نظریئے کی الگ سے وضاحت کی ضرورت محسوس ہوتی ہے' جس پر بے شمار کتابیں تصنیف ہو چکی ہیں اور ابھی مزید لکھی جائیں گی۔ یہاں صفحات کی تحدید کے باعث دو قومی نظریئے کا تاریخی ارتقاء سنین کے آئینے میں' جھلکیوں کی صورت میں دکھایا جا رہا ہے:

630ء کے لگ بھگ: بقولِ قائداعظمؒ پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔"

711ء: محمد بن قاسم کی قیادت میں مسلمانوں کا اجتماعی ورود

1600ء تا 1857ء: (مجدد الف ثانیؒ' شاہ ولی اللہؒ' ٹیپو سلطان اور سید احمد شہید کی اسلامی نشاۃ ثانیہ کے لئے تحریکیں' جو مسلمانوں کو ہندو تہذیب سے نکالنے اور اسلام کی طرف رجوع کرنے کے لئے تھیں)

1857ء: انگریز کے خلاف کھلا انقلاب۔ ہندوؤں نے انگریزی اقتدار جمانے میں مدد کی' اور مسلمانوں نے انگریزوں کے خلاف تحریکیں چلائیں۔

1858ء: جان برائٹ نے برطانوی پارلیمنٹ میں ایک بل پر بحث کرتے ہوئے کہا: "ہندوستان جیسے وسیع و عریض ملک میں' جہاں مختلف قومیں اور زبانیں ہیں' ایک متحدہ اور مستحکم سلطنت کبھی قائم نہیں ہو سکتی۔"

1867ء: بنارس کے کمشنر کے سامنے مسلمانوں کی تعلیم کے موضوع پر گفتگو کرتے ہوئے سرسید احمد خان نے کہا: "اب مجھے یقین ہو گیا ہے کہ دونوں قومیں کسی کام میں دل سے شریک نہ ہو سکیں گی۔ ابھی تو بہت کم ہے۔ آگے آگے ان سے زیادہ مخالفت اور عناد اُن لوگوں کے سبب جو تعلیم یافتہ کہلاتے ہیں' بڑھتا نظر آتا ہے۔ جو زندہ رہے گا' وہ دیکھے گا۔"

1879ء: جمال الدین افغانی نے ہندوستان میں ہندو مسلم مسئلے کے حل کے لئے ایک ایسی اسلامی جمہوریہ قائم کرنے کی تجویز پیش کی' جس میں وسط ایشیاء کے اسلامی ممالک' افغانستان اور برعظیم کے مسلم اکثریت کے علاقے شامل ہوں۔

1884ء: سر جان سٹریچی نے کہا: "ہندوستان نہ ایک

ہے' نہ کبھی ایک تھا۔ برطانوی راج سے جو اتحاد پیدا ہو گیا ہے۔ وہ محض مصنوعی ہے اور اس سے کبھی ایک متحدہ قومیت جنم نہیں لے سکے گی۔''

1887ء: سرسیّد کے رفیق کار مولانا الطاف حسین حالی نے اپنی مشہور و مقبول نظم ''شکوۂ ہند'' کہی جس کے پہلے شعر میں دو قومی نظریئے کی طرف اشارہ ہے:

رخصت اے ہندوستاں' اے بوستانِ بے خزاں
رہ چکے تیرے بہت دن' ہم بدیسی مہماں

اس نظم کے دوسرے بند میں مولانا حالی نے مزید وضاحت سے ہندو اور مسلمانوں کو دو الگ الگ قومیں قرار دیا:

تھی ہماری قوم و ملّت' رسم و عادت سب جُدا
رشتہ و پیوند کوئی ہم میں اور تجھ میں نہ تھا
بول چال اپنی الگ تھی' اردو زباں تیری الگ
تجھ سے ہم تھے اجنبی' اور ہم سے تو نا آشنا

1888ء: اردو کے پہلے ناول نویس اور سرسیّد تحریک کے ایک اور رکن ڈپٹی نذیر احمد نے 15 اکتوبر 1888ء کو ٹاؤن ہال دہلی میں انڈین نیشنل کانگرس کے موضوع پر تقریر کرتے ہوئے فرمایا: ''ایک طفلِ مکتب جس کو ہندوستان کے جغرافیے اور تاریخ سے کچھ بھی مناسبت ہے' لفظ انڈین کے ساتھ لفظ ''نیشنل'' سن کر کان کھڑے گا کہ کجا ہندوستان اور کجا نیشنلٹی۔ تمام روئے زمین پر کوئی ایسا ملک نہیں ہے کہ جس میں اس کثرت سے مختلف العقائد' مختلف الرسم' مختلف العادات اور مختلف الاغراض قومیں رہتی ہوں جیسے ہندوستان میں۔ پس ایسے اجزائے متضاد کو یکجا کر کے ایک معجونِ مرکب کو ''قوم واحد'' قرار دینا صریح مغالطہ دہی ہے' مگر کس کو؟ ان بھچ انگریزوں کو جو انڈیا کا اتنا ہی حال جانتے ہیں کہ ایک بڑی زرخیز کالونی ہے اور بس۔ بھلا شکمی تفریقوں کا لحاظ نہ بھی کرو اور ہندو ہندو ایک' اور مسلمان مسلمان ایک قوم سمجھو تو خیر یہاں تک بھی مضائقہ نہیں' مگر ہندو اور مسلمان کیونکر ایک قوم میں شامل ہو کر ''انڈین نیشن'' کہلا سکتے ہیں۔ گنگا اور سندھ کا سنگم ہو سکتا ہے اور نہیں ہو سکتا تو ہندو اور مسلمان کا۔''

1890ء: مولانا عبدالحلیم شرر: ''بہتر ہو گا کہ ہندوستان کو ہندو اور مسلمان صوبوں میں تقسیم کر کے تبادلۂ آبادی کر لیا جائے۔''

1899ء: تھیوڈور ماریسن: ''برِاعظیم کی پوری مُسلم آبادی کو آگے سے لے کر پشاور تک کے علاقے میں مجتمع کیا جائے۔''

1917ء: اشتراکیت کی بین الاقوامی کانفرنس منعقدہ اسٹاک ہام میں ڈاکٹر عبدالجبار خیری اور ان کے چھوٹے بھائی پروفیسر عبدالستار خیری نے ایک تحریری بیان میں برعظیم کو مسلم اور ہندو ریاستوں میں تقسیم کرنے کا منصوبہ پیش کیا۔

1920ء: بعض تعلیم یافتہ مسلمانوں نے تحریک خلافت کی سخت مخالفت کی تھی۔ ان میں آگرہ کے ایک وکیل نادر علی بھی شامل تھے۔ انہوں نے 1920ء میں ایک پمفلٹ شائع کیا' جس میں ہندو مسلم مسئلے کا حل پیش کیا کہ ہندوستان کو مذہبی بنیاد پر ''ہندوانڈیا'' اور ''مُسلم انڈیا'' میں تقسیم کیا جائے۔

1920ء: محمد عبدالقادر بلگرامی نے گاندھی جی کے نام ایک کھلا خط لکھا جس میں ہندوستان کو مسلمانوں اور ہندوؤں کے درمیان تقسیم کرنے کی تجویز کی دلائل کے ساتھ حمایت کی۔

1922ء: انجمن اسلامیہ' ڈیرہ اسماعیل خان کے صدر سردار محمد گل خان نے ایک کمیشن کے روبرو اپنا نظریہ ان الفاظ میں پیش کیا: ''ہندوؤں اور مسلمانوں کو متحد کرنے کی کوششیں کامیاب نہیں ہو سکتیں۔ میرا نظریہ یہ ہے کہ 23 کروڑ ہندوؤں کو جنوب میں اور 8 کروڑ مسلمانوں کو شمال میں تقسیم کر دینا چاہئے۔ راس کماری سے آگرہ تک کا علاقہ ہندوؤں کو اور آگرہ سے پشاور تک کا سارا علاقہ مسلمانوں کو دے دینا چاہئے۔''

1923ء: بھائی پرمانند' مشہور ہندو رہنما: ''ہندوستان کو اس طریقے سے تقسیم کیا جا سکتا ہے کہ ایک خطے میں اسلام کو برتری حاصل ہو اور دوسرے خطے میں ہندومت کو۔''

1924ء: مولانا حسرت موہانی نے مسلمان اکثریتی صوبوں کو مسلمان ریاستوں میں اور ہندو اکثریتی صوبوں کو ہندو ریاستوں میں بدلنے کا منصوبہ پیش کیا۔

1924ء: لالہ لاجپت رائے' مشہور ہندو رہنما نے چون و چرا کے بعد ہندوستان کی تقسیم کا ایسا منصوبہ پیش کیا جس کے مطابق انہوں نے قبول کر لیا کہ مسلمانوں کو شمال مغربی سرحدی صوبہ' مغربی پنجاب' سندھ اور مشرقی بنگال دے دیا جائے۔

1925ء: مولانا محمد علی جوہر نے برعظیم کے شمالی خطوں کے لوگوں کے لئے اقتصادی' عسکری' مذہبی اور معاشرتی اسباب و وجوہ کی بناء پر علیحدگی اور حق خود ارادیت کی حمایت کا اعلان کیا۔

1925ء: ولیم آرچی بالڈ' پرنسپل ایم اے او کالج' علی گڑھ نے شمال مغربی علاقے اور افغانستان کے مضبوط مُسلم اتحاد کی پیش بینی کی۔

1928ء: سر آغا خان: جب ہندوستان غیر ملکی تسلّط سے آزاد ہو جائے گا تو اس کی وحدانی' غیر وفاقی حکومت نہیں ہو سکتی..... شمال مغرب اور مشرق کے مسلمان اپنی مرضی کی آزاد ریاستیں بنائیں گے۔''

1929ء: نواب سر ذوالفقار علی خان صدر مجلس استقبالیہ آل انڈیا خلافت کانفرنس: ''مسلمانوں کو بجائے حقوق کے' ایک جداگانہ ملک اور وطن کا مطالبہ کرنا چاہئے۔''

1930ء: علامہ اقبال کا خطبۂ صدارت' آل انڈیا مسلم لیگ الٰہ آباد: ''بہتر ہو گا کہ پنجاب' شمال مغربی سرحدی صوبے' سندھ اور بلوچستان کو ملا کر ایک مملکت بنا دیا جائے جو سلطنتِ برطانیہ کے اندر یا باہر' حکومتِ خود اختیاری رکھتی ہو۔''

1933ء: چودھری رحمت علی' کیمبرج کے ایک طالب علم نے ایک انگریزی پمفلٹ ''Now or Never'' (اب یا کبھی نہیں) شائع کیا' جس میں لفظ ''پاکستان'' پہلی مرتبہ استعمال کیا گیا۔

1938ء: قائداعظم کے زیر صدارت منظور شدہ قرارداد سندھ صوبائی مسلم لیگ: ''ہندوستان کو دو وفاقوں میں تقسیم کیا جا سکتا ہے یعنی مُسلم ریاستوں کا وفاق اور غیر مُسلم ریاستوں کا وفاق''

1939ء: چودھری خلیق الزماں اور عبدالرحمان صدیقی لندن گئے تو وہاں وزیر ہند سے اپنی ملاقات کے دوران تقسیم ہند کی تجویز پیش کی۔

1939,1938ء: ان دو برسوں کے دوران میں مختلف حضرات نے مسلم خطوں اور جداگانہ آزاد ریاستوں کے قیام کی تجویزیں پیش کیں' جن میں ڈاکٹر عبداللطیف (حیدرآباد)' سر سکندر حیات خان (پنجاب)' میاں کفایت علی' ڈاکٹر سید ظفر الحسن اور ڈاکٹر ایم افضل قادری (علی گڑھ) کی پیش کردہ تجاویز کو نسبتاً زیادہ اہمیت حاصل ہے۔

1939ء: قائداعظم نے 8/اپریل کو مسلم لیگ کونسل سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: ''اس وقت کئی منصوبے اور تجاویز ہمارے سامنے ہیں' جن میں ملک کو تقسیم کرنے بھی شامل ہے۔ یہ مسئلہ ورکنگ کمیٹی کے زیرِ غور ہے۔ پورے مسئلے کا جائزہ لیا جائے گا اور ایسی سکیم پیش کی جائے گی جو ورکنگ کمیٹی کے نزدیک مسلمانانِ ہند کے بہترین مفاد میں ہو گی۔''

1940ء: فروری کے پہلے ہفتے میں مسلم لیگ کی ورکنگ کمیٹی اور کونسل کے اجلاس دہلی میں منعقد ہوئے' جن میں مسلمانانِ ہند کے لئے علیحدہ وطن پر سنجیدگی سے غور کیا گیا۔ فیصلہ ہوا کہ اس کی باقاعدہ تجویز مارچ میں ہونے والے سالانہ اجلاس لاہور میں پیش کی جائے۔

1940ء: 6 فروری کو قائداعظم نے وائسرائے ہند لارڈ لنلتھگو سے ملاقات کی اور بتا دیا کہ آل انڈیا مسلم لیگ اپنے لاہور والے کھلے اجلاس میں ہندوستان کی تقسیم کا مطالبہ کرنے والی ہے۔

1940ء: 22 / مارچ' منٹو پارک لاہور میں آل انڈیا مسلم لیگ کے ستائیسویں اجلاس کا پہلا دن۔ ایک لاکھ سے زیادہ مسلمانوں نے ''قائداعظم زندہ باد'' کے والہانہ نعروں سے اپنے قائد کا استقبال کیا۔ تلاوتِ قرآن مجید کے بعد چند نظمیں پڑھی گئیں' جن میں میاں بشیر احمد کی نظم ''ملت کا پاسباں ہے محمد علی جناح'' بے حد پسند کی گئی۔ مجلس استقبالیہ کے صدر نواب سر شاہ نواز خان ممدوٹ نے خطبۂ استقبالیہ پیش کیا گیا۔ قائداعظم نے اپنی طویل اور پُراثر تقریر میں مسلمانانِ ہند کے مسائل پر روشنی ڈالی اور دو قومی نظریئے کی انتہائی مدلل اور منطقی انداز میں وضاحت کی۔ آج کا اجلاس بخیر و خوبی ختم ہوا۔ رات کو مجلس موضوعات کی میٹنگ میں اس تاریخ ساز قرارداد کے متن پر غور و خوض کیا گیا جو کل 23 / مارچ کو جلسۂ عام میں فیصلے کے لئے پیش کی جائے گی۔

1940ء' 23 مارچ: آج ہفتہ ہے۔ آل انڈیا مسلم لیگ کا کھلا اجلاس تین بجے قائداعظم کی زیر صدارت شروع ہوا۔ نواب زادہ لیاقت علی خان نے مسلم لیگ کی سالانہ رپورٹ پڑھی۔ جب بنگال کے وزیراعلیٰ فضل حق ڈائس پر تشریف لائے تو فضا تالیوں اور ''شیرِ بنگال زندہ باد'' کے نعروں سے گونج اٹھی۔ وہ تاریخ ساز' پاکستان ساز قرارداد پیش کرنے کا سہرا شیرِ بنگال ہی کے سر بندھا۔ آپ نے قرارداد جو انگریزی میں تھی' پڑھ کر سنائی۔ یہاں اس قرارداد کا وہ ترجمہ پیش کیا جاتا ہے جو ''مینارِ پاکستان'' پر کندہ ہے۔ یہ ترجمہ پیش کرنے کی سعادت راقم السطور (سید قاسم محمود) کا حاصل ہے۔ اس کی نظر ثانی سید وقار عظیم صاحب نے کی تھی اور متن جم کو داد دی تھی کہ وہ ایک شوشے کی بھی کمی بیشی نہیں کر سکے۔ یہ ترجمہ ''مینار'' کے معمار اعظم جناب مختار مسعود کی نگرانی میں مینار کے چبوترے کا مستقل حصہ ہوا۔ قرارداد کا متن یہ ہے:

(1) آئینی مسئلے پر آل انڈیا مسلم لیگ کونسل اور مجلس عاملہ کے اس اقدام کی تائید و توثیق کرتے ہوئے جو ان کی 27 اگست' 17 / 18 ستمبر' 22 اکتوبر 1939ء اور 3 فروری 1940ء کی قراردادوں سے واضح ہوتا ہے' آل انڈیا مسلم لیگ کا یہ اجلاس پرزور اعادہ کرتا ہے کہ وہ وفاقی منصوبہ جس کا اظہار گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء میں کیا گیا ہے' قطعاً غیر موزوں' اس ملک کے خاص حالات کے پیش نظر ناقابلِ عمل اور مسلم ہندوستان کے لئے یکسر ناقابلِ قبول ہے۔''

(2) اس اجلاس کی یہ حتمی رائے ہے کہ 18 / اکتوبر 1939ء کو جو اعلان وائسرائے نے حکومت ملک معظم کی جانب سے کیا تھا وہ اس حد تک تو اطمینان بخش ہے کہ جس مسلک اور منصوبے پر گورنمنٹ آف انڈیا ایکٹ 1935ء مبنی ہے' اُس پر ہندوستان کی مختلف جماعتوں' مفادات اور فرقوں کے مشورے سے دوبارہ غور کرنے کا یقین دلایا گیا ہے' لیکن مسلم ہندوستان اس وقت تک مطمئن نہیں ہوگا' جب تک کہ پورے آئینی منصوبے پر ازسرِنو غور نہ کیا جائے' کوئی نیا منصوبہ مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول نہیں ہوگا' تاوقتیکہ اُن کی رضامندی اور منظوری سے مرتب نہ کیا جائے۔

(3) قرار پایا کہ آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس کی یہ مسلمہ رائے ہے کہ کوئی آئینی منصوبہ اس ملک میں قابلِ عمل اور مسلمانوں کے لئے قابلِ قبول نہیں ہوگا' تاوقتیکہ وہ مندرجہ ذیل اصول پر وضع نہ کیا گیا ہو' یعنی جغرافیائی طور پر متصل وحدتوں کی حد بندی ایسے خطوں میں کی جائے (مناسب علاقائی ردّ و بدل کے ساتھ) کہ جن علاقوں میں مسلمانوں کی اکثریت ہے' مثلاً ہندوستان کے شمال مغربی اور مشرقی حصے' ان کی تشکیل ایسی آزاد ریاستوں کی صورت میں کی جائے جن کی مشمولہ وحدتیں خودمختار اور مقتدر ہوں۔

نیز ان وحدتوں اور خطوں میں اقلیتوں کے مذہبی' معاشی' انتظامی اور دیگر حقوق و مفادات کا مناسب' مؤثر اور حکمی تحفظ ان کے مشورے سے آئین میں صراحت کے ساتھ کیا جائے۔ مزید برآں یہ اجلاس مجلسِ عاملہ کو اختیار دیتا ہے کہ وہ ان بنیادی اصولوں کے مطابق آئین کا ایک ایسا منصوبہ تیار کریں' جس کی رُو سے مذکورہ علاقوں کو بالآخر مکمل اختیارات حاصل ہو جائیں مثلاً دفاع' امور خارجہ مواصلات' محصولات اور دیگر ایسے امور جو ضروری سمجھے جائیں۔''

مولوی فضل الحق (بنگال)' چودھری خلیق الزماں (یو پی)' مولانا ظفر علی خان (پنجاب)' اورنگ زیب خان (صوبہ سرحد) حاجی سر عبداللہ ہارون (سندھ) نواب اسماعیل خان (یو پی)' قاضی محمد عیسیٰ (بلوچستان)' عبدالحمید خان (مدراس) ابراہیم اسماعیل چندریگر (بمبئی) سید عبدالرؤف شاہ (سی پی) ڈاکٹر محمد عالم (پنجاب) بیگم مولانا محمد علی جوہر (یو پی) مولانا عبدالحامد بدایونی' سید ذاکر علی اور بہت سے اکابر ملت نے اس قرارداد کے حق میں مدلل اور پرجوش تقریریں کیں۔ ان بیانات کے بعد اجلاس کے صدر قائداعظم نے قرارداد پر عمومی رائے طلب کی اور زبردست تالیوں کی گونج میں قرارداد متفقہ طور پر منظور کر لی گئی۔

23 / مارچ کی ''قراردادِ لاہور'' درحقیقت دو قومی نظریئے کی اساس نہیں۔ اساس تو ہے مگر آغاز نہیں' بلکہ اختتام ہے۔ قراردادِ لاہور کی منظوری سے ایک ملک گیر عملی تحریک کا آغاز ہوا جسے عرفِ عام میں ''تحریک پاکستان'' کہتے ہیں اور ہماری تشبیہہ کو جاری رکھتے ہوئے کہا جا سکتا ہے کہ ''تحریکِ پاکستان'' وہ ہاتھ ہے جس نے سات برسوں کی مسلسل جگر کاوی اور دل سوزی سے نظریۂ پاکستان کی سبز لڑی کو دو قومی نظریئے کی سفید لڑی سے الگ کر دیا۔

23

نظریۂ پاکستان کا مستقبل

پہلی سطر سے لے کر پچھلے باب تک کی آخری سطر تک ہم نے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ نظریۂ پاکستان اور دو قومی نظریئے میں ایک فرق ہے۔ نظریۂ پاکستان کا معنوی نام ''اسلام'' ہے جو کہ آفاقی اور عالمگیر ہے۔ دو قومی نظریہ مقامی ہے اور صرف پاک و ہند تک محدود و محصور ہے۔ چودہ اگست 1947ء کو پاکستان کے قیام کے بعد ''دو قومی نظریہ'' تو پھر بھی ہندوستان تک محدود رہا' لیکن نظریۂ پاکستان مشرق میں بنگلہ دیش اور مغرب میں پاکستان میں قدم جمانے اور ان کی سرحدوں سے ماورا ملتِ اسلامیہ میں جذب ہو جانے کے لئے بے تاب ہے۔ ملتِ اسلامیہ میں نظریۂ پاکستان کا مستقبل کیا ہوگا' اس کے بارے میں محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ایک مضمون کا طویل اقتباس

بطور تتمہ پیش کیا جا رہا ہے۔ یہ مضمون ''ملّتِ اسلامیہ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری'' کے عنوان سے ان کی کتاب ''سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی' حال اور مستقبل اور مسلمانانِ پاکستان کی خصوصی ذمہ داری'' میں شامل ہے۔ مضمون کے عنوان میں پاکستان کے باشندوں کو ''ملّتِ اسلامیہ'' قرار دیا گیا' یہ بھی ایک اشارہ ہے ہمارے اس ادّعا کی جانب کہ نظریۂ پاکستان اور اسلام ہم معنی الفاظ ہیں' اور ''دو قومی نظریہ'' اس معنی کے ماتحت ایک دوسرا مفہوم رکھتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب کا یہ مضمون پہلی بار 29/جون 1993ء کو شائع ہوا تھا۔ اس لئے بعض حوالوں کا تعلق اُس وقت سے ہے۔ ڈاکٹر صاحب رقم طراز ہیں:

''اگرچہ بعض لوگوں کا خیال تو یہ ہے کہ اس وقت دنیا میں مسلمانوں کی کل تعداد پونے دو ارب تک پہنچ چکی ہے' تاہم محتاط اندازوں کے مطابق بھی یہ تعداد سوا ارب کے لگ بھگ یعنی ایک سو بیس اور ایک سو تیس کروڑ کے مابین ضرور ہے۔

سورۃ الجمعہ کی دوسری اور تیسری آیات کی رو سے یہ اُمّت صرف دو حصوں میں منقسم ہے۔ یعنی ایک ''اُمّی'' عرب جن کو بقیہ تمام مسلمانوں پر مطلق فضیلت اولاً اس بناء پر حاصل تھی کہ خود نبی اکرم ﷺ بھی ان ہی میں سے تھے۔ اور ثانیاً اس بناء پر کہ ان ہی کی جانب آپؐ کی خصوصی بعثت تھی۔ چنانچہ ان ہی کی زبان میں اللہ کا آخری پیغام اور کامل ہدایت نامہ نازل ہوا اور دوسرے ''آخرین'' یعنی بقیہ تمام نسلوں اور قوموں سے تعلق رکھنے والے مسلمان جو وقتاً فوقتاً امتِ محمد ﷺ میں شامل ہو کر اس کی عمومی فضیلت میں شریک ہوتے چلے گئے۔ لیکن موجودہ حالات میں یہ اُمّت تین حصوں میں منقسم قرار دی جا سکتی ہے یعنی:

1) مغربی ایشیا اور شمالی افریقہ کے ان ممالک کے لوگ جن کی مادری زبان عربی بن چکی ہے۔ یہ تعداد میں لگ بھگ بیس کروڑ' گویا کل اُمت کا چھٹا حصہ ہیں۔

2) سابق برّعظیم ہند اور موجودہ بھارت' پاکستان اور بنگلہ دیش کے وہ مسلمان جن کی مادری زبانیں اور بولیاں تو بے شمار ہیں لیکن سب کی ''لنگوا فرینکا'' کی حیثیت اردو کو حاصل ہے۔ یہ تعداد میں لگ بھگ چالیس کروڑ' یعنی کل امت کا تیسرا حصہ ہیں۔ اور

3) باقی پوری دنیا میں پھیلے ہوئے مسلمان جن کی مجموعی تعداد ساٹھ کروڑ کے قریب ہے اور اس طرح وہ پوری اُمت کی مجموعی تعداد کا نصف ہیں۔ ان میں سے ایک تہائی کے لگ بھگ تو صرف انڈونیشیا اور ملائشیا میں آباد ہیں' باقی دو تہائی میں ترکی' ایران اور افغانستان ایسے خالص اور قدیم مسلمان ممالک کے علاوہ مغربی اور وسطی افریقہ کے ممالک اور سابق روسی ترکستان اور چینی ترکستان میں آباد مسلمان ہیں۔

ان ایک ارب کے قریب غیر عرب مسلمانوں میں ایک اضافی درجۂ فضیلت گزشتہ چار سو سال سے برّعظیم پاک و ہند میں آباد مسلمانوں کو حاصل ہے جس کی بناء پر ع ''جن کے رتبے ہیں سوا' ان کی سوا مشکل ہے!'' کے مصداق اللہ کے دین اور محمد ﷺ کی رسالت کے ضمن میں ایک خصوصی ذمہ داری کا بھاری بوجھ ان کے کندھوں پر تھا جسے تاریخ کی ایک کروٹ نے پورے کا پورا مسلمانانِ پاکستان کے کندھوں پر ڈال دیا ہے جس کا صحیح فہم و شعور ع 'اپنی خودی پہچان' او غافل افغان!'' کے مصداق ملّت اسلامیہ پاکستان کے لئے نہایت ضروری ہے۔

سب جانتے ہیں کہ فضل یا فضیلت خالص وہبی شے ہے اور عالمِ انسانی میں فضیلت کی اصل اساس نبوت رہی ہے۔ چنانچہ سابقہ اُمت مسلمہ یعنی بنی اسرائیل کی اس عظیم فضیلت کی بنیاد جس کا ذکر سورۃ البقرۃ کی دو آیات (۴۷ اور ۱۲۲) میں ان الفاظ میں وارد ہوا کہ: ﴿وَاَنِّیْ فَضَّلْتُکُمْ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ﴾ یعنی ''میں نے تو تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا فرمادی تھی!'' یہی تھی کہ ان میں حضرت موسیٰؑ سے حضرت عیسیٰؑ تک پورے چودہ سو برس نبوت کا سلسلہ اس طور سے جاری رہا کہ کبھی یہ تار ٹوٹا ہی نہیں! حضرت عیسیٰؑ کے بعد مسلسل چھ سو سال ''فترتِ اولیٰ'' کا زمانہ ہے جس کے دوران نبوت کا سلسلہ منقطع رہا اور اس کے بعد نبوت و رسالت کا ماہِ کامل یا خورشیدِ جہاں تاب محمد ﷺ کی صورت میں طلوع ہوا جن کے سر مبارک پر ختمِ نبوت اور تکمیلِ رسالت کا تاج رکھا گیا۔ چنانچہ ایک جانب تو آپ خود ﴿اِنَّ فَضْلَهٗ كَانَ عَلَيْكَ كَبِيْرًا﴾ (بنی اسرائیل: ۸۷) یعنی ''یقیناً اللہ کا فضل آپؐ پر تو نہایت ہی عظیم و کبیر ہے!'' کے مصداقِ کامل قرار پائے' تو دوسری جانب آپؐ کی امت میں شامل ہونے والے بھی' خواہ وہ ''اُمّی'' عربوں میں سے تھے' خواہ ''آخرین'' میں سے آپؐ کے اس فضلِ عظیم کے وارث قرار پائے' گویا کہ: ﴿ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيْهِ مَنْ يَّشَآءُ وَاللّٰهُ ذُو الْفَضْلِ الْعَظِيْمِ﴾ (الجمعہ: ۴) یعنی ''یہ اللہ کا فضل ہے' وہ دیتا ہے جس کو چاہتا ہے اور اللہ بہت بڑے فضل والا ہے!'' اس لئے کہ اگرچہ آپؐ پر نبوت کا سلسلہ ختم اور منقطع ہو گیا' تاہم حسب ذیل آیات کی رو سے آپؐ کی رسالت کے فرائض کی عالمی سطح پر اور تا قیام قیامت ادائیگی مجموعی طور پر آپؐ کی امت ہی کے حوالے کی گئی:

1) ''تم بہترین امت ہو جسے جملہ انسانوں کے لئے برپا کیا گیا ہے۔ تمہارا کام ہی یہ ہے کہ نیکی کا حکم دو' برائیوں سے روکو اور خود اللہ پر پختہ ایمان رکھو!'' (آل عمران: ۱۱۰)

2) ''اللہ کی راہ میں جہاد کرو' جتنا اور جیسا کہ اس کے لئے جہاد کا حق ہے۔ اللہ نے تمہیں منتخب فرمالیا ہے..... تاکہ رسول (ﷺ) تم پر حجت قائم کریں اور تم پوری نوعِ انسانی پر حجت قائم کرو!'' (الحج: ۷۸)

3) ''اور اس نے تمہیں ایک اُمتِ وسط بنایا ہی اس لئے ہے کہ تم تمام لوگوں پر حجت قائم کرو اور ہمارے رسول (ﷺ) تم پر حجت قائم کریں''۔ (البقرۃ: ۱۴۳)

اس فریضۂ رسالتِ محمدیؐ کی ادائیگی اور شہادت علی الناس کی ذمہ داری اگرچہ اُمت محمد ﷺ پر بحیثیت مجموعی ڈالی گئی ہے تاہم ع ''جن کے رُتبے ہیں سوا' ان کی سوا مشکل ہے!'' اور ؎

''نہ ہر زن زن است و نہ ہر مرد مرد
خدا بخ گشت یکساں نہ کرد!''

کے مصداق' اور اللہ تعالیٰ کے اس ابدی قانون کے مطابق کہ ''اللہ ہر ایک پر ذمہ داری کا بوجھ اس کی وسعت کے مطابق ہی ڈالتا ہے!'' جو قرآن حکیم میں متعدد بار بیان ہوا ہے' (مثلاً البقرۃ: ۲۳۳ اور ۲۸۶' سورۃ الانعام: ۱۵۲' سورۃ الاعراف: ۴۲ اور سورۃ المومنون: ۶۲) اس عظیم ذمہ داری کا سب سے زیادہ بوجھ ان لوگوں پر ہے جن کی مادری زبان عربی ہے' لہٰذا انہیں قرآن حکیم کو سمجھنے کے لئے کسی اضافی محنت اور مشقت کی ضرورت نہیں ہے! اور ظاہر ہے کہ قرآن حکیم ہی نبوت کے اس سلسلے کا اصل قائم مقام ہے جو نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ مبارک پر ختم اور منقطع ہو چکا ہے۔

تاہم ختمِ نبوت سے جو خلا پیدا ہوا اس کو پُر کرنے کی ایک اضافی تدبیر اللہ تعالیٰ نے اپنی حکمتِ کاملہ کے تحت یہ اختیار فرمائی کہ ایک جانب مجدّدین کا سلسلہ جاری فرمایا جو وقتاً فوقتاً دین کی اصل تعلیمات اور اللہ کی اصل ہدایت کو از سرِ نو نکھار کر پیش کرتے رہے اور دوسری جانب یہ ضمانت دے دی کہ ''اس امت میں ہمیشہ کم از کم ایک گروہ یا جماعت ضرور حق پر قائم رہے گی'' (بخاریؒ و مسلمؒ عن معاویہؓ) اور یہ دونوں امر اس اعتبار سے باہم لازم و ملزوم ہیں کہ بالکل فطری اور منطقی طور پر ہر مجدّد کی تعلیمات اور مساعی کے نتیجے میں لامحالہ ایک حلقہ یا گروہ ایسا وجود میں آتا رہا جو دینِ حق کی اصل تعلیمات کا علم بردار اور اپنے وجود کے اعتبار سے کم از کم ذاتی زندگی اور انفرادی سیرت و کردار کی حد تک اسلام کی حقیقی تعلیمات کا نمونہ اور آئینہ دار بن گیا۔ اگرچہ دنیا کے اس طبعی قانون کے مطابق کہ ہر جوانی پر لازماً بڑھاپا بھی آ کر رہتا ہے اور ہر کمال کو بالآخر زوال سے دوچار ہونا ہی پڑتا ہے یہ حلقہ یا گروہ یا جماعت

دوسری یا تیسری یا زیادہ سے زیادہ چوتھی نسل تک پہنچ کر لازماً ایک تقلیدی اور موروثی ''فرقہ'' بن جاتا ہے۔ اور اس طرح ایک نئے مجدد کی ضرورت پیش آتی رہی جس کے زیر اثر ایک نئی جمعیت یا جماعت وجود میں آئے۔ یہی وجہ ہے کہ حدیث نبوی ﷺ میں مجددین کے ضمن میں سو سو سال کے وقفے کا ذکر ہے' یعنی: ''اللہ تعالیٰ اس امت میں ہر سو سال کے سرے پر ایسے لوگوں کو اٹھاتا رہے گا جو دین کی تجدید کرتے رہیں گے یعنی اسے تازہ کرتے رہیں گے''۔ (ابوداؤد عن ابی ہریرہؓ)

بہرحال ان مجددینِ امت اور ان کے تلامذہ اور متبعین کی مساعی کے نتیجے میں دین حق کی تعلیمات گزشتہ چودہ سو سال کے دوران اسی طرح منتقل ہوتی چلی آئیں جس طرح اولمپک ٹارچ (مشعل) ایک کھلاڑی سے دوسرے کھلاڑی کو منتقل ہوتی رہتی ہے یا شیر شاہ سوری کے زمانے میں ڈھاکہ سے پشاور تک ڈاک کے تھیلے ہر تیس میل کے بعد ایک گھڑ سوار سے دوسرے کو منتقل ہوتے رہتے تھے!

اور اب اس پس منظر میں مشاہدہ فرمائیے اس عظیم حقیقت کا کہ پورے ایک ہزار برس تک مجددین کا یہ سلسلہ عالم عرب ہی میں جاری رہا۔ چنانچہ حضرت عمر ابن عبدالعزیز اور حضرت حسن بصریؒ سے امام غزالیؒ اور شیخ الاسلام حافظ ابن تیمیہؒ تک پورے سات سو برس کے عرصے میں تمام مشاہیر علماء' ائمہ ہدایت اور مجددین امت عالم عرب ہی میں پیدا ہوتے رہے۔ لیکن فتنہ تاتار کے دوران جبکہ وسطی اور مغربی ایشیا شورش و ہلاکت اور تباہی و بربادی کا شکار ہوئے اسلام کی علمی اور روحانی وراثت تدریجاً سرزمین ہند کو منتقل ہوتی چلی گئی تا آنکہ جیسے ہی امت کی تاریخ کے ''الف ثانی'' یعنی دوسرے ہزار سالہ دور کا آغاز ہوا تجدید دین کا اصل مرکز ہندوستان بن گیا۔ چنانچہ گیارھویں صدی ہجری کے عظیم ترین مجدد شیخ احمد سرہندی بھی یہیں پیدا ہوئے جن کے مرقد کے بارے میں علامہ اقبال نے فرمایا ہے کہ ع ''وہ خاک کہ ہے زیر فلک' مطلع انوار!'' اور جن کی ذات کے بارے میں فرمایا ہے کہ ع ''جن کے نفس گرم سے ہے گرمیٔ احرار!'' پھر بارہویں صدی ہجری کے مجدد اعظم شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ بھی یہیں پیدا ہوئے جو تنہا اپنی ذات میں جملہ علوم اسلامی کے مجدد ہی نہیں فکر اسلامی اور حکمت دینی کے بھی مجدد اعظم تھے۔ پھر تیرھویں صدی ہجری میں سید احمد بریلوی بھی یہیں پیدا ہوئے جو بلاشبہ سلوک محمدی ﷺ اور جہاد اسلامی کے مجدد اعظم تھے اور ان کا اور ان کے ساتھی شہداء کا خون سرزمین بالاکوٹ میں جذب ہوا۔

بنا کردند خوش رسمے بہ خاک و خون غلطیدند
خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را!

اسی طرح چودھویں صدی ہجری (جسے ختم ہوئے ابھی صرف تیرہ برس ہوئے ہیں!) میں بھی جو اعاظم رجال سرزمین ہند میں پیدا ہوئے ان کی نظیر پورا عالم اسلام پیش کرنے سے قاصر ہے۔ چنانچہ طبقۂ علماء میں سے اسیر مالٹا شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ ایسی عظیم شخصیت اور جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں سے علامہ اقبال ایسا مفکر ملت اور حکیم امت' پھر مولانا محمد الیاس ایسا عظیم مبلغ اور مولانا مودودی ایسا عظیم مصنف پورے عالم اسلام میں کہیں ڈھونڈنے سے بھی نہیں مل سکتا!'' یہ اللہ کا فضل ہے' وہ جسے چاہتا ہے دیتا ہے اور اللہ بڑے فضل والا ہے''۔ (الجمعہ:4)

الغرض' گزشتہ پوری چار صدیوں کے دوران اگر دین کے علم و فکر ہی نہیں' دعوت و جہاد کی تجدید کا مرکز بھی ہندوستان بنا رہا تو ظاہر ہے کہ یہ مشیت ایزدی کے تحت ہی ہوا ہے اور جس طرح علامہ اقبال نے کوہ ہمالیہ سے مخاطب ہو کر فرمایا تھا کہ ع ''برف نے باندھی ہے دستار فضیلت تیرے سر!'' اسی طرح واقعہ یہ ہے کہ ''الف ثانی'' کی ان تجدیدی مساعی نے ملت اسلامیہ ہند یہ کے سر پر ایک عظیم دستار فضیلت باندھ دی ہے۔ جس کی بناء پر اس کی ذمہ داری بھی بقیہ پوری امت مسلمہ کے مقابلے میں نہایت عظیم اور گراں اور دہ چند ہی نہیں سو گنا بن گئی ہے!

اور اب توجہ فرمائیے تاریخ کی اس ''کروٹ'' کی جانب جس کے نتیجے میں اس عظیم ذمہ داری کا پورا بوجھ ملت اسلامیہ پاکستان کے کندھوں پر آ گیا ہے۔ یہ کروٹ تحریک پاکستان اور اس کے نتیجے میں قیام پاکستان سے عبارت ہے' جس کا اعلانیہ مقصد اسلام کے نظام عدل اجتماعی کا قیام اور پورے عالم انسانیت کے سامنے اسلام کے اصول حریت و اخوت و مساوات کا ایک نمونہ'' پیش کرنا تھا۔ چنانچہ مفکر و مصور پاکستان علامہ محمد اقبال نے بھی اپنے خطبہ الٰہ آباد (1930ء) میں فرمایا تھا کہ ''مجھے یقین ہے کہ ہندوستان کے شمال مغربی علاقے میں ایک آزاد مسلمان ریاست کا قیام تقدیر مبرم ہے۔ اور اگر ایسا ہو گیا تو ہمیں ایک موقع مل جائے گا کہ اسلام کی اصل تعلیمات پر جو پردے عرب ملوکیت (امپریلزم) کے دور میں پڑ گئے تھے انہیں ہٹا کر دوبارہ اصل اسلام کا ایک نمونہ دنیا کے سامنے پیش کر سکیں!'' اور بانی و معمار پاکستان محمد علی جناح نے بھی بارہا ان ہی خیالات کا اظہار فرمایا تھا۔ اور قیام پاکستان کی صورت میں غالب اور جارح ہندو اکثریت کے ملک بھارت میں شامل رہ جانے والے علاقوں کے مسلمانوں نے بھی

''جو ہم پہ گزری سو گزری مگر شب ہجراں
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے!''

کے مصداق اس سے بالکل بے پروا ہو کر کہ تقسیم ہند کے بعد ان پر کیا بیتے گی' تحریک پاکستان میں بھرپور حصہ ہی نہیں اصل فیصلہ کن کردار ادا کر کے گویا مذکورہ بالا چار صد سالہ تجدیدی مساعی کی وراثت کے ناطے جو عظیم ذمہ داری جملہ مسلمانانِ ہند پر عائد ہوتی تھی اس میں سے اپنے حصے کا ''فرض کفایہ'' ادا کر دیا' جس کی قیمت وہ تا حال مسلسل اپنے جانی ضیاع اور مالی نقصان کی صورت میں ادا کر رہے ہیں۔ بنابریں اب اس عظیم ذمہ داری کا پورا بوجھ ملت اسلامیہ پاکستان کے کندھوں پر ہے۔ اور اس کی قسمت بالکلیہ اسی کے ساتھ وابستہ ہے!

اور یہ بلاشبہ ہر باشعور پاکستانی مسلمان کے لئے اہم ''لمحۂ فکریہ'' ہے کہ (1) اگر وہی بنی اسرائیل جو ''ہم نے تمہیں تمام جہان والوں پر فضیلت عطا کر دی تھی!'' کے مصداق کامل تھے اللہ کے ساتھ کئے جانے والے قول و قرار اور عہد و میثاق سے انحراف اور اللہ کے دین اور شریعت کی غلط نمائندگی کے باعث ''ان پر ذلت اور مسکنت مسلط کر دی گئی اور وہ اللہ کے غضب میں گھر گئے!'' کی تصویر بن گئے' اور (2) مسلمانانِ عرب بھی اپنی تمام تر فضیلتوں کے باوجود ان ہی جرائم کی پاداش میں اللہ کے بے لاگ عدل کے باعث معزول و معتوب ہوئے' چنانچہ اولاً اب سے ساڑھے سات سو سال قبل یعنی 1258ء میں سقوط بغداد اور خلافت بنو عباس کے خاتمے پر قرآن مجید میں وارد شدہ پیشگی تنبیہہ ''اگر تم پیٹھ پھیر لو گے تو اللہ تمہیں ہٹا کر کسی اور قوم کو لے آئے گا۔'' (سورہ محمد:38) کے مطابق امت مسلمہ کی قیادت و سیادت سے معزول کر دیئے گئے تھے اور اب بھی ایک مغضوب اور ملعون قوم کے ہاتھوں مسلسل پٹ رہے ہیں' جس کی شدت' نبی اکرم ﷺ کی ان پیشین گوئیوں کے مطابق جن پر مفصل گفتگو اس سے قبل ہو چکی ہے' مستقبل قریب میں اپنے نقطۂ عروج کو پہنچ جانے والی ہے!.....تو ''تم کیونکر بچو گے اگر تم نے انکار کیا!'' (سورۃ المزمل: 18) کے مصداق ہم اللہ کے قانون عذاب اور اصول مکافات عمل سے کیسے بچ سکیں گے!

چنانچہ ان سطور کے راقم کو پوری شدت کے ساتھ یہ احساس الاحق ہے کہ ہم بحیثیت ملت اسلامیہ پاکستان اللہ کے قانون عذاب کی گرفت میں آ چکے ہیں۔ اور اس

عظیم قانون کی اس دفعہ کے مطابق جو سورۂ سجدہ کی آیت 21 میں وارد ہوئی ہے' یعنی ''ہم انہیں بڑے عذاب سے قبل چھوٹے عذاب کا مزہ ضرور چکھائیں گے' شاید کہ یہ لوٹ آئیں!'' ہماری پیٹھ پر عذابِ الٰہی کا ایک شدید کوڑا 1971ء میں سقوطِ ڈھاکہ اور مشرقی پاکستان (موجودہ بنگلہ دیش) کی صورت میں قلبِ ماہیت اور سب سے بڑھ کر ایک ذلت آمیز اور عبرتناک شکست کی صورت میں پڑ چکا ہے' جس کے نتیجے میں ترانوے ہزار پاکستانی ان ہندوؤں کے قیدی بنے تھے جن پر مسلمانوں نے کہیں ہزار برس' کہیں آٹھ سو برس اور کہیں چھ سو برس حکومت کی تھی!..... اور چونکہ ہم نے اس کے بعد سے آج تک اللہ اور اس کے دین کی جانب ''رجوع'' کا کوئی ثبوت نہیں دیا' لہٰذا اب ''بڑے عذاب'' کا کوڑا ابھی ہمارے سروں پر اسی طرح تانا جا چکا ہے جس طرح کبھی حضرت یونسؑ کی قوم پر عذابِ استیصال کے آثار شروع ہو گئے تھے (اگرچہ وہ عذاب قوم کی اجتماعی توبہ کے باعث ٹل گیا تھا۔ چنانچہ میں نے قومِ یونسؑ کی مثال اسی خیال سے دی ہے کہ شاید اللہ ملّتِ اسلامیہ پاکستان کو بھی اس ہی کے مانند اجتماعی توبہ کی توفیق عطا فرما دے۔ آمین' یا رب العالمین!) اور میری تشویش کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں پہلے عذاب سے قبل بھی پچیس برس کی مہلت دی تھی (سقوطِ ڈھاکہ کے وقت قیامِ پاکستان پر قمری حساب سے پچیس برس بیت چکے تھے!) اور اب پھر قمری حساب سے دوسرے پچیس برس کی مہلت کے ختم ہونے میں کل پونے تین سال باقی رہ گئے ہیں! الغرض' معاملہ وہی ہے کہ ؏

حذر اے چیرہ دستاں' سخت ہیں فطرت کی تعزیریں!

اور ؎

فطرت افراد سے اغماض بھی کر لیتی ہے
نہیں کرتی کبھی ملّت کے گناہوں کو معاف!

اور ؎

اٹھو وگرنہ حشر نہیں ہوگا پھر کبھی
دوڑو زمانہ چال قیامت کی چل گیا

فرمانِ قائد

''پاکستان اسی دن وجود میں آ گیا تھا جب ہندوستان میں پہلا ہندو مسلمان ہوا تھا۔''

(مسلم یونیورسٹی علی گڑھ۔ 8 مارچ 1944ء)

ماخذ

[''نظریۂ پاکستان نمبر'' کی اس خصوصی اشاعت کے لئے ان بے شمار کتب سے استفادہ کیا ہے' جن میں سے خاص طور پر مندرجۂ ذیل کتب قابلِ ذکر ہیں۔ کتب کے علاوہ جرائد و رسائل سے بھی مدد لی گئی ہے۔ اِن سب کا شکریہ ہم پر واجب ہے:۔]

تاریخ نظریۂ پاکستان	پیام شاہجہاں پوری
تاریخ نظریۂ پاکستان	مظفر مہدی ہاشمی
نظریۂ پاکستان	محمد حنیف رامے
نظریۂ پاکستان	ڈاکٹر خالد علوی
قائداعظم اور مسلم تشخص	ڈاکٹر خالد علوی
اسلام اور پاکستان	ڈاکٹر اسرار احمد
پاکستان ناگزیر تھا	سید حسن ریاض
صبحِ جمال	محمد یونس سیٹھی
ملّتِ اسلام: تہذیب و تقدیر	سراج منیر
ملّتِ اسلامیہ کی مختصر تاریخ (حصہ سوم)	ثروت صولت
نقشِ حیات (آپ بیتی)	مولانا سید احمد حسین مدنی
مسلم ثقافت ہندوستان میں	مولانا عبدالمجید سالک
تہذیب و تمدن پر اسلام کے اثرات و احسانات	مولانا ابوالحسن علی ندوی
پاکستان: پس منظر و پیش منظر	حمید انور
نظریۂ پاکستان	پنجاب ٹیکسٹ بورڈ
اعلائے کلمۃ الحق کی روایت اسلام میں	میاں محمد افضل
قیامِ پاکستان کا تاریخی و تہذیبی پس منظر	سمیع اللہ قریشی
حصولِ پاکستان	پروفیسر احمد سعید
قائداعظم کا پیغام	سید قاسم محمود
تحریکِ پاکستان نمبر	ماہنامہ ''کنز الایمان'' لاہور
پاکستان اور پاکستانیت	پروفیسر محمد اکرام ہوشیار پوری
پاکستان: تجربہ گاہِ اسلام	مظفر حسین
جدوجہد پاکستان	ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی
ہمارے ہندوستان مسلمان (اُردو ترجمہ)	ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر
آبِ کوثر	شیخ محمد اکرام
بنگالی مسلمانوں کی صد سالہ جدوجہد آزادی	عبداللہ ملک
برعظیم پاک و ہند میں اسلام کے انقلابی فکر کی تجدید و تعمیل	ڈاکٹر اسرار احمد
سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی' حال اور مستقبل	ڈاکٹر اسرار احمد